

www.paksociety.com

عید نمبر 2

رحا ڈائجسٹ

SEPTEMBER
2012

پاک سوسائٹی
ڈائجسٹ

ماڈل: صنم عباسی
میک اپ: روبر پیوٹی
فوٹو گرافی: مسویٰ رضا

سلسلے وار ناول

- ۲۸ رگ جاں سے جو قریب تھے صالحہ محمود
۱۶۰ کبھی عشق ہو تو پتہ چلے شازیہ مصطفیٰ عمران
۹۶ بند قبا کھلنے لگی سعدیہ عابد
۸۰ سانس سڑک اور سکوت نانکھ طارق

مکمل ناول

- ۱۸۰ اس دل میں بے ہوشم انعم خان
۲۰۴ تمہارے بن نہیں رہنا عابدہ سین
۴۲ دلوں کے ملن قمرش شہک
۱۱۶ میری عید تم ہو انعم نذیر

ناولٹ

- رب مہربان تو مہربان سعدیہ عابد ۵۴

ستمبر 2012ء

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 9

قیمت 50 روپے

ذریعہ بذریعہ رجسٹری

600 روپے



34535726

پبلشر وائیڈ میڈ صالحہ محمود نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک 2- پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

تمام نامہ "ردا" ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل یا ذریعہ
آرامی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کراوے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ردا" سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے

- ۲۳۲ صالحہ محمود ۲۵ سندھیے
۲۳۷ ثریا اقبال ۲۱۶ صدف سعد
۲۳۱ شہلا مشائق ۲۲۶ شہلا مشائق
۲۱۸ ادارہ ۲۲۳ نورین ملک اشعار
۲۳۶ ادارہ ۲۲۰ نورین ملک گوشہ چشم

ردائے جنت
ردا کی ڈائری
ذرا پھر سے کہنا
خوشبو
اس ماہ میں





موسم، رنگ اور عید کی خوشیاں، دونوں اس بار ٹوٹ کر برسی ہیں، بادلوں سے بھرا آسمان خوش رنگ پھول، صحرا کی مہکتی ہوئی راتیں، اپنے رب کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں، پہاڑ اور زمین کے نیچے دفن کی ہوئی ایک رائی بھی اللہ کے حکم سے باہر آ جاتی ہے، یہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، سچائی ارد گرد نہیں آپ کے دل کی روشنی ہے، وہ روشنی جو اللہ نے ایمان کی حرارت بنا کر ڈال دی ہے۔

زندگی عمل کی روشنی ہے، اس روشنی کو اپنے دل کے اندر تلاش کیجئے، دین کے لیے عمل کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کا اخلاق کیسا ہے، اور آپ دوسروں کو کیسے نظر آتے ہیں؟ اگر انسان کا عمل نہ ہوتا تو انسان بے زبان پرندوں کی طرح ہے، مسلمان کی پہچان اس کا عمل ہے، ورنہ کبھی بھی ملائیشیا، چین، ریشیا، بھارت اور افریقہ میں ہمارا دین نہ پھیلتا۔ یہ مسلمانوں کا عمل تھا جس نے سامنے والے پر اپنے عمل سے اللہ کے اسرار و رموز کو ظاہر کیا۔ سامنے والے نے دیکھ کر اس پر جو عمل کیا وہ اللہ کی ہدایت تھی۔ ہدایت سربستہ راز ہے وہی نور ہے وہی عمل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کے اندر ایمان کی حرارت رکھیے۔ ظاہری لبادہ اوڑھ لینے سے آپ کا عمل چھپ نہیں سکتا، یہ اللہ کا وعدہ ہے، ورنہ کبھی پہاڑ اور زمین کے نیچے سے رائی کا دانہ نکل آنے کی امید حضرت لقمان کبھی اپنے بیٹے کو کبھی سورہ لقمان میں ہدایت نہ دیتے۔

نئے لکھنے والوں سے ہمیں اُمید ہے کہ اپنی کاوش کے ساتھ ساتھ ”ردّ“ پر تفصیلی خط ضرور لکھیں گے تاکہ ہماری کارکردگی، ہمارے کام کرنے کا اندازہ، ہماری فکر، ہمارے رائے کی تحریر، ان کا اندازِ بیاں، ان کی محنت، اچھی تحریر کی پہچان، بہتر سے بہتر ہو سکے، تاکہ ”ردّ“ کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا، نئے لکھنے والے اپنا سفر ”ردّ“ کے ساتھ جاری رکھیں، ”ردّ“ ان کے لیے ہے۔



اہل و عیال پر خرچ

☆ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”ایک وہ دینار جس کو تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ایک وہ دینار جسے تم نے کسی مسکین پر خیرات کیا اور ایک وہ دینار جسے تم نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا ان میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کا باعث وہ دینار ہے جسے تم نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا ہے۔“ (مسلم)

☆ جس سرمائے کو تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا یہاں تک کہ جس لقمہ کو تم اپنی اہلیہ کے منہ میں ڈالو گے (اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا)“ (بخاری)

ارشاد نبوی ہے۔ ”تم جو کچھ اپنی خورد و نوش پر خرچ کرو گے وہ بھی صدقہ ہے جو اپنی اولاد کو کھلاؤ پلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے اور جو کچھ تم اپنی اہلیہ کو کھلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے۔“ (متدرک، حاکم حدیث صحیح ہے)

فرشتوں کی دعا

☆ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”روزانہ جب اللہ کے بندے صبح کے وقت اٹھتے ہیں تو دو فرشتے (آسمان سے) اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے الہی تجھی کو عطا فرما دوسرا کہتا ہے الہی تجھ کو مال ہلاک کر۔“ (بخاری، مسلم وغیرہ)

مسلمان کو کھانا کھلانا

☆ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے اور پانی پلاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے سات خندقیں دور فرمادیتے ہیں۔“ (دو خندقوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے)۔ (متدرک حاکم)

اچھی بات کرنا اور کھانا کھلانا

☆ حضرت حائث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ کون سا عمل جنت کو واجب کرنے والا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم اچھی طرح بات کرنے اور کھانا کھلانے کو لازم پکڑو۔“ (بخاری)

ملازمین سے حسن سلوک

☆ حضرت معروہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مقام ربذہ میں ملاقات ہوئی وہ اور ان کا غلام ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا (کہ کیا بات ہے آپ کے اور غلام کے کپڑوں میں کوئی فرق نہیں ہے) اس پر انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے غلام کو برا بھلا کہا اور اسی سلسلے میں اس کو ماں کی غیرت دلائی۔ (یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ابوذر! کیا تم نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو مسلمان درخت
لگاتا ہے پھر اس میں سے جتنا حصہ کھا لیا جائے وہ
درخت لگانے والے کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جو
اس میں سے چرا لیا جائے وہ بھی صدقہ ہو جاتا ہے
یعنی اس پر بھی مالک کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور جتنا
حصہ اس میں سے درندے کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے
لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے
پرندے کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہو جاتا
ہے (غرض یہ کہ) جو کوئی اس درخت میں سے کچھ
(بھی پھل وغیرہ) لے کر کم کر دیتا ہے تو وہ اس
(درخت لگانے والے) کے لئے صدقہ ہو جاتا
ہے۔ (مسلم)

بخرزین

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص بخرزین کو
کاشت کے قابل بناتا ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے۔“
(ابن حبان)

ہدیہ کا بدلہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے
ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جس شخص کو ہدیہ
دیا جائے اگر اس کے پاس بھی دینے کے لئے کچھ ہو تو
اس کو بدلے میں ہدیہ دینے والے کو دے دینا چاہئے اور
اگر کچھ نہ ہو تو (بطور شکریہ) دینے والے کی تعریف کرنی
چاہئے کیونکہ جس نے تعریف کی اس نے شکریہ ادا کر دیا
اور جس نے (تعریف نہیں کی بلکہ احسان کے معاملے
کو) چھپایا اس نے ناشکری کی۔“ (ابوداؤد)

☆☆☆☆☆

اس کو ماں کی غیرت دلائی ہے؟ تم میں ابھی جاہلیت کا
اثر باقی ہے تمہارے ماتحت (لوگ) تمہارے بھائی
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارا ماتحت بنایا۔ لہذا جس
کے ماتحت اس کا بھائی ہو اس کو وہی کھلائے جو خود
کھائے اور وہی پہنائے جو خود پہنے ماتحتوں سے وہ
کام نہ لو جو ان پر بوجھ بن جائے اور اگر کوئی ایسا کام لو
توان کا ہاتھ بٹاؤ۔“ (بخاری)

مسلمان کو کپڑا پہنانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ
میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔
”جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہناتا ہے تو جب تک
پہننے والے کے بدن پر اس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہتا
ہے پہنانے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے۔“
(ترمذی)

مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا

حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ روایت
کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔
”مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا بری موت سے بچاتا
ہے۔“ (مسلم)

امانت دار خزانچی

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں
کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”وہ مسلمان امانت
دار خزانچی جو مالک کے حکم کے مطابق خوش دلی سے
جتنا مال جسے دینے کو کہا گیا ہے اتنا اسے پورا پورا دے
دے تو اسے بھی مالک کی طرح صدقہ کرنے کا ثواب
ملے گا۔“ (مسلم)

درخت لگانے کا اجر

رنگِ جہاں سے جو قریب تھے

رومی ایک جھٹکے سے اشمیل کے سینے سے آگئی، وہ پسینے سے شرابور تھی، وہ ڈر سے، خوف سے مومی طرح کانپ رہی تھی۔

”رومی! کیا ہوا، ہوش میں آؤ، میں ہوں اشمیل!“ اس نے سہل کو آن رکھا تھا۔
”چلو باہر آؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے بسمٹ سے باہر لایا پیچھے پیچھے ایزل بھی میاؤں میاؤں کرتی باہر آگئی تھی۔
”اشمیل! میں ایزل کو لینے یہاں آئی تھی اس کو یہاں کسی نے ٹھیل کے ساتھ باندھ دیا تھا، میں جونہی ایزل کی جانب بڑھی کہ اسے کھول دوں باہر سے دروازہ بند ہو گیا اور میں اندر لاک ہو گئی، میں نے اتنی آوازیں دیں، اتنی دیر میں چنچتی رہی، آخر کار میں تھک کر بیٹھ گئی، نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تم مجھے آج ڈھونڈو گے۔“ وہ اشمیل کا مضبوط ہاتھ تھامے کھڑی بول رہی تھی۔

”اشمیل!“ وہ بے ساختہ پھر رو پڑی تھی۔
”میں دو پہر دو بجے کی یہاں لاک ہوں۔“
”یہ دروازہ خود بخود کیسے لاک ہو گیا، شکر کرو کہ وہ تو مجھے بڑے صاحب نے بتا دیا کہ تم اس طرف ایزل کو لینے آئیں تھیں۔“

”مجھے خود نہیں معلوم مجھے مامی نے کہا تھا کہ بسمٹ میں ایزل شاید پھنس گئی ہے۔“
”کیا... مام نے تمہیں بتایا تھا کہ ایزل یہاں ہے؟“ تو اس نے آنسو پونچھ کر سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔
”ایزل صبح سے بھوک پیاسی صبح سے ہمارے ساتھ قید تھی۔“ وہ بڑی شرمندہ سی اپنا دوپٹہ سنہالتی ہوئی آگے بڑھی، اشمیل بھی اس کے ساتھ تھا، وہ زینہ چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا ان سے پہلے ایزل اچھلتی کودتی ہوئی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی تھی۔ جونہی رومی پسینہ پونچھتی ہوئی اپنے بیدروم میں آئی اشمیل نے جلدی سے فریج کھول کر گلاس میں جوس ڈال کر اس کی طرف بڑھایا تھا، وہ پریشان سی بیٹھی اپنے ماتھے کو پونچھ رہی تھی، اس نے سب لیتے ہوئے ایک نظر اشمیل کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں بھی اسی کی جانب تھیں۔

”سوری رومی!“
”کس بات کی؟“ تم مجھ سے ناراض ہوا بھی تک؟“
”نہیں اشمیل! میں کیوں تم سے ناراض ہونے لگی، ناراض تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔“ تو وہ اس کی اس بات پر چونک گیا۔

Express
your thoughts
beautifully

”تم میری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہو۔“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے، وہ جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی، اشمیل نے بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا جو بڑی بے رحمی سے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ گئی تھی، اشمیل کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

”تم بہت تھک گئی ہو، تمہیں ریست کی نہیں فریش ہونے کی ضرورت ہے، اٹھو تم واش روم میں جاؤ۔“ اس نے بڑے استحقاق سے رومی کا ہاتھ تھام کر رومی کو واش روم کی جانب موڑا تو وہ ریگتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔

”ہری اپ!“ اس نے بہت پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا تھا۔

”تم تیار ہو کر جلدی سے آ جاؤ۔“ وہ یہ کہتا ہوا چابی کو گھماتا ہوا ہانک گیا تھا، وہ شاہد لیتے ہوئے دل بھر کر رومی تھی، اپنی اس بے بسی پر جو پیچھے چھوڑ آئی تھی، اس زندگی پر جو وہ اشمیل کے ساتھ مرممر کر گزار رہی تھی، کس طرح وہ مصنوعی رشتہ نبھا رہی تھی، ذلت اور رسوائی کے خوف سے ہر چیز کو برداشت کر رہی تھی، مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، سپیل سے بلیک سوٹ میں وہ اپنے گیلے بالوں کو پٹی ہوئی آئینے کے سامنے آئی تھی، اُداس چہرہ سرخ آنکھیں اندر سے جیسے اس کے سارے بھید کھول رہی تھیں کہ وہ کتنی دکھی ہے، ہارن کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں، پہلی بار وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

”ابھی اور اسی وقت۔“ شاہد لیتے وقت اس کے ذہن میں ایک بات کلک ہوئی تھی، ہارن کی آتی ہوئی آواز رک گئی تھی، اس کے اطراف میں گہرا سناٹا چھا رہا تھا، ناچاہتے ہوئے وہ گاڑی سے اتر کر رومی کے روم کی ونڈ کی طرف دیکھ رہا تھا، ہلکی ہلکی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

”اُس مین، وہ ابھی تک کمرے میں ہے ورنہ اپنی عادت کے مطابق وہ روم سے نکلتے وقت لائٹ بند کرنا نہ بھولتی۔“ وہ تیزی سے اوپر کی جانب پلٹا تھا، اشمیل بہت زور سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا، وہ بھیگے بالوں کو کچر میں سمیٹے ہوئے وارڈروب سے کپڑے نکالتے ہوئے اٹیچی میں ڈال رہی تھی، وہ بہت تیزی سے آگے بڑھا اور اس کی اٹیچی تھامتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“
”نظر تو آ رہا ہوگا آپ کو۔“ وہ دوبارہ ڈریس لے کر پلٹی تھی۔
”کہاں جا رہی ہو تم؟“
”جہاں سے آئی تھی۔“

”وہاں، وہاں تمہاری جگہ نہیں تھی۔“ وہ کچھ نہ بولی اور پھر پلٹ کر ہنگر سے کپڑے ڈال رہی تھی، جھکے ہوئے شانے کو پکڑ کر اس نے اس کے چہرے کو اوپر کیا تھا۔

”تم وہاں جا رہی ہو جہاں تمہارے لئے جگہ نہیں تھی؟“ اس نے بہت گہری نظروں سے رومی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، دل تو تڑپ گیا تھا لیکن وہی طور پر اس کی اسٹرونگ فیلنگ تھیں کہ اس کی زندگی میں کوئی اور ہے، رومی ایک وقتی سہارا جو کسی وقت بھی اس کی دنیا سے بہت دور چلی جائے گی، پھر بھی وہ اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔

”وہاں میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے، آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔“ وہ اٹیچی بند کرتے ہوئے بولی۔
”میں مانتا ہوں، یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں تمہاری حفاظت کروں اور میں تمہارے ساتھ سنسیریلی بی ہو کر نا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بارے میں غلط بات محسوس کرو۔“

”آئی نو۔۔۔۔۔“ وہ پلٹ کر اس کے سامنے آ کر بولی۔

”تو پھر یہ سب کیا ہے، میں مام کو کیا جواب دوں گا، دادی بیمار ہیں، میں ان کو یہ دیکھ کیسے دے سکتا ہوں؟“

”تو کیا سارے دکھ ہمارے لیے ہیں؟“

”نو۔۔۔۔۔ تمہارے لیے کوئی دکھ نہیں ہے، آئی پراسس یو، تمہیں کوئی دکھ نہیں دے سکتا، تم کل بھی میری بہت اچھی دوست تھیں، جو غلط نہیں تھی مجھے وہ دور ہو گئی ہے۔“ اشمیل کی گرے آنکھیں اس کی براؤن آنکھوں کو غور سے دیکھ رہی تھیں، جہاں سچائی اور ایمان سب کچھ تھا، مگر اس کے لیے دل میں محبت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔
”اشمیل!“ وہ پیٹ کر تھامے تھامے بے ساختگی سے رونے لگی تھی۔

”بولو رومی بولو! تم کیا کہنا چاہ رہی تھیں؟“ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اشمیل کے سینے سے لگ کر بے تحاشہ روئے۔
”رومی!“ اشمیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی ٹھوڑی کو اوپر کیا تھا، کلرنگ بھیگے بالوں سے گرتا ہوا شبنمی پانی ماتھے پر اتر آیا تھا، آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ہونٹ اس کے آنسوؤں سے نمکین ہو رہے تھے، اس کے چہرے پر اندرونی دکھ اور ملال تھا، سرخ و سفید رنگت پر مر جھائے ہوئے گلاب کی رنگت اتر رہی تھی، اشمیل کا اس وقت دل چاہا کہ اس کے سارے دکھ سمیٹ لے، اس کو اپنی بانہوں میں بھر کر ہونٹوں سے اس کے سارے آنسو چن لے، لیکن تار عنکبوت میں جکڑا ہوا اشمیل اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ رومی کے ساتھ جھوٹے کھیل اور ڈراما اظہار نہ کر سکا، وہ دل پر پتھر رکھ کر رخ پھیر گیا۔

”سوری رومی! ویری سوری! تم بہت اچھی ہو، بہت حسین ہو، شاید یہ میری بد نصیبی ہے یا میری نیچر کا حصہ ہے کہ میں ارج کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔“ رومی اپنا رخ پھیر کر چہرہ صاف کر رہی تھی، دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئی تھیں، اشمیل کے اتنے قریب آ کر خود اسے عجیب سا لگ رہا تھا، اس کی نظریں خود بخود جھکتی چلی گئیں، اشمیل نے مرکز خود کو آئینے میں دیکھا، بال سنوارتے ہوئے اس کے ہونٹ شرارت سے مسکرا رہے تھے، رومی جس پوزیشن میں تھی وہ شرم محسوس کر کے جھینپ کر اٹیچی لاک کرنے لگی تھی، اشمیل نے بہت غور سے رومی کو دیکھا اور بیڈ پر اٹیچی کا ہینڈل تھامے دھڑ سے گرا۔

”یہ بات طے ہے کہ میں اپنی اتنی سنسیر دوست کو نہیں جانے دوں گا، ہمارے تمہارے درمیان جوائنڈرا سٹینڈنگ ہے رومی! بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔“ وہ چابی کو گھماتے ہوئے بولا۔
”تو کیا میں اپنی جان دے دوں؟“ تو اشمیل تڑپ کر اٹھ بیٹھا تھا۔
”کون کہتا ہے کہ تم اپنی جان دے دو؟“ وہ اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا، اس کے دونوں ہاتھ تھام کر وہ اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بولو کون لینا چاہتا ہے تمہاری جان؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔
”تو پھر مامی نے کیوں بند کیا مجھے یسمنٹ میں؟“
”واٹ۔۔۔۔۔؟“ اشمیل کو کرنٹ چھو کر گزر گیا تھا۔

”یعنی مام نے تمہیں وہاں بند کیا تھا؟“
”جی!“ مامی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایزل وہاں بند ہو گئی ہے۔
”نو، نو، مام ایسا کر سکتی ہیں؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”ہاں وہ ایزل سے بہت تنگ رہتی ہیں۔“ وہ بہت غور سے رومی کو دیکھ رہا تھا۔
”اور مجھ سے بھی۔“ وہ بول کر اپنی نظریں پھیر گئی۔

”سے بی، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈراپ سین کو بہت جلد ختم کر دوں گا، ڈونٹ وری، یو بلیوی رومی! کہ میں تمہیں خود سے رخصت کرتے وقت یہ سوچتا ہوں کہ تم کہاں جاؤ گی؟“

”وہ تمہارا ہیڈک نہیں ہے، مجھے آپ تایا لٹو کے گھر ڈراپ کر دیں، میں سب کچھ دوں گی کہ میں خود آئی ہوں، آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا، میں وادی اور ماموں کو بھی یہ بتا دوں گی کہ وہاں اب میری ضرورت ہے، ویسے بھی اب ارسلان بھائی — کی شادی قریب آگئی ہے۔“

”آئی نو، بہر حال وہاں تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”میں تکلیف کی عادی ہوں۔“

”لیکن میں تکلیف کا عادی نہیں ہوں، اس لیے مجھے بار بار یہ خیال آئے گا کہ تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہو کر وہاں گئی ہو، رومی! سچ میں سنسیر ملی یہ بات کر رہا ہوں۔“

”میں نے کب کچھ کہا؟“ اس نے اٹیچی کو گھسیٹ کر بیڈ سے اتارا تھا۔

”میں پاپ کو کیا جواب دوں گا، پلیز رومی جو ہونا تھا وہ تمہارے ساتھ ہو چکا، اب ہمارے بیچ ایسا کچھ نہیں ہے، فریڈنگ میں یہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم تھوڑے دن ویٹ کرو، میں یہ معاملہ سولو کر لوں گا، اور یہ چھوٹی بات نہیں ہے میں مام سے بات کروں گا۔“

”نہیں اشمیل! نہیں، ہم مامی سے بات نہیں کرو گے۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری خاطر اس بات کو بھول جاتا ہوں۔“

”لیکن تم ابھی اسی وقت مجھے میرے تایا ابا کے گھر چھوڑ کر آؤ۔“

”تم اس وقت غصے میں جا رہی ہو، اس لیے ایکسکوزی!“ اس نے اس کا ہاتھ اپنی طرف گھسیٹا اور باہر کی طرف نکل گیا، وہ احتجاج کرتی رہی مگر اس نے اس کی ایک نہ سنی اور ہاتھ پکڑے آگے بڑھتا ہی رہا۔

”اشمیل! میرے بال۔“

”میں سنوار دوں گا یارا۔“

”یکو اس مت کرو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”لڑکیاں یہی تو چاہتی ہیں۔“

”جی نہیں۔“ اس نے دروازہ دھڑ سے کھول کر اندر دھکا دیا تھا۔

”شرافت سے بیٹھیں آپ۔“

”میں تمہارا موڈ ابھی ٹھیک کر دوں گا، ہم سی سائڈ پر چلتے ہیں، تمہیں پانی بہت پسند ہے ناں؟“

”سوواٹ، مجھے پسند ہے؟“

”اس لیے کہ پانی مجھے پسند ہے۔“ اشمیل اس کی طرف منہ پھیر کر مسکرایا، اس نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی تھی۔

”دیکھو اشمیل! ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ نہیں ہے، پھر بھی تم اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کر رہے ہو، میں تم سے کوآپریٹ کر رہی ہوں، لیکن دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو میں برداشت نہ کر سکی کہ کوئی مجھ پر بولنے سے پہلے ہی۔۔۔“

”ٹھیک کرے۔“ اشمیل بول پڑا۔

”آئی نو یارا! یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ پاپ نے اتنے اچھے دوست کو بیوی کے رشتے میں باندھ دیا، میری ہیڈلک۔“

یہ تو رومی! تم اتنی اچھی لڑکی ہو کہ واقعی اگر حقیقی زندگی میں تم میری بیوی ہوتیں تو میں غصے کی ایک نظر بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ رومی نے اس کی جانب پلٹ کر دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

”تو تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ میں ارج کے ساتھ کیسا رویہ رکھتا ہوں، ویری سیمپل، میں اس سے محبت کرتا ہوں، وہ میری بیوی ہے مگر ہم دونوں ذہنی ڈسٹینس پر رہتے ہیں، وہ نرم مزاج نہیں ہے، میں اکثر اس سے الجھ پڑتا ہوں اس کی سنگدلی پر، لیکن یار! مجبوری ہے وہ پھر مجھے منالیتی ہے اور تم تو جانتی ہو کہ میں کسی سے ایک دن کیا ایک گھنٹے ناراض نہیں رہ سکتا، اب ہنس بھی دوروی!“ وہ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور اشمیل کی شرارت بھری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”اشمیل پلیز!“ اس نے بہت تیز گاڑی چلائی اور بریک لگائی تو وہ اُچھل پڑی۔

”تم ایک بار بتلا دو کہ تمہاری خواہشات کہاں تک ہیں اور تم کیا چاہتے ہو؟“ اشمیل نے ہنستے ہوئے اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کو دیکھا جو ابھی تک مل رہا تھا، اس کے چپ رہنے پر وہ بول پڑا۔

”ایک تو یار! تم اتنا کھلم کھلا مجھے ذلیل کرتی ہو کہ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

”جب یہ طے ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف ایک دوستی کا رشتہ ہے تو پھر کیوں ناں ہم تم ایک بار ہی سب کچھ ڈسکس کر لیں۔“ تو اشمیل اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم مجھ سے اتنی جلدی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو؟“

”ظاہر ہے، میں آپ کو زیادہ دن الجھا ہوا اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔“

”او۔۔۔۔۔ آئی نو، تو یہ بات ہے، تو تم اب لوٹنا چاہتی ہو؟“ تو رومی کی براؤن آنکھوں میں ایک سمندر سا ابل پڑا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ کوئی میری نیت پر شک کرے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، پھر وہی جملہ۔“

”تھوڑا سا میری خاطر برداشت کر لو، میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں، دراصل میں عورتوں کو آج تک نہیں سمجھ سکا۔“ رومی نے بہت غور سے اس کی جانب دیکھا، تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بولا۔

”کم از کم ان عورتوں کی دوڑ میں تم شامل نہ ہو۔“ تو رومی کے ہونٹ بھی ہلکے سے مسکرائے۔

”دیکھو ناں یار! مام کیا کیا چکر چلانے لگتی ہیں، اب تمہیں کیا خبر کہ آج کل وہ کن چکروں میں ہیں، دوسری طرف ارج نے بھی ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ جلدی واپس آؤ، ہر بار دھمکی دیتی ہے، ورنہ میں خود آ جاؤں گی۔“

”تو بلا لوناں۔“ تو پلٹ کر اشمیل نے بہت غور سے اس کو دیکھا تھا۔

”تو تم میرا اچھا ہمتی ہو، پاپ اسی دن مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیں گے۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا تمہارے ساتھ، میں ان کے سامنے آ جاؤں گی، میں نے تنہی لوگوں سے سکھ لیا ہے، گیوائنڈ ٹیک والا معاملہ ہوگا، تم ارج کے رہو گے لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی کچھ دینا ہوگا۔“ اشمیل نے چونک کر بہت غور سے دیکھا، تو وہ ہنس کر بولی۔

”میں بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئی ناں۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتا تمہارے اس جملے کو میں ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکا۔“

”کسی نہ کسی دن سمجھ جاؤ گے۔“ وہ ابھی تک اشمیل کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی کی رفتار، ویرانیاں، رنگوں بھری شام وہ گھر وہ آنگن سب کچھ اُداس تھا، حماد چند ہفتوں رہ کر جانے کی تیاری

رواڈ انجسٹ [33] ستمبر 2012ء

کر رہے تھے، نرم سنہری دھوپ پورے ایئر پورٹ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی، شام کا پہرا اترنے کو تھا، ماہم اماں کا ہاتھ تھا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی، حماد گاڑی سے اتر کر اماں ہی کی جانب دیکھ رہے تھے، اماں کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے، البتہ ایک اداسی ضرور تھی، ماہم سامنے کھڑے حماد سے بولی تھی۔

”بھائی! جلدی جلدی آیا کریں۔“ حماد نے اماں کو دیکھ کر سر ہلایا تھا، اماں کا سرخ گداز ہاتھ تھا، ہوئے ماہم کی گرفت ان کے بازو پر سخت ہو گئی تھی، وہ اداس اس لیے نہیں تھی کہ حماد جا رہے تھے، اداس وہ اپنی ماں کے لیے تھی کہ اس کی ماں اداس ہے، اس کی ماں دکھی ہے اور حماد بھائی جا رہے ہیں۔

”میں آیا کروں گا ہر سال، تم لوگ اماں کا خیال رکھا کرو۔“ حماد کی سیاہ گہری آنکھیں بوجھل بوجھل، جھکی جھکی سی ماہم کے چہرے پر پڑیں تو وہ منہ پھیر گئی، دکھ کے بادل کہیں دور برس گئے تھے، زندگی کی اس بھیڑ میں وہ اماں کا ہاتھ تھا، گھر لوٹ آئی تھی۔ اتنی دیر تک اماں حماد کے خالی کمرے کو دیکھ کر روتی رہی تھیں۔

”جاؤ یہاں سے تم، کیوں پیچھے پیچھے آ رہی ہو؟“ اماں کبھی کسی کے سامنے نہیں روتی تھیں، اس وقت بھی وہ اپنا دکھ تنہائیوں میں چھپا رہی تھیں، خاموشیاں گہری ہو گئی تھیں، ایک گہرا سناٹا اور خاموشی تھی، سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ زویہ بھائی اور عماد بھائی اپنے کمرے میں تھے، اماں کے بیڈ روم میں ثروت باجی، ماہم اور انعم بیٹھی تھیں، ماہم کو پھر یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے بیچ شانزے کھڑی ہوئی تھی، پھر چپکے سے اتر کر اماں کے قریب ہو کر بیٹھ گئی تھی، اماں بار بار اپنے بچے کو جھاڑے جا رہی تھیں۔

”جاؤ جا کر اس کمرے کی گنڈی لگا دو، سب کچھ میں نے اس کے لیے کیا تھا۔“ اماں کے دکھ سے آنسو نکل آئے تھے، ثروت باجی اماں کے کمرے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھی تھیں، انہوں نے اپنے دونوں پیر اماں کے بیڈ پر رکھے ہوئے تھے۔ ماہم نے دور کھڑے ہوئے ثروت باجی کو اشارے سے کہا تھا کہ۔

”پیر تمہارے گندے ہیں، اپنے پیر ہٹاؤ۔“ اماں بے حد نفاست پسند تھیں، کوئی ان کے بیڈ پر پیر رکھے یہ انہیں پسند نہیں تھا، شاید اسی لیے ثروت باجی نے تلملا کر ماہم کو دیکھا اور پیر ہٹا لیے اور جاتے جاتے آہستہ سے ماہم سے بولی تھیں۔

”اپنے پیروں کی طرف ذرا غور کر لو۔“

”ہاں تو اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اماں کو نہیں پسند کہ کوئی گندے پیر ان کے بیڈ پر رکھے۔“ وہ بہت نفرت بھرے انداز سے دیکھتی ہوئی چلی گئی تھیں، پھر کچھ دیر بیٹھ کر ماہم بھی اپنے گھر چلی گئی۔ اس رات اداسی بال کھولے ماہم کو یوں لگا شانزے کی مرقد پر رو رہی ہے، اُسے اماں کی بے قرار آنکھوں کے آنسوؤں میں شانزے نظر آئی تھی، پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے آنسوؤں میں شانزے کی شبیہ تھی، دکھ کے ڈھیروں بادل آنکھوں سے برس گئے، مگر طویل رات پاگل کتے کی طرح ماہم کو اپنے گھیرے میں لپیٹے رہی، ماہم کے شوہر اس سے بول رہے تھے۔

”تمہاری ماں بہت شریف ہے اور تمہارا بھائی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بھی بالکل بیوقوف ہے، یقین نہیں آتا اتنا جینٹل آدمی بے بس نظر آتا ہے، دو جوتے اتار کر لگائے ابھی ٹھیک ہو جائے، عصمت کو ایسی عورت ہے وہ، لیکن تم لوگ ہو کہ کچھ بولتی ہی نہیں ہو، ہمارے ہاں ایسا ہوتا تو اماں جان خود جوتے لگاتیں، بہو بیگم کو، لیکن تمہاری اماں نے تو بڑھ چڑھ کر ان کا سامان رکھوایا، یہ کیا بات ہوئی؟“ لیکن ماہم اپنے میکے کی پرسنل لائف کبھی اپنے شوہر سے ڈسکس نہیں کرتی تھی۔

”میں کبھی اس گھر میں انٹرفیئر نہیں کرتی اور نہ اماں پسند کرتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی، ہماری بہنیں تو بہت کرتی ہیں انٹرفیئر۔“ ماہم کے شوہر بولے۔

”اُس گھر کی کہانی کچھ اور ہے اور اس گھر کی کہانی کچھ اور ہے، ہم اماں کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتے، اماں کو پسند نہیں آئے گا، سب کچھ تو بتایا تھا اماں کو، مگر اماں میری نہیں سنتی تھیں، بتایا تو تھا کہ کالج میٹ شہناز کہتی ہے کہ تمہارا کوئی گناہ تمہیں کاظمی باؤس لے کر جا رہا ہے، لیکن اماں نے ہمیں دھمکی دی کہ وہ حماد کو بتا دیں گی سب کچھ، اماں کو سب کچھ یاد ہے، کہتی ہیں بیٹا ہم کیا جانیں ایسے لوگوں کو، کیسے دھوکے باز اور فراڈیے لوگ تھے۔“ ماہم نے کہہ کر سونے کے لیے کروٹ پدلی تو کھٹاک سے شیر شاہ کی پہاڑیوں کے اوپر سرخ سورج ڈوب رہا تھا، اور وہیں چھپاک سے شانزے اتر کر آ رہی تھی، کاظمی کی سفید کرولا کا ہارن بج رہا تھا۔

”ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں شانزے! یہ مالدار لوگ غریب بستیوں میں علم خریدنے جاتے ہیں، خود تو پڑھتے نہیں ہیں سارے جاہل ہیں، چنو، منو، زبجو، ججو، بھیا کو خرید رہے ہیں اور ہماری اماں ان کے جال میں پھنس چکی ہیں، یہ ایسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں یارا!“ اس نے شانزے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ لگا کہ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں؟“ شانزے بولی۔

”ان کے چہروں کی طرف میں جب دیکھتی ہوں تو ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، ان کے چہرے پر ایک خول چڑھا ہوا نظر آتا ہے، چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

”کل مس شان کہہ رہی تھیں ہر لڑکی کو اپنے دفاع کے لیے اپنی شلوار کی پاکٹ میں پستول نہ سہی ایک چاقو تو رکھنا چاہیے، تو غنچہ جعفری ہنس کر بولی، مس! جب تک ہم اپنا عبا یا اوپر کریں گے چاقو نکالنے کے لیے وہ تو کام کر چکے ہوں گے، پوری کلاس ہنس کر پاگل ہو گئی تھی مس شان کو غصہ آ گیا تھا۔“ شانزے خود ہنس کر اپنی کلاس کا قصہ سنارہی تھی۔

”چلو، اماں نیچے سے آواز دے رہی ہیں۔“ شانزے نے اپنے بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹ لیے تھے، نیند کی گہری وادی میں ماہم شانزے کا ہاتھ پکڑ کر اتر گئی تھی، کس پہرہ سوئی یا جاگی کچھ پتہ نہ لگا، صبح جب اٹھی تو رات کا یہ خواب اس کی آنکھوں میں منڈلا رہا تھا۔

”تورات شانزے مجھ سے ملنے آئی تھی، اماں کی وہ چھت وہ شیر شاہ کی پہاڑیوں پر چمکتا ہوا سورج، سب کچھ تو ویسا ہی تھا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔“ وہ بڑی خوش اور مطمئن سی بیٹھی کوئی کپڑا اسی رہی تھی، اماں کی طرح اُسے بھی کپڑے سینے کا جنون تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑی دادی کا فون آیا تھا، ارسلان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی، تیاریاں زوروں پر تھیں، کلثوم نے جو جمع پونجی ایشل کے لیے کر رکھی تھی وہ ساری کی ساری زویا کے لیے نکال کر رکھ دی۔

”دیکھو ایشل! یہ سیٹ ہے تو تمہارا، تم نے اپنی نوکری کے پیسوں سے بنایا ہے، پر کیا کریں عزت کی بات ہے، ایسے ایسے تو وہ دیسیوں سیٹ لے کر آئے گی، پتہ ہے ایشل! زویا کی خالہ دہی سے آرہی ہے اور ماموں امریکا سے، چچا چچی بھی تو سعودیہ سے آئیں گے، ان کے ہاں تو سونے کی ریل پیل ہوگی، ایسا کرتے ہیں کہ تمہارا یہ سیٹ ارسلان کی بری میں رکھ دیں گے، جب واپس آئے گا تو میں ایک دو دن کے بعد زویا سے کہہ کر واپس لے لوں گی۔“

”دیکھ لیں اماں! دینا آسان ہے لینا بڑا مشکل ہوتا ہے، خواہ خواہ بد مزگی ہوگی لینے میں۔“

”ارے ایسی تھوڑی ہے زویا، کھاتے پیتے گھرانے سے ہے، ایسے سیٹ تو مجھے اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے نظر

آتے ہیں، تم گھر کی حالت دیکھ لو، اوپر کا پورشن انہوں نے کنٹریشن کروا دیا ہے کہ ہم لوگوں کو تکلیف نہ ہو، وہ تو بچاری ایک کمرہ لے گی، بس تمہاری دادی بیچ میں رخنہ بنی ہوئی ہیں، ہر بات میں اور اب تم ان سے ذکر کرنے مت بیٹھ جانا، ورنہ وہ تمہارے باپ کو لے کر بیٹھ جائیں گی کہ میں تو جو کچھ کر رہی ہوں غلط کر رہی ہوں۔“

”اماں! ہمیں دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ دے دیں بلکہ جیو تو ہمارا جاننے والا ہے، آپ کہیں تو میں زویا کے لیے دو کڑے کی بات کر لوں؟ قسطوں میں اُتار دوں گی، اماں میری دوست کا بھائی جیولر ہے، بہت بڑی ان کی گولڈ کی شاپ ہے، اکثر ان کی اماں سب کی مدد کرتی ہیں۔“

”پہلے کیوں نہ بتایا مجھے؟ ٹوٹی پھوٹی چیزیں میں اونے پونے دام بیچ کر آئی ہوں، کیا ملا ہے ایک لاکھ ہاتھ میں آیا ہے، سونا دیکھو آسمان پر پہنچ رہا ہے، یہ تم نے غنڈہ کی کی سیٹ بنو الیا۔“

”اماں! میں نے نہیں یہ تو دادی نے تھوڑا تھوڑا کر کے بنو الیا۔“

”اچھا، اچھا بس، ساری تعریفیں دادی کی، اپنے بابا کے سامنے مت لے کر بیٹھ جانا یہ بات، بری میں بھی میں چھپا کر پرس میں لے جاؤں گی اور زویا کی ماں کے ہاتھ میں رکھ دوں گی، ارے بس دکھاوا ہے، انہیں ضرورت تھوڑی ہے، بس دعا کرو، خیر سے دو چار دن رہ گئے ہیں، گزر جائیں گے، ابھی! ہم نے تو صاف کہہ دیا ان سے کہ ہندی کی رسم نہیں ہوگی، کیا کریں پیسے ہی کچھ بیچ جائیں گے، ہاں وہ اپنی طرف خوب دھوم دھام سے کریں، کہہ رہے تھے آج شام تک فرنیچر آ جائے گا، تمہارے ابا دوپہر کے عائب ہیں، اللہ جانے کہاں نکل گئے اور ارسلان کے تو دماغ ہی نہیں مل رہے، مجھے تو لگتا ہے روی کا بھوت ابھی نہیں اُتر اس کے ذہن سے۔“

”اماں پلیز!“ ایشل نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”ضروری ہے کہ ہر وقت گھر میں دھنکنا فساد ہو، اور ہر بات میں آپ روی کو لے کر آئیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”آگ لگتی ہے جب تمہیں دیکھتی ہوں، سامنے پتہ ہے زویا کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی کہ آپ لوگوں کو روی کے بجائے ایشل کو بیاہنا تھا، کتنی کوشش کی بچاروں نے ارسلان کے ساتھ تمہارا بھی کہیں شتہ ہو جائے، لیکن سب ہماری اصلیت جانتے ہیں کہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اب تم دیکھنا جو ہمارے گھر کی شان و شوکت ہو گئی ہے ارسلان کے روم میں زویا کا فرنیچر ہوگا تو تمہارا رشتہ ایک دن میں طے ہوگا۔“ وہ پُر امید سا ہو کر بولیں۔

”اماں! گھر اور فرنیچر دیکھ کر رشتہ طے نہیں ہوتا، رشتہ انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔“

”چپ کر جا ایشل! اللہ اللہ کر کے وہ دن آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا کہ میرا بھی شاندار گھر ہو، یہ سب کچھ زویا کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس کے باپ نے کنٹریشن ہمارے گھر کی فری کروائی ہے، ایک ایک کمرے میں ماربل اور ٹائل لگے ہیں، واش روم تو جا کر دیکھو، کیسا جگمگا رہا ہے۔“ وہ بڑے پُر جوش انداز میں بول کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”میں کب کہہ رہی ہوں اس دوڑ میں مجھے شامل کر رہے ہو؟“

”شیور، تم بہت جینکس ہو، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے ایک اچھا دوست کھو دیا۔“

”میں کوئی زیادہ تمہارا امتحان نہیں لوں گی۔“

”میں تمہارے امتحان میں پورا اُتروں گا، بٹ اس وقت تم باہر آؤ۔“ جونہی وہ دو قدم اُتر کر باہر چلا تھا، تبھی اس کے آئی پیڈ پر میج کلک ہوا۔

”او، ارج! از آن لائن۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہ سیاہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔

”رومی! ون منٹ۔“ کہتے ہوئے اشل بولا۔

”ہیلو، ہیلو ارج!“ اشل کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

”تمہیں خبر ہو گئی کہ میں اس وقت باہر نکلا ہوا ہوں؟“

”اوپار! میں بہت خوبصورت جگہ پر ہوں، جہاں سمندر ہے، ریسٹورنٹ ہے، ہمارے ملک کی خوبصورت ہوائیں ہیں، اور ساتھ میں ایک خوبصورت دوست۔“ وہ رومی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا، رومی دو قدم ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”یوشٹ اپ، مجھے اس طرح کے جوک اچھے نہیں لگتے، وہ تمہاری دوست نہیں ہے، میں تمہاری وائف ہوں، سچ سچ بتاؤ اشل! تم اس وقت اس کے ساتھ کیا رو میس کرنے آئے تھے؟“

”کہاناں یار! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”یعنی بہت اچھی لڑکی ہے؟“

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں ارج! تم بس ہر بات کو پکڑ لیتی ہو، الجھا کر رکھ دیتی ہو۔“

”اچھا، تو اب میں تمہیں الجھا کر رکھ دیتی ہوں، سارے میز میں نے تمہیں سکھائے ہیں، تم تو سوسائٹی میں مود کرنا بھی نہیں جانتے تھے، پاکستانی سوسائٹی کے چیپ لڑکے۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔

”یار! آہستہ رومی سب سن رہی ہے۔“

”سو واٹ؟ وہ سن رہی ہے۔“ وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”اس سے کہو کہ وہ تم سے دو میل دور چلی جائے۔“

”میں کیسے کہوں؟“

”تو میری بات کراؤ، میں کہہ دیتی ہوں، وہ ہمارے درمیان کیا کر رہی ہے اس وقت؟“

”اس وقت یار! وہ کنکر اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینک رہی ہے۔“

”نو... شی از ویری ویری ایشلی جنٹ۔“

”او، ہوشی از ویری ویری ایشلی جنٹ۔“

”نو ڈاؤٹ۔“

”شاید اسی لیے وہ اتنی جلدی سے ٹر پیج گئی۔“

”ہاں، تو ہم نے ٹریپ کیا تو وہ ہو گئی۔“

”بس اشل! میں نہیں زیادہ دن برداشت کر سکتی اس کھیل کو، اس کو کھڑے کھڑے ڈائیو رس دو، اور واپس آؤ، پھپھو جانی جو کہہ رہی ہیں اس پر عمل کرو۔“ ارج کے لہجے میں ضدی تھی۔

”یار! تم کیسی باتیں کرتی ہو، پہلے میں نے اس بے چاری کو دھوکا دیا، اب میں اُسے آدھے راستے میں چھوڑ کر امریکہ آ جاؤں؟“ وہ کچھ پشیمانی و حیرانی سے بولا۔

”ہم اُسے اتنا دے دیلا دیں گے کہ اسے دکھ نہیں ہوگا، وہ خوشی خوشی تم سے ڈائیو رس لے لے گی۔“ ارج کے لہجے میں ایک گھمنڈ سا تھا۔

”لیکن ارج! یہ بات یاد رکھنا کہ وہ خود مجھ سے ڈائیو رس لے گی تو میں دوں گا، میرا دوست فاخر کہتا ہے کہ ایسا مت کرنا رومی کے ساتھ، لیکن پھر بھی وہ کوآپریٹو لڑکی ہے، مجھے صرف اپنے پاپ کا ڈر ہے، تم انہیں نہیں جانتیں، اگر

انہوں نے سب کچھ ہم سے لے لیا تو ہم پیدل ہو جائیں گے، میرا امریکہ کا اکاؤنٹ انہوں نے بند کر دیا، تم دیکھو کتنی مشکلات آرہی ہیں۔“

”تمہارا پاپ بڑھا کھڑا ہے۔“ وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

”پاپ کو ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ وہ کچھ غصے سے بولا۔

”کیوں، برا لگ گیا؟ پھو جانی تو خود انہیں بڑھا کھڑا کہتی ہیں، تمہیں بہت بُرا لگ رہا ہے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”وہ ان کی وائف ہیں۔“ اس نے اسے باور کرایا۔

”تو میں تو تمہاری زندگی ہوں، سوچ لو تم، جان مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے، کراؤں اس کے ساتھ ایک ڈیٹ؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”جان سے مار دوں گا تمہیں اور جان کو، آ کر قتل کر دوں گا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”اوہو، اتنا جیلز ہو رہے ہو، کیوں تم ہر وقت رومی کے ساتھ ساتھ نہیں گھوم رہے ہو، میں ایک ایک پل کی خبر رکھ رہی ہوں، زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرنا اس سے، اب تو سنا ہے تمہارے خیالات بھی بدلنے لگے ہیں۔“ وہ مسلسل اسے زچ کیے جا رہی تھی۔

”کیا کہا، کیا کہا تم نے؟“ اب کے وہ چونک کر بولا۔

”جو تم نے سنا، تمہیں وہ بہت اونٹ لگتی ہے، دو ٹکے کی لڑکی، جس نے خود کو بیچ دیا، تمہارے ساتھ راتیں گزار رہی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے ہو۔“ اب اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ و تغردونوں تھا۔

”ارج! بس، بس اس ٹاپک پر دوبارہ بات مت کرنا، میں اس کے بیڈ پر کبھی نہیں سویا، وہ مجھے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھتی، آئی سویئر، میں گلٹ فیل کرتا ہوں کہ ایسی لڑکی کو مام نے دھوکا دیا۔“ وہ رومی کا سوچ کر شرمندہ سا ہو کر بولا۔

”نان سینس، اس کو دھوکا نہیں کہتے، اس کو سودا کہتے ہیں، اس کو اس چیز کا بھاری معاوضہ ملے گا، وہ زندگی بھر عیش کرے گی۔“

”ارج! میں نے کہا ناں مجھے بُرا لگتا ہے، جب تم اس کے لیے بیڈ لینگو توجہ یوز کرتی ہو۔“ وہ اپنے ہی جذباتوں سے الجھ کر بولا۔

”اچھا، اچھا، ذرا مجھے بھی تو اس کا جلوہ کراؤ، وہ جل پری اس وقت کیا کر رہی ہے، پانی میں ہے یا پتھروں سے کھیل رہی ہے؟“ وہ کچھ حسد سے اور کچھ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

”وہ تمہاری طرح نہیں ہے، وہ اس وقت بہت دور نکل گئی ہے، اور کسی بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی ہے۔“ تبھی اسے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے رومی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

”سوری ارج!“ وہ بہت تیزی سے رومی کی طرف دوڑا، جب وہ گھبرایا ہوا قریب پہنچا تو ایک کپل بار بار رومی کا ہاتھ پکڑ کر تھینک رہا تھا۔

”آپ نے ہمارے بچے کی جان بچائی۔“ سمندر میں طغیانی آئی ہوئی تھی، آگے جانا منع تھا، پھر بھی وہ آدمی اپنے بیوی اور بچے کو چھوڑ کر گھر سے سمندر میں گیا تھا، جونہی پانی کی لہر گزری تو اس آدمی نے سر اٹھا کر اپنی بیوی کو کہا تھا۔

”پکڑو، پکڑو، چھوڑنا مت۔“ مگر اس کی بیوی نے غلطی سے بے اختیار می میں بچے کو چھوڑ دیا تھا، لہر نے اس بچے کو

اٹھا کر پتھروں کی جانب پھینکا تو رومی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر بچے کو پکڑ لیا تھا، لہر نے پورا رومی کو پتھروں پر گڑ دیا تھا، وہ جگہ جگہ سے زخمی ہو گئی تھی، مگر اس نے 3 سالہ بچے کو اپنے سینے سے چھینچ رکھا تھا، اشمیل جب بھاگ کر وہاں پہنچا تھا تو وہ لوگ اس کے زخموں کو دیکھ رہے تھے اور وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

”اٹس اوکے، ایسا ہوتا ہے، اس میں ماں کا قصور نہیں، اس موسم میں اتنے گہرے سمندر میں آپ گئے کیوں؟“

”میں نے تو کہا تھا اس کو پکڑو۔“ وہ آدمی اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ کہہ رہے ہیں اس کو چھوڑ دو۔“ بچے کی ماں بولی۔

”اگر یہ بچے کو نہ پکڑتیں تو لہر نے ہمارے بچے کو پتھروں پر پھینک دیا ہوتا، کل ہی ایک ایسا حادثہ ساحل سمندر پر ہوا ہے، بچہ آن اسپاٹ سر پر چوٹ لگنے سے مر گیا تھا۔“ بچے کا باپ بولا، تو رومی پلٹ کر بولی۔

”اس کے باوجود آپ اس بچے کو چھوڑ کر گئے؟“ رومی نے کچھ برہمی سے پوچھا۔

”خیر چلیں، آپ کا بے حد شکریہ، آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں، آپ کو جگہ جگہ چوٹیں لگیں مگر آپ نے میرے بچے کو چھوڑا نہیں، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ ماں بچے کو گود میں لے کر آنسو پونچھ رہی تھی، بچے کو گود میں لیے لیے اس عورت نے پھر ایک بار رومی کے بھیکے ہوئے جسم کو خود سے پٹنا کر پیار کیا تھا۔

”میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی، آپ نے ہمیں ایک بڑے حادثے سے بچالیا۔“ پھر اشمیل کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بہت خوبصورت کپل ہے، لیکن آپ کی وائف بہت خوبصورت، نازک اور حساس لگتی ہیں۔“ وہ عورت ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔

”شیور، اب ہم چلتے ہیں۔“ اشمیل نے رومی کا بازو تھام لیا تھا، اسی دوران ارج بار بار اشمیل سے کانٹیکٹ کر رہی تھی۔

”ارج! اس وقت میرا بالکل موڈ نہیں ہے بات کرنے کا، میں گھر جا رہا ہوں، رومی کو بہت چوٹیں آئی ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا اور آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

”میری بد دعا لگی ہے اس چڑیل کو۔“ ارج کی آواز رومی نے سن لی تھی تو اشمیل نے گھبرا کر موبائل آف کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں اشمیل! کسی بھی بیوی کا یہی ری ایکشن ہوگا جو ارج کا ہے، تم شرمندہ مت ہو۔“ لیکن پھر بھی وہ جھینپا جھینپا سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

”ارے یہاں کہاں؟“ گاڑی رکتے کے ساتھ ہی وہ بولی تھی۔

”کیوں یہ چوٹیں تمہیں نظر نہیں آ رہیں؟“ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”یہ بہت معمولی چوٹیں ہیں۔“ نجانے اس کی آواز میں کون سا دکھ، کون سی کہانیاں چھپی تھیں کہ اشمیل نے اپنا رخ باہر کی طرف پھیر لیا اور وہ خود بھی اس وقت خاموش بیٹھی رہ گئی کہ چھپے ہوئے بھید زبان پر کیسے آ گئے۔

”اب وہ ہمارے بارے میں کیا سوچے گا؟“ جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُترتا تو ہنس کر بولا۔

”میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا اور نہ ہی کچھ جاننا چاہتا ہوں رومی!“ وہ کچھ دگر فتنہ سا بولا۔

”لیکن تم جان تو گئے۔“ وہ افسردگی سے نظریں جھکا گئی۔ بڑے سے بلیک آنچل کو وہ تھامے ہوئے بظاہر اشمیل کے ساتھ چل رہی تھی، لیکن ذہن کی اسکرین پر ایک خالی فلم سی چل رہی تھی۔

”کاش! ایسا نہ ہوتا، یہ ہماری فیلنگ سے بے خبر رہتا۔“ جب وہ کلینک سے باہر آئے تو اس وقت بھی وہ رومی کا

ہاتھ تھامے ہوئے لفٹ سے باہر آیا تھا۔

”آپ کیوں اتنی حفاظت سے میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں؟ کیا میں شیشے کی گڑیا ہوں جو ٹوٹ جاؤں گی؟“ وہ مسکرایا۔

”گڑیا تو نہیں، بریو بہت زیادہ ہو، اور میں بہت بزدل اور کمزور ہوں۔“ رومی کے دل میں ایک گہرا سناٹا اُتر اُٹھا، وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی رخ پھیرنا چاہ رہی تھی۔

”پتہ ہے رومی! میں بھی بہت بہادر ہوں، ایک بار میری کلاس کا بچہ پانی میں ڈوب رہا تھا۔۔۔“

”سمندر میں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”سنو تو یار! تسلسل ٹوٹ گیا، دیکھو دیکھو غور سے سنو، میری کلاس کا بچہ ڈوب رہا تھا پانی میں، میں نے جمپ ماری اور اس کو بچا کر باہر لے آیا۔“

”اشمل! تم اشمل! یو آر گرینٹ!“

”سب نے بہت شاباشی دی، ٹیچر نے پوچھا کہ تم نے اپنے دوست کو بچا لیا، تو میں بولا۔“

”جی سر! کیوں نہ بچاتا، اس کی جیب میں میرا روپیہ تھا۔“ وہ پرانا قصہ یاد کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”اشمل!۔۔۔!“ رومی بہت زور سے چیخی تھی، پھر ہنسنے لگی۔

”اتنی غور سے مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ گاڑی کے قریب جاتے ہوئے بولی تھی۔

”تم اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی ہو، خاص طور پر ہنستے ہوئے۔“

”مجھے اپنی تعریف اچھی نہیں لگتی۔“ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔

”آئی نو، پھر بھی کبھی کبھار تو چلتا ہے ناں، سچ تو سننا پڑتا ہے ناں، سچ سننے کی عادت ڈالو۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”سچ سننے کی بہت پرانی عادت ہے مجھے، آپ فکر نہ کریں۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”آج کی رات بہت خوبصورت تھی، کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ اس کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا، اشمل! تم اس وقت کچھ زیادہ ایوشنل نہیں ہو رہے؟“ وہ چونکی۔

”سوچ رہا ہوں جو لڑکی جانوروں سے اتنی محبت کرتی ہو، وہ انسانوں سے کتنی اٹچ ہوگی، رومی! سچ بٹا دو، جب تم

مجھ سے جدا ہوگی تو کیا برداشت کر لوگی یا نہیں؟ مجھے صرف اس بات کا جواب چاہیے۔“ اس کا لہجہ پُر سوچ سا تھا، جیسے وہ

کسی گہری سوچ میں ہو، اور کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا ہو۔

”کیا ضروری ہے جواب دینا؟“ وہ عجیب دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”ویری اپورٹنٹ۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

”چھوڑو، اشمل!“

”میں نے تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑا۔“ وہ شرارت سے ہنسا، گاڑی گھر کے بہت قریب آ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

(جاری ہے)

قمر و شہک

مکمل ناول

دلو کا کس

”دوسو کروڑ....“ انا بیہ شک کڈتھی اور جتنی شک کڈو تھی اس سے کہیں زیادہ پریشان فاروق خان تھے۔
”مگر بابا! یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے ہم؟“

”ہاں بیٹا! رقم تو بڑی ہے اور مہلت بھی ایک ہفتے کی ہے۔“
”تو آپ بینک سے لون لے لیں اور پھر میرے پاس جو گولڈ اور جیولری ہے وہ کس کام آئے گی؟“ اس سے اپنے عزیز از جان بابا کی پریشان حال صورت دیکھی نہیں جا رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کچھ کر دے۔
”میرا بچہ! تمہارا باپ اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ اپنا قرض چکانے کے لیے اپنی بیٹی کا زیور بیچ دے۔“ انہوں نے انا بیہ کے سر پر دست شفقت سے ہاتھ رکھا تھا، مگر ان کی بے بسی انا بیہ سے چھپی نہیں رہ سکی۔
”ایسا کیوں بول رہے ہیں آپ، جو چیز میرے پیارے بابا کے کام نہ آئے وہ میرے لیے بے کار ہے۔“ اس نے ان کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔
”پھر اس ٹاپک کو فی الحال چھوڑو، اور زیادہ پریشان مت ہو، یہ میرا ہیڈک ہے، میں خود ہی ہینڈل کر لوں گا۔“
”نہیں بابا! یہ آپ کا ہیڈک نہیں ہے، مجھے بہت فکر لگ گئی ہے اور میں آپ کو اپنا سارا زیور لاکر دوں گی، اگر آپ نے نہیں لیے تو میں خود جیولرز کے پاس جا کر سیل کر دوں گی۔“



”ارے مجھے تو آج پتا چلا کہ میری بیٹی بڑی ہو گئی ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

”جی ہاں بابا! اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور اب سے میں آپ کے بزنس میں ہاتھ بھی بٹاؤں گی۔“

”اوکے، اوکے مگر ابھی تو مجھے بہت بھوک لگی ہے، کھانا ملے گا یا آج بھوکا سونا پڑے گا؟“

”اوہ، سوری بابا! میں تو بالکل ہی بھول گئی، ابھی لگواتی ہوں۔“ وہ فوراً کچن کی طرف بھاگی تھی۔ دراصل اسے دوسو کروڑ کے ٹاپک سے ہنانا تھا، اس کا دھیان بٹانا تھا جس میں وہ کامیاب بھی رہے تھے۔

بزنس میں انہیں بہت نقصان پہنچا تھا، بزنس تقریباً سارا ہی خسارے میں چلا گیا تھا، ان کے بزنس پارٹنر سرمد اصفہانی کے دوسو کروڑ روپے ان کے بزنس میں لگے تھے، جس کا سرمد اصفہانی اب تقاضا کر رہا تھا، سمجھ نہیں آ رہا تھا کیسے اتنا بھاری قرضہ اُتاریں گے، ایک ماہ ہو گیا تھا یہی سوچتے سوچتے کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں، سرمد اصفہانی سے انہیں ایسی امید قطعی نہیں تھی، آخر دھوکا کہاں ہوا تھا، کیوں کیا سرمد اصفہانی نے ایسا؟ وہ سب کچھ خود اکیلے ہی جھیل رہے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سب کے بارے میں انابیہ کو کچھ پتا چلے، مگر بد قسمتی سے جس وقت سرمد اصفہانی کا فون آیا، پیچھے انابیہ کھڑی سب کچھ سن چکی تھی، بڑی مشکل سے فاروق خان نے اس کا دھیان بٹایا تھا، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر گھپلا کہاں ہوا ہے، کہاں ان سے غلطی ہوئی ہے؟ دوسو کروڑ کا قرضہ ان پر چڑھ کہاں سے گیا؟ وہ اتنی خطیر رقم چٹکا میں گے کیسے؟

”بابا! آج آپ نے کہا تھا کہ ڈنر باہر کریں گے۔“ انابیہ بالکل بھول گئی تھی کہ فاروق خان کس کرائس سے گزر رہے ہیں اور ویسے بھی فاروق خان نے بھی بزنس کی باتیں اس سے ڈسکس بھی تو نہیں کی تھیں، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی معصوم بیٹی کے چھوٹے سے ذہن پر کسی قسم کا کوئی بوجھ ہو۔

”نہیں جانو! مجھے بالکل یاد ہے، اچھا ایسا ہے کہ جلدی سے آپ تیار ہو جاؤ، ہم ابھی چل رہے ہیں۔“

”ہرے..... یہ بات ہوئی ناں۔“ وہ نعرہ لگاتی خوشی خوشی تیار ہونے اپنے بیڈروم میں بھاگی تھی جھٹل کے گرین سوٹ پر اس نے بلیک بڑی سی چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا، کوئی پندرہ منٹ میں وہ تیار ہوئی فاروق خان کے سامنے کھڑی تھی جونہایت گہری سوچوں میں منہمک تھے۔

”بابا چلیں!“ مگر فاروق خان نے سنا نہیں۔

”بابا.....!“ پھر پکارا۔

”آں..... ہاں!“ وہ بڑی طرح چونک کر رہ گئے۔

”بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں، اگر نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، ہم پھر کبھی چلے جائیں گے۔“ فاروق خان کو اس طرح سوچوں میں بیٹھا دیکھ کر، پھر یوں چونک جانا انابیہ نے نوٹ کر لیا تھا، وہ جانے سے منع کرنے لگی تھی۔

”ارے نہیں جان! سب ٹھیک ہے، تم تیار ہو گئیں، چلو چلیں۔“ پرل میں بیٹھی وہ اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر کرنے لگی، مگر فاروق خان کا دھیان پھر کہیں دور بھٹک رہا تھا، 15، 20 منٹ میں اس کی پسند کا فوڈ ٹیمبل پر جن دیا گیا تھا، اس دوران وہ صرف فاروق خان سے باتیں کرتی رہی، جس کا انہوں نے سوائے ہوں، ہاں کے علاوہ کوئی جواب نہیں دیا، مگر انابیہ ایسی ہی تھی، بہت باتونی، مسلسل بولنے والی، فاروق خان اس کی باتوں سے کبھی نہیں اُکتاتے تھے، ہمیشہ ہنس کے، مسکرا کے جواب دیتے، آج تک انہوں نے اسے کبھی ہلکے سے ڈانٹا تک نہیں، بہت محبت کرتے تھے وہ اپنی لخت جگر سے، کبھی اس کی آنکھوں میں معمولی سی نمی تک آنے نہیں دی تھی، ذرا سی چھینک بھی اگر آجائے تو ڈاکٹرز کی لائن لگ جاتی تھی، اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کی ہر فرمائش پوری ہوئی تھی، بہت چھوٹی سی تھی، کوئی ایک سال

کی جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا، مگر فاروق خان نے اپنی شریک حیات سے بے وفائی نہیں کی، انہوں نے دوسری شادی نہیں کی، اپنی زندگی انابیہ کی اچھی پرورش، دیکھ بھال، اس کی تربیت کے لیے وقف کر دی، اسے دنیا کے ہر سرد گرم سے، ہر دکھ سے بچا کے رکھا، مگر اب جو حالات نے رخ بدلاتھا وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے، کیسے ان سب کا مقابلہ کریں، انابیہ کی 20 سالہ زندگی میں انہیں دو ہارٹ اٹیک بھی ہو چکے تھے، جس کی انابیہ کو بھٹک بھی پڑنے نہیں دی تھی انہوں نے، مگر ڈاکٹرز نے انہیں بول دیا تھا کہ ان کا مرض بڑھتا جا رہا ہے، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر انہیں سب سے بڑی فکر اپنی زندگی، اپنی جان انابیہ کی تھی، ایسا کون تھا جس کے سپرد وہ انابیہ کو کریں، زندگی بھر کے تحفظ کی ردا کون اس کے سر پر ڈالتا کہ وہ سکون سے مر سکیں، ان کی روح کو قرار ملے، انہی لامتناہی سوچوں میں گم وقت کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

”بابا! آپ کا تو سب کچھ یوں ہی پڑا ہے۔“ انابیہ نے پیٹ بھر کے کھایا تھا، ساتھ ساتھ بولنے کا شغل بھی جاری وساری رکھا۔

”بس بیٹا! میں نے کھالیا، میری اتنی ہی بھوک تھی۔“ انہوں نے مسکرا کے اپنا والٹ نکالا، اس میں سے نوٹ نکال کر ٹیمبل پر رکھے اور کھڑے ہو گئے۔

”ارے فاروق! کیسے ہو؟ میں تمہیں اتنی فون کا لڑکر رہا تھا، تم ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔“ سرمد اصفہانی کی بولتے ہوئے نظر کالی چادر میں لپٹی انابیہ پر جا ٹھہری تھی، تو پھر نگاہ جیسے پلٹنا ہی بھول گئی، وہ حسن و جمال کا منہ بولتا ثبوت تھی، سات پردوں سے جھلکتا حسن کے کہتے ہیں آج سرمد اصفہانی کو پتا چلا تھا، بے شک اس نے کالی چادر سے حجاب لیا ہوا تھا، مگر اس کالی چادر سے جھانکتی بڑی بڑی ہر نی آنکھیں، جس میں کا جل ڈالے وہ کسی کوئل کا ارادہ رکھتی ہوں جیسے، چاند کی چودھویں رات کی اس روشنی میں اس کا چمکتا حسن پھوٹ پھوٹ کے باہر آ رہا تھا۔ سرمد اصفہانی ایک رنگین مزاج نفس کا کمزور آدمی، اس کی زیرک نگاہوں سے یہ پھوٹنا حسن بھی کیسے چھپ سکتا تھا؟

”کون ہے یہ فاروق؟“ وہ اپنی بات بھول کر اس ہوشربا بیکر کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔ فاروق خان اس کی رنگین طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے، جانے کیوں ان کے دل و دماغ میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

”میری بیٹی ہے یہ۔“ وہ اس طرح آگے بڑھے کہ انابیہ کا پورا وجود ان غلیظ نگاہوں سے چھپ کر رہ گیا، سرمد اصفہانی کو تھوڑا ناگوار گزرا، اس طرح فاروق خان کا سامنے آنا۔

”اچھا مگر تم نے پہلے ذکر نہیں کیا کہ تمہاری کوئی خوبصورت بیٹی بھی ہے۔“

”میں نے ضروری نہیں سمجھا، مجھے دیر ہو رہی ہے، پھر بات ہوگی ہماری۔“ وہ پھر زکے نہیں، اپنے پیچھے کھڑی انابیہ کا ہاتھ پکڑا اور پیدھے چلتے چلے گئے، مگر اپنے پیچھے ان دونگاہوں کو ضرور محسوس کر سکتے تھے جو انابیہ کے سراپے پر تھیں، اور ان میں کس قدر خباثت و کمینگی تھی وہ یہ بھی جانتے تھے۔ اور پھر جس بات کا ڈر و خوف دل و دماغ میں کندلی مارے بیٹھا تھا، بالآخر وہی ہوا، وہ اپنے بیڈروم میں سائینڈ جیر پر ہاتھ میں فائل لیے بیٹھے تھے، مگر دھیان ان کا کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا، روم میں بہت خاموشی تھی، قبر سے بھی گہری خاموشی، اور اس گہری خاموشی کو چیرتی ہوئی موبائل کی آواز نے فاروق خان کو بیدار کر دیا تھا، انہوں نے موبائل اٹھایا، جہاں اسکرین پر ”سرمد اصفہانی کا لنگ“ جگمگا رہا تھا، انہوں نے موبائل اٹھایا اور لیس کا بٹن پریس کر دیا تھا۔

”ہیلو!“

”ہیلو فاروق! کیسے ہو یا؟“ نہایت چمکتی ہوئی آواز گونجی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں، تم سناؤ! کیسے فون کیا؟ اور اگر دوسو کروڑ کے لیے فون کیا ہے تو ابھی تک میں انتظام نہیں کر سکا ہوں، جیسے ہی کچھ ہوتا ہے میں خود تمہیں کال کروں گا۔“

”ارے یار! اتنے فارمل کیوں ہو رہے ہو؟ اور میں تمہیں کیا انتظام لگتا ہوں؟“ اتنا بدلہ بدلہ انداز، یقیناً کوئی بات تھی، ورنہ سرمد اصفہانی کا لاپٹی روپ تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔

”مطلب کی بات کرو۔“

”مطلب کچھ خاص نہیں ہے، ہاں اگر تم چاہو تو دوسو کروڑ معاف کیے جاسکتے ہیں۔“ بہت پراسرار انداز تھا۔

”یہ تم پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو، جو کہنا ہے کھل کر کہو۔“ وہ چڑ گئے تھے۔

”دیکھو فاروق! میں اپنے دوسو کروڑ معاف کر سکتا ہوں، اگر تم اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔“

”سرمد! بے غیرت، سچ انسان! تمہیں یہ بات سوچتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی؟“ وہ غصے میں بری طرح دھاڑے تھے۔

”شرم کیسی یار! ہاں اگر تم میری دو بیویوں کے بارے میں سوچ رہے ہو تو بے فکر رہو، انابیہ ان دونوں کے ساتھ نہیں رہے گی، اس کو تو میں الگ محل بنا کے دوں گا، جس میں وہ رانی بن کر راج کرے گی، بالکل شہزادیوں جیسی آن بان ہوگی اس کی۔“

”بکو اس بند کرو اپنی سرمد اصفہانی! ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ وہ غم و غصے کی شدت سے تقریباً پاگل ہی ہونے لگے تھے، بس نہیں چل رہا تھا کہ سرمد اصفہانی سامنے ہو، اس کے سینے میں اتنی گولیاں ماریں کہ وجود پھٹنی چھلنی ہو جائے، ریشہ ریشہ بکھر جائے۔

”اتنی ہمت ہے تم میں؟ خیر یہ تو بعد کی بات ہے، میں نے بھی سوچ لیا کہ تمہیں میں نے بہت مہلت دے دی ہے، مگر اب نہیں، ٹھیک آدھے گھنٹے کے اندر اندر میرے آدی آرہے ہیں انابیہ کو لینے، جب دوسو کروڑ دے دو تو اپنی بیٹی کو لے جانا۔“ سرمد اصفہانی کا انداز بالکل چیلنج ہو چکا تھا، فاروق خان کے دل میں بہت زور کا درد اٹھا تھا، وہ بہت زور سے چیخے تھے۔

”سرکار! کوئی سید ابہتاج عالم آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس دوران ملازم اندر داخل ہوا تھا، مگر اندر کے منظر نے اس کے ہوش و ہواس گم کر دیئے تھے، وہ اُلٹے قدموں واپس بھاگا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُسے ہوش آ گیا تھا، دھیرے دھیرے وہ خوفزدہ ہرنی آنکھیں واہونے لگی تھیں، اس کا وجود کسی نرم و گرم شے پر جیسے بے جان تھا، ذہن کی اسکرین اس وقت بالکل سیاہ تھی، آنکھوں سے ہر منظر مٹ چکا تھا، اُسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بے ہوش ہونے سے پہلے کیا کیا ہوا تھا، دھندلا دھندلا سا صرف یہ یاد آ رہا تھا کہ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی ناول پڑھ رہی تھی کہ دو افراد اس کے بیڈ روم میں بغیر ناک کیے انٹر ہوئے، دونوں ہی بہت جلدی میں تھے۔ ایک نے جلدی سے اس کے کچھ بھی کرنے سے پہلے ہی کوئی شے اس کی ناک پر رکھ دی، جس سے روم کی ہر شے گھومتی ہوئی اپنا اثر کھوتی چلی گئی، آنکھوں میں مکمل اندھیرا چھا تا چلا گیا، اس کے بعد کیا ہوا، وہ کہاں تھی، کچھ نہیں جانتی تھی، مگر ایک بات اُسے یاد آ رہی تھی کہ اس کی نیم بے ہوشی میں اس کا نکاح ضرور پڑھوایا گیا تھا، بس یہاں تک اُسے یاد تھا، پھر اس سے آگے ایک سوالیہ نشان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اپنے گھومتے سر کو تھامے وہ آہستگی سے اٹھی، اس بے ہوش کر دینے والی دوا کا نشہ ابھی بھی اس کی نس نس میں گردش کر رہا تھا، بلیک کراؤن سے فیک لگے تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں موند گئی۔

تھی، سیاہ گھنیری پلکوں کو بمشکل اوپر اٹھایا، ان ہرنی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی، وہ کیرہ تھا یا کوئی محل؟ کیا تعریف کرتی وہ اس روم کی، اس قدر حسین، اتنا بڑا روم، اور روم میں موجود ہر شے اپنی مثال آپ تھی، ایک ایک چیز عمدہ و اعلیٰ، اس کا اندازہ وہ یوں لگا سکتی تھی کہ جیسا حسین و مہنگا بنگلہ ان لوگوں کا تھا اس کمرے کے مقابلے میں شاید وہ کچھ نہ ہو، مگر کسی کے ذوق کی وہ قائل ضرور ہو گئی تھی، یہ بیڈ روم جس کا بھی تھا یقیناً اس کی پسند بہت زبردست تھی۔

”وہ کہاں ہے، یہاں کون لایا ہے اُسے، اور سب سے بڑھ کر اس کے بابا!۔۔۔!“ اپنے سر کو تھامے وہ اٹھی تھی۔

”بابا کہاں ہیں، مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا، اُف اللہ!۔۔۔!“ پھر سے بری طرح چکر آیا تھا، اور زیادہ دیر وہ بیٹھ نہیں سکی، تو پھر سے سر تکیے پر گر آیا، آنکھوں کے گرم سیال بتے بتے تکیے پر جذب ہونے لگے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پورے جسم میں درد ہو رہا ہے، ایک ایک جوڑ دکھ رہا ہے، شاید اُسے بخار ہو رہا تھا، جلن کے مارے آنکھیں تک کھولی نہیں جا رہی تھیں، سفید لٹھے کا شلوار گرتا اس پر بھاری براؤن شال ڈالے قرینے سے بال بنائے، مضبوط جسم کا مالک، لمبے چوڑے سے سید ابہتاج عالم کی شخصیت دیکھنے والوں کو آپ ہی مؤدب کر دیتی تھی، سرخ و سفید رنگت کا مالک سید ابہتاج عالم جس کے چہرے پر زمانے بھر کی سنجیدگی تھی، عنابی گدازلیوں کے جوڑے کے اوپر گھنی سیاہ مونچھیں بہت ڈیشنک لگتی تھیں، وہ اس وقت T.V لاؤنج میں بیٹھا T.V پر کوئی نیوز دیکھنے کے ساتھ ساتھ بلیک کافی بھی پی رہا تھا۔

”ابہتاج پتر! تجھے کتنی بار منع کیا ہے کہ یہ کالا پانی مت پیا کر، مٹواخوان جلائی ہے۔“ بی جان اپنے بیڈ روم سے نکل کر آئیں تو رات کے 9 بجے سید ابہتاج عالم کو یوں کافی پیتا دیکھا تو کہے بنانا رہ سکیں۔

”ارے بی جان! آپ!۔۔۔!“ اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا، جلدی سے کھڑا ہوا، اور انہیں تھامے صوفے تک لایا اور آہستگی سے بٹھا دیا، وہ اپنی بی جان سے بہت محبت کرتا تھا، اپنی جان سے بھی زیادہ، ان کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی، مگر یہ بلیک کافی والی عادت چھوڑ کے بھی چھوڑ نہیں پایا تھا، ہمیشہ رات کو ان کے سو جانے کے بعد ہی پیتا تھا، مگر آج بی جان کی اچانک آمد نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔

”میرے چاند! اتنا دماغ کھپاتے ہو، گاؤں کی ہزاروں مالیت کی زمینیں دیکھنا، پھر یہاں کراچی میں آفس دیکھنا، آئے دن پاکستان سے باہر جاتے ہو کام کے سلسلے میں، پھر جب تم یہ کالا پانی پیتے ہو تو اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی خون جلا کر رکھ دیتے ہو۔“ لفظ ”کالا پانی“ پر سید ابہتاج عالم ہولے سے ہنس دیا تھا۔

”ارے بی جان! یہ خون نہیں جلائی بلکہ ہمیں تو انائی بخشی ہے۔“

”مجھ سے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے، تم رُکو میں تمہارے لیے ملائی والا گرم دودھ لے کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگیں تو سید ابہتاج عالم نے انہیں روک دیا۔

”بی جان! آپ پریشان مت ہوں، اچھا نہیں پیتا یہ کالا پانی۔“ وہ مسکرا کے ان کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا اتنا سنجیدہ و سوبر کم گو سید ابہتاج عالم یوں لاڈ اٹھا سکتا ہے، اس کی شخصیت ہی ایسی تھی جو کوئی دیکھتا وہ یہی اخذ کرتا کہ سید ابہتاج عالم کوئی سخت گیر، مغرور قسم کا بندہ ہے۔

”ہاں اتنا ہی تو تو میرا فرمانبردار ہے۔“

”یہ کیا بات کی آپ نے، اچھا پوچھیے بلکہ حکم کیجئے کیا کرنا ہے؟“

”مانو گے میری بات؟“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”کبھی آپ کی بات ٹالی ہے؟“

”نہیں پھر ٹھیک ہے، شادی کرلو۔“

”بی جان! پھر وہی ضد؟“

”پورے 38 سال کے ہو گئے ہو، تیری عمر کے لڑکے تو 3، 4 بچوں کے باوا ہو گئے ہیں۔“ بی جان نے آج لگتا تھا کہ ٹھان لی تھی، سید ابہتاج عالم سے ہاں کر کے رہیں گی۔

”بی جان! آپ بھی نا۔“ وہ بڑی طرح جھینپ کر رہ گیا۔
”کیا بی جان! بس مجھے نہیں معلوم، میں اب تیرے لیے لڑکی دیکھنے لگی ہوں، کچھ بھی ہو، اب تیری ایک نہیں سنوں گی۔“

”ارے میری پیاری بی جان! صبر، تھوڑا اور صبر، اچھا ٹھیک ہے، مجھے کچھ اور مہینے کی مہلت دیں، پھر آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔“

”چاہے اس دوران میری آنکھ ہی کیوں نہ بند ہو جائے ہمیشہ کے لیے؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
”اللہ نہ کرے بی جان!“ سید ابہتاج عالم نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نرمی سے تھام لیے۔
”آج کے بعد ایسا مت بولیں گے، آپ کو تو میری عمر بھی لگ جائے۔“

”مجھے تیری عمر نہیں چاہیے، تیرے بچے چاہئیں وہ بھی دس، بارہ۔“
”خدا کا خوف کریں، اتنے سارے...؟“ اس کی تو آنکھیں ہی پھیل گئیں۔

”ہاں تو اتنا بڑا محل جس کے تو مجھے ابھی تک یہی پتا نہیں چلا کہ کتنے کمرے ہیں اس میں، وہ سب خالی پڑے ہیں، مجھے اس محل کی خاموشی میں تیرے بچوں کی ہنسی، قلقاریاں، ان کی شرارتیں دیکھنی ہیں، بس یہی میری آخری خواہش ہے۔“

”اُف..... پھر اُلٹی بات، اوکے آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی، مگر تھوڑا سا اور وقت۔“ اس نے لاڈ سے کہتے ہوئے ان کے کمر درشانے پر اپنا سر دھردیا تھا۔

”ٹھیک ہے، ایک مہینہ، اس کے بعد میری چلے گی۔“
”ایک مہینہ بی جان! ایک مہینہ تو بہت کم ہے۔“

”بس اس سے آگے ایک لفظ نہیں، ورنہ میں پھر گاؤں جا رہی ہوں، حویلی میں واپس۔“ انہوں نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے دھمکی دی، جو کارآمد ثابت ہوئی، وہ پھر آگے سے کچھ بول ہی نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

”آخر کہاں جا سکتا ہے فاروق اور اس کی بیٹی؟“ سرد اصفہانی جلے پیر کی بلی کی طرح ٹہل رہا تھا۔
”سر! جب ہم وہاں پہنچے تو پورا بنگلہ خالی تھا، انسان تو کیا ایک چیز یا کچھ بھی وہاں نہیں تھا۔“ سلح گارڈ سر جھکائے بول رہا تھا۔

”ایسا کیا ہو سکتا ہے، آدھا گھنٹہ پہلے میری بات ہوئی تھی، کراچی شہر کا کوئی ایسا کونہ، کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں تم لوگوں نے نہیں دیکھا، پھر آخروہ کہاں جا سکتے ہیں؟“ سرد اصفہانی بہت غصے میں تھا، بازی پلٹ گئی تھی، بلبل اس کے ہاتھوں سے اڑ گئی تھی، اُسے فاروق خان کے غائب ہونے کا کوئی افسوس نہیں تھا، انا بیہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

”سر! میں نے سنا ہے سید ابہتاج عالم آگئے ہیں اس شہر میں۔“
”سید ابہتاج عالم.....!“ وہ حیران نظروں سے گارڈ کو دیکھنے لگا۔

”وہ کب آیا یہاں؟“

”شاید آج ہی۔“ وہ پُرسوج انداز میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا تھا۔
”اگر آج ہی آیا ہے تو پھر فاروق خان اتنی جلدی اُسے کچھ نہیں بتا سکتا، یقیناً وہ انا بیہ کو لے کر کہیں چھپ گیا ہے ڈر سے۔“

”پھر بھی سر! اگر آپ کہیں تو ہم سید ابہتاج عالم کی نگرانی کر سکتے ہیں۔“
”یہ اتنا آسان نہیں ہے، تم جانتے نہیں ہو کیا سید ابہتاج عالم کی پاور کو؟ اگر اُسے ہم پر ذرا سا بھی شک ہو گیا تو وہ کیا حشر کرے گا ہمارا، یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”اور اگر فاروق خان کا ان سے رابطہ ہو گیا تو...؟“
”یہ ناممکن ہے، لیکن مجھے ہر حال میں یہ دونوں چاہئیں، اس سے پہلے کہ سید ابہتاج عالم سے وہ ملیں، دونوں کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر میرے پاس لے آؤ، انا بیہ اب میرے لیے چیلنج بن گئی ہے، پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ اُسے اپنی رکھیل بنا کے رکھوں گا، مگر نہیں، اب میں فاروق خان کو سبق سکھاؤں گا، انا بیہ سے نکاح اُسی کی نظروں کے سامنے کروں گا، انا بیہ کو میری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔“ وہ فاروق خان کو نفرت سے سوچتا ہوا گارڈ کو گھورنے لگا۔

”جاؤ اب نا تم ضائع مت کرو، جتنی جلدی ممکن ہو، ان دونوں کو ڈھونڈ کر میرے پاس لے کر آؤ۔“ حکم صادر ہوا، گارڈ تیزی سے باہر نکلا تھا۔

☆.....☆.....☆

سید ابہتاج عالم اپنی خواب گاہ میں فل سائز بیڈ پر نیم دراز مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ پڑھ رہا تھا، دروازے پر دھیرے دھیرے دستک دی جا رہی تھی، اس نے بگ اپنے چہرے سے ہٹائی۔

”آ جاؤ۔“ اندر آنے کی اجازت ملی تو اس کا وفادار ملازم اندر داخل ہوا تھا، سر کو جھکائے مؤدب سا سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”سائیں! نوری آئی ہے، وہ بتا رہی ہے جب سے انہیں ہوش آیا ہے، وہ روئے ہی جا رہی ہیں، کچھ بھی کھا نہیں رہیں، یہاں تک کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اُتارا، اور انہیں بہت تیز بخار بھی ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، چلو تم اور وہاں دراز میں میرا فرسٹ ایڈ باکس پڑا ہے، وہ بھی لے کر چلو، میں آتا ہوں۔“
”حکم سائیں!“ وہ سائینڈ ٹیبل کی دراز کی طرف بڑھا، بڑی سی دراز کھولے فل سائز فرسٹ ایڈ باکس نکالا۔ سید

ابہتاج عالم نے بگ سائینڈ میں رکھی، گرے بھاری شال مضبوط چوڑے کندھوں پر ڈالے وہ روم سے باہر نکلا، پہلے بی جان کا کمرہ چیک کیا، وہ کمبل اوڑھے بے خبر نیند کی وادیوں کے زیر اثر سو رہی تھیں، ان پر پیار بھری ایک نظر ڈالتا وہ اپنے بڑے سے حسین ترین محل کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر روم میں انٹر ہوا، نوری جو بار بار منتیں کر رہی تھی، مگر وہ اس کی ایک نہیں سن رہی تھی، بس روئے جا رہی تھی، نوری نے سید ابہتاج عالم کو دیکھا تو ایک طرف ہو گئی۔

”جاؤ تم۔“ نوری جس نے ہاتھ میں کانچ کا گلاس پکڑ رکھا تھا، وہ سائینڈ ٹیبل پر رکھتی ہوئی فوراً اس کمرے سے نکلی تھی، دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی، سید ابہتاج عالم نے بغور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ بیس سال کی وہ لڑکی حسن کا جیتا جاگتا شاہکار تھی، میدے جیسی رنگت اس پر اس کے خوبصورت سے نقوش، ہر نی جیسی بڑی بڑی آنکھیں، جن میں ایک سمندر موجزن تھا، نازک سا دلکش قیامت خیز سراپا، کسی شاعر کی غزل جیسی وہ نازک سی دلربا سی لڑکی، بخار کی شدت سے اس کا نازک جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا اور شاید نہیں یقیناً اس کی کھڑی ستواں ناک بالکل سُرخ ہو رہی تھی، اگر وہ سانس

روک لیتی تو کسی ماہر آرٹسٹ کا بنایا گیا وہ مجسمہ لگتی جسے اس آرٹسٹ نے دن رات ایک کر کے بڑی محنت سے بنایا ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اللہ جب بہت فرصت میں ہوگا، جب اس کا مجسمہ تیار کیا ہوگا، تو پھر سرمد اصفہانی جیسا رنگین مزاج، دل پھینک کیوں نا اُسے پانے کی جستجو کرتا، اور ان سب بکھیروں سے وہ بے چاری محسوس سی لڑکی بالکل انجان تھی، وہ یہاں کیوں ہے اُسے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا، وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی، سرمد اصفہانی کا سوچ کر ہی اس کی رگوں میں لاوا دوڑنے لگا تھا، آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔

”نہیں سرمد اصفہانی! میں تمہیں جیتنے نہیں دوں گا، اب تم دیکھو کہ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں، تم خود سب کچھ نہ اگل دو تو میرا نام بھی سید ابہتاج عالم نہیں، فی الحال اس مسئلے پر بعد میں غور کروں گا، پہلے ذرا ان محترمہ سے تو نمٹ لیا جائے۔“ وہ مضبوط قدم ویز کارپٹ پر دھرتا بیڈ کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ انابیہ نے کچھ محسوس کر کے ذرا کی ذرا خوفزدہ ہوتی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وہاں کسی اجنبی کو کھڑے دیکھا جو اسی کو بغور دیکھ رہا تھا، انابیہ نے اس روم میں صرف اب تک ایک عورت کو ہی دیکھا تھا، کسی مرد کو نہیں دیکھا تھا، تو پھر یہ کون تھا؟

”جی تو محترمہ! آپ نے کل کیا پوری گائے کھالی تھی، جو کل سے کھانے کے لیے پریشان کر رہی ہیں؟“ گھمبیر لب و لہجے میں کہتا وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ انابیہ آج تک کسی نامحرم کے سامنے نہیں آئی تھی بغیر حجاب کے، تو پھر اتنی بے پردگی، وہ فوراً سے پیٹروں وہاں اس بیڈ سے دوسری سائیڈ سے اترنے لگی کہ اس کی مخروطی نازک کلائی سید ابہتاج عالم کی مضبوط ہتھیلی میں قید ہو کر رہ گئی، انابیہ نے نہایت بے بسی سے اُسے دیکھا تھا اور اپنی مخروطی گوری کلائی اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروانے کی مزاحمت کی، جو کہ ناکام ثابت ہوئی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟“ لب و لہجے میں معمولی سی سختی در آئی۔
”کون ہیں آپ، چھوڑیں میرا ہاتھ، بابا کہاں ہیں میرے؟“ بس روانی سے ان ہر نی آنکھوں سے پانی بہے جا رہا تھا۔

”ان سب کو چھوڑو، پہلے تو مجھے اپنا چیک اپ کرواؤ، پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا چاہیے۔“ سید ابہتاج عالم کے ایک ہاتھ میں اس کی کلائی تھی، جسے چھڑانے کی وہ جی جان سے کوشش کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کھولا، اس میں سے تھرما میٹر، اسٹیٹھو اسکوپ نکالا، مگر وہ چیک کرنے کہاں دے رہی تھی، بُری طرح روتے ہوئے اپنی کلائی کھینچ رہی تھی۔

”جپ....“ سید ابہتاج عالم نے بُری طرح اُسے ڈانٹا تھا۔
”بالکل پُچ، اب ایک آواز بھی نہیں نکلتی چاہیے، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ انابیہ تو بُری طرح ڈر کر رہ گئی، دل کی دھڑکن سوا ہو گئی، آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہو گئے، شکر فی لب آپس میں یوں جڑ گئے جیسے اب کھلیں گے ہی نہیں۔ سید ابہتاج عالم نے پوری طرح اس کا چیک اپ کر لیا تو 102 بخار تھا۔ سید ابہتاج عالم نے جب اس کے چہرے کی جانب نظر اٹھائی تو اس کی رنگت لٹھے کی طرح سفید ہو گئی تھی، آنکھیں خوف و ہراس سے پھٹی ہوئی تھیں، سانس جیسے اگر نہ لی تو وہ کہیں مر ہی نہ جائے۔ صحیح معنوں میں گڑبڑانے کی باری اب اس کی تھی۔

”ابہتاج! میں نے آج تک اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو ہلکا سا ڈانٹا نہیں ہے، بہت نازوں سے پالا ہے میں نے انابیہ کو۔“ سید ابہتاج عالم کے کانوں میں فاروق خان کا یہ جملہ پورے زور و شور سے گونجا تھا۔

”اوہ گاڈ!“ وہ سب کچھ چھوڑ کے آگے بڑھا تھا۔
”انابیہ! انابیہ!“ اس کا سفید پڑتا زخار تھپتھپایا، مگر دیر ہو گئی تھی، وہ بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھونکی

تھی۔ سید ابہتاج عالم نے جھک کر اس نازک پیکر کو آہستگی سے ہیڈ پر لٹا دیا اور ایک بار پھر اسکو پ سے اس کے دل کی دھڑکنوں کو چیک کرنے لگا جو بہت ست روی سے چل رہی تھیں۔

”انابیہ!“ اس نے انابیہ کے چہرے پر جھک کر نہایت نرمی سے اس کو پکارا تھا۔ سید ابہتاج عالم نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا، جس کی رنگت اب معمول پر آنے لگی تھی۔

”تو سید ابہتاج عالم! اب تم پر یہ وقت بھی آ گیا ہے کہ کسی پری ویش کے ناز و خیرے اٹھاؤ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خود سے کہتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا اور کھڑا ہو گیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا، بی جان نوٹ کر رہی تھیں کہ سید ابہتاج عالم کے معمول زندگی میں کچھ بدلاؤ آ رہا تھا، ان کے فرائض و خدمت میں کوتاہی تو نہیں برت رہا تھا، مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دوسری ذمہ داری بھی ہے، جسے وہ نبھا رہا ہے، اور وہ کیا ہے؟ ایک سوالیہ نشان ان کی بوڑھی آنکھوں کے گرد گھومتا رہتا تھا۔

”اللہ بخش!“

”جی مالکانی! حکم؟“

”یہ ابہتاج کہاں ہے؟“

”جی سائیں محل کے دوسرے حصے میں ہیں۔“

”کیوں....؟“

”جی.... جی.... وہ۔“ لگتا تھا وہ بُرا پھنسا، اب کیا جواب دیتا؟ بی جان کی جہاندیدہ نگاہوں سے اس کا ہکھلانا، گھبرانا چھپانہ رہ سکا۔

”اللہ بخش! میں نے پوچھا تیرا سائیں وہاں کیوں ہے؟ کیا ہو رہا ہے وہاں؟“ وہ سختی سے بولتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

”کچھ.... کچھ بھی تو نہیں۔“ آگے کھائی، پیچھے کنواں والا حساب تھا اس کے ساتھ اس وقت۔
”پہلے تو مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو گیا ہے، تجھے اس طرح گھبراتے دیکھ کر، کچھ تو ہو رہا ہے محل کے اس حصے میں، مجھے جانا ہی پڑے گا، دیکھوں تو صحیح آخر کیا ہو رہا ہے وہاں؟“

”وہ.... مالکانی جی! میری بات سنئے۔“ وہ صحیح معنوں میں گھبرا کے رہ گیا۔
”ہٹ میرے راستے سے۔“ انہوں نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا اور آگے بڑھنے لگیں۔ وہ کچھ بھی نے بغیر محل کے دوسرے حصے کی طرف بڑھیں، یہاں تک کہ اللہ بخش کو اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ جلدی سے فون ہی کر دیتا سید ابہتاج عالم کو، بی جان نے بغیر ناک کیے دروازے کو دھڑ سے کھولا تو سامنے کے منظر نے ان کی پوری طرح آنکھیں کھول کے رکھیں۔ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر حسین تھی کہ دیکھنے والا اس کے حسن کو سراہے بغیر اور اللہ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ بیڈ پر نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی، بیڈ کے پاس سید ابہتاج عالم جس کے ہاتھ میں اورنج جوس تھا، وہ اس کو تھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بی جان کو جانے کیا ہوا، کیوں ان کے دل کو ناگوار گزرا، ان کا بیٹا یہ بھی کر سکتا ہے؟ جس بیٹے پر بہت مان تھا، جوان کا خیر، ان کا غرور تھا، کیا وہ ایسا بھی کرے گا؟ نہ دل مان رہا تھا نہ دماغ اس بات کو تسلیم کر رہا تھا، مگر ان آنکھوں کا کیا کرتا تھا جو یہ سب حقیقت دیکھ رہی تھیں۔ سید ابہتاج عالم نے دروازہ اس طرح کھولے جانے پر پیچھے پلٹ کر دیکھا تو

www.pakisociety.com

”کون ہو تم، چھوڑو مجھے، کہاں لے جا رہے ہو؟ بابا.....! بابا.....!“ وہ ہاتھ پیر چلانے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی تھی، مگر سید ابہتاج عالم جیسے شخص پر کیا اثر ہو سکتا تھا، اسے لا کر اپنی پچاروں میں ڈال دیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو، کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟ دروازہ کھولو، میں کہتی ہوں دروازہ کھولو، بابا کہاں ہیں آپ؟“

”پہلے اس کو خاموش کرواؤ۔“ اللہ بخش نے رومال میں بے ہوش ہونے والی دوا ڈالی اور وہ رومال اس کی ناک پر رکھا، چند ہی لمحے میں وہ غنودگی میں چلی گئی تھی۔ پورے گھر میں بس ایک ملازم ہی تھا، اُسے پیسے دے کر گاؤں بھیج دیا گیا تھا۔

”فاروق صاحب کو رحیم یار دوسری گاڑی میں لے گیا تھا، وہ اس وقت پہلی کاپڑ میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ اللہ بخش نے کہا۔

”او کے، جلدی چلو۔“ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ سب اسلام آباد میں اسپتال میں موجود تھے۔

”اب کیسی طبیعت ہے فاروق صاحب! آپ کی؟“ سید اب்தاج عالم جھک کر ان سے پوچھنے لگا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری! محتاج! میری بیٹی کہاں ہے؟“ فقاہت و کمزوری سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی ان کی۔
 ”فکر مت کریں، وہ صحیح سلامت ہے۔“

”ابہتاج! سرمد اصفہانی بہت شاطر اور چالاک نکلا، اس نے دھوکا دیا ہے مجھے۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں، سب کچھ میرے علم میں ہے، سرمد اصفہانی کی فطرت سے میں بہت پہلے ہی آگاہ ہو چکا تھا، مگر اب جو ہو گیا سو ہو گیا، سرمد اصفہانی کو دوسو کروڑ آپ کو دینے پڑیں گے۔“

”ابتہاج! اس کی نظر میری بیٹی پر ہے، مجھے لگتا ہے میرے پاس بہت کم ٹائم ہے، میری تم سے ایک ریکویسٹ ہے، میری بیٹی کو تم اپنے نکاح میں لے لو، کیونکہ مجھے تمہارے علاوہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں ہے، ایک مضبوط سائباں میری بیٹی کے لیے تم سے بہتر اور کوئی نہیں ہوگا۔“

”فاروق صاحب! ابھی ان باتوں کو چھوڑیں آپ۔“
 ”نہیں ابہتاج! اگر موت بھی آئی تو کم از کم روح پر سکون تو رہے گی۔“ اور پھر ان کی منشاء کے مطابق انابیہ فاروق سے انابیہ ابہتاج بنا دی گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے سب کچھ بی جان کو بتا دیا تھا، کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔
 ”میرے پتر! تُو نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتا دیا؟ میں نے تجھے اتنی باتیں سنا دیں۔“ دکھ و تاسف سے
 ہوں نے کہا، سید ابہتاج عالم اپنی ماں کی معصومیت پر دھیرے سے مسکرا دیا۔
 ”چلیں کوئی بات نہیں، آپ کچھ نہیں جانتی تھیں اور شاید میں بھی آپ سے یہ سب کچھ چھپانا چاہتا تھا۔“
 ”ارے.... وہ کیوں؟“

”کیونکہ یہ رشتہ صرف کاغذی ہے، فاروق صاحب جیسے ہی ٹھیک ہو جائیں گے، سرمد اصفہانی کا کیس ختم ہو جائے گا، وہ اپنا بیہ کو یہاں سے لے جائیں گے۔“

”نی جان!“ اس نے گلاس ٹیبل پر رکھا اور بی جان کی سمت بڑھا تھا۔

”بی جان! اس نے فلاں میں پررہا اور بی جان کی موت پر سنا تھا۔“
 ”مت کہو مجھے بی جان! ابہتاج! مجھے تجھ سے یہ اُمید نہیں تھی، تو ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے؟ کیا کمی رہ گئی تھی میری تربیت میں، کون سی کوتاہی ہوئی ہے میری پرورش میں؟“ بی جان نے اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ بُری طرح جھڑکا تھا۔
 ”بی جان! پلیز، میری بات تو سنئے۔“ وہ تو حواس باختہ ہو کر رہ گیا تھا۔

”نہیں سنوں گی میں تیری کوئی بات، اب یہ نوبت آگئی ہے کہ تو یہ کرنے لگا ہے؟“
 ”لی جان پلیز! وہ تو تڑپ کر رہ گیا اس الزام پر۔“

”نفس قابو میں نہ رہا تو اب یہ کام کرنے لگا ہے تو، جیسی میں سوچوں کہ شادی سے کیوں انکاری ہے، بول اور کچھ رکھی ہیں اس محل میں؟ میں بوڑھی جان، تو نے سوچا ایک کمرے میں پڑی رہوں گی اور تو یہاں عیاشی کرتا پھرے گا، بڑا محل ہے، میں کیا جانو یہاں اور کتنی ہوں گی؟“ وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھیں، سید ابہتاج عالم کو موقع ہی نہیں دے رہی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ اس کی ذات پر تازیانے کی طرح لگ رہا تھا، اس کے وجود کے پرچے اڑ رہا تھا۔

”بی جان! بس بہت ہو گیا، یہ جوڑ کی آپ دیکھ رہی ہیں، یہ کوئی اور نہیں میری منکوحہ ہے، نکاح کیا ہے میں۔ اس سے۔“ وہ مل بھر کے لیے خاموش رہا۔

”بی جان! آج آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں بُری طرح گرا دیا ہے۔“ دکھ و تاسف سے انہیں دیکھتا وہ پھر نہیں، کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ بی جان تو ہونق سی ہو کر رہ گئیں، یہ کیا ہو گیا تھا انہیں، اسے عزیز از جان بیٹے کا دل کتنی بُری طرح دکھایا تھا انہوں نے، بالکل بے یقین کر دیا تھا پل بھر میں، اس کے لب و لہجے سے نکلتے تکلیف دہ الفاظ کمرچیوں میں بکھرتے ان کے دل کے ہزاروں ٹکڑے کرتے چلے گئے تھے، انہوں نے نظر اٹھا کے بیڈ کی سمت دیکھ کر جہاں وہ ہوشربا حسن کی ملکہ انہیں ہی فکر فکر بڑی معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”صاحب کوئی ابہتاج عالم آئے ہیں۔ ملازم نے اندر آ کر دیکھا تو وہ چکرا کے رہ گیا، فاروق خان کی رنگت ہلدی کی مانند زرد پڑ گئی تھی، وہ دل پر پاتھر رکھے بیڈ پر بیٹھتے چلے گئے تھے، وہ اُلٹے قدموں بھاگا تھا اور سیکنڈوں میں ابہتاج عالم اندر داخل ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، فاروق خان کا موبائل اُٹھایا اور ریکارڈ کا بٹن آن کر کے فاروق خان اور سرمد اصفہانی کے مابین ساری گفتگو سن لی تھی، غصے سے اس کا پارہ پوری طرح ہائی ہو گیا تھا، مگر یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش سے کام لینے کا تھا۔

”اللہ بخش!“

”جی سائیں!“ وہ تو حکم کا غلام تھا، بیک جھپکتے حاضر ہوا تھا۔

”جلدی سے فاروق صاحب کو اٹھاؤ، گاڑی میں ڈالو، رحیم یار کو فون کرو، اُسے بولو میرا پہلی کا پڑتیار کرے، ہمیں اسلام آباد کے لیے ابھی روانہ ہونا ہے۔“ یہ بولتا ہوا وہ انا بیہ کے بیڈروم میں داخل ہوا، یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس حالت میں ہوگی، اُسے دس منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکلنا تھا، وہ بیڈر بغیر دوپٹے کے سو رہی تھی، سید ابہتاج عالم نے بلنک تیزی سے کھینچا اور ایک سائیڈ میں پھینکتے ہوئے اس نازک اندام پیکر کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں میں اٹھا لیا۔ انا بیہ اچانک افتاد کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھی، یہ کیا ہوا، اس کے ساتھ؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی، پٹ سے آنکھیں کھولیں تو غم کو کسی کی بانہوں میں پایا تھا۔

سعدیہ عابد

ناولٹ

رج ہر باد تو میرا

”اماں! مجھے نہیں کرنی ہے شادی۔“
”اب بکواس کی ناتو نے بیا تو زبان کھینچ لوں گی۔“
وہ بیٹی کی ایک تکرار سے اشتعال میں آ گئی تھیں۔
”زبان نہ کھینچو اماں سولی پر لڑکا دو مگر اس کالے



کلوٹے امجد سے میری شادی نہ کرو۔“ وہ رونے لگی۔
”تجھے اللہ نے اچھی شکل و صورت کیا دے دی تو
کسی کو اپنے آگے کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے میں صابرہ کو ہاں
کہہ رہی ہوں۔“
”میں مرجاؤں گی اماں! لیکن اس کالے امجد سے
شادی نہیں کروں گی۔“ وہ تن فن کرتی صحن عبور کر گئی
’ہاجرہ بھی اس کے سر پر پہنچ گئیں۔“
”میں کچھ کہہ نہیں رہی ناتو اس کا مطلب یہ نہیں
ہے کہ تو من مانیاں کرنے لگے! امجد بس رنگ و روپ کا
سوہنا نہیں ہے! وگرنہ وہ دل کا بڑا اچھا ہے! ایسا نیک

صفت و شریف لڑکا قسمت والیوں کا ہی نصیب بنتا
ہے۔“
”میں بد قسمت ہی بھلی۔“ اس نے ٹکڑا لگایا تھا ہاجرہ
نے اسے کاندھے پر ایک ہتھوڑا لگایا وہ بلبلانٹھی۔
”پڑھ لکھ کر سب گدھے پر لادتی جا رہی ہے
بولنے سے قبل سوچنا کبھی مت۔“ وہ بھڑکی تھیں وہ
احتجاج بھی نہ کر سکی۔
”دیکھ بیا! امجد اچھا لڑکا ہے میری بچی برسر روزگار
ہے ذمہ داریاں بھی نہیں ہیں! شکل و صورت کوئی چائنا
تھوڑی ہوتی ہے تن سے زیادہ من کا خوبصورت ہونا



ضروری ہوتا ہے بیٹا تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ اکلوتی بیٹی کو روتے دیکھ کر وہ ہلکی پڑ گئیں اور نہایت شفقت سے اسے پکھڑا کرنے لگیں۔

”اماں! تو کیوں نہیں سمجھتی مجھے نہیں کرنی اس سے شادی تو محبت کرتی ہے نا مجھ سے اماں تو میری اس بات کو مان لے وہ مجھے نہیں پسند میں رہ نہیں سکتی اس کے ساتھ۔“ وہ اماں کے ہاتھ تھامے لجاجت سے بولی مگر انہیں اس پل اپنی حسین بیٹی بہت بری لگی۔

”میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ ہاجرہ نے سوچ لیا کہ وہ بیٹی کو کوئی رعایت نہیں دیں گی۔

”آج ہی صابرہ کو فون کر کے کہہ دوں گی کہ وہ شغل لے آئے۔“

”اماں! تو نے ایسا کیا نا تو میں جان دے دوں گی۔“ اس نے اب کے دھمکی لگائی تھی۔

”اور تو نے میری بات نہ مانی تو میں تیرے کہے پر عمل کروں گی۔“ وہ اس کے ہی لہجے میں بولتی اس کی حیرت بڑھا گئیں۔

”اماں! تم اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہو.....؟“ آنسو گرنے لگے۔

”تیری بھلائی چاہتی ہوں اور بس۔“

”کنویں میں ڈھکیل رہی ہو اور کہہ رہی ہو میری بھلائی چاہتی ہو۔ اماں اگر تم نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور میری اس امجد سے شادی کی تو تم سے کبھی بات نہیں کروں گی اور اس کا لے کلوٹے امجد کو بھی سب بتا دوں گی کہ میں اس کو نا پسند کرتی ہوں۔“ وہ ماں کی گھوریوں کو کسی خاطر میں ہی نہ لائی۔

”صرف ظاہری بد صورتی کی وجہ سے تو ہیرے جیسے شخص کو ٹھکرا رہی ہے۔“

”اماں! باطن کس کو دیکھا دیتا ہے اور جب ظاہر ہی اچھا نہ ہوگا تو۔“

”اپنے فلسفے اپنے پاس رکھ۔“ وہ اس کو بری طرح جھڑکشیں کرے سے نکل گئیں بارے ان کی اکلوتی

بیٹی تھی اور وہ دنیا میں بھی نہ آئی تھی کہ اس کا باپ معمولی بخار کا شکار ہو کر دنیا سے چلا گیا ہاجرہ اس وقت محض 23 برس کی تھیں پہاڑی بیوگی انہوں نے بہت حوصلے و ہمت سے گزاری ہاجرہ قبول صورت کی خاتون تھیں جبکہ ولید کافی خوش شکل نوجوان تھا بارے باپ پر ہی گئی تھی حسن و جمال میں یکتا اپنے نام کی طرح اور بچپن سے ہی ہر طرف سے ستائش اور واہ واہ نے اسے کافی خود پسند بنا دیا ہر چیز اسے اعلیٰ و خوبصورت چاہئے ہوتی ہاجرہ پر انہری اسکول میں پڑھاتی تھیں قلیل آمدنی کے باوجود انہوں نے بیٹی کو ہمیشہ ایک سے ایک پہنایا اور کھلایا بڑے ہی ناز و نعم میں اس کی پرورش کی بچپن میں تو اس کی یہ باتیں انہیں اچھی لگتی تھیں مگر وقت کے ساتھ بری لگنے لگیں مگر ان کے روکنے ٹوکنے کا اثر اس پر کبھی نہیں ہوا ویسے وہ ماں کی فرمانبرداری تھی مگر ضد منوا کر ہی رہتی امجد ان کی بڑی بہن صابرہ کا اکلوتا بیٹا تھا صابرہ نے بیٹے کا رشتہ ڈالا اور جیسے ہی اس کو پتہ چلا اس نے واویلا بچا ڈالا جبکہ کم صورتی کے علاوہ اس میں کوئی عیب نہیں تھا مگر اس کی نگاہ میں سب سے بڑا عیب یہی تھا کہ وہ کم رو کم صورت چیزیں پسند نہیں کرتی تھی اس کا کہنا یہی تھا کہ وہ جس سے بھی شادی کرے گی وہ بہت زیادہ خوبصورت ہوگا چاہے غریب ہی کیوں نہ ہو کہ اسے اپنے غریب ہونے کا کوئی ملال نہیں تھا کم پر بھی بخوشی گزارا کر لیتی قناعت پسندی کا وصف ماں سے لیا تھا اور اسے دولت کی چاہ کبھی رہی ہی نہیں کہ وہ تو اسیران حسن میں سے تھی۔

☆.....☆

”کیا تو نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ امجد کم صورت ہے.....؟“ اس کی اکلوتی سہیلی جو اس کے ساتھ والے گھر میں ہی رہتی تھی سنتے ہی حیرانگی سے بولی تھی۔

”ہاں تو تو جانتی ہے میں بڑے سے بڑا سیکری فائر

اور کپرو مائز کر سکتی ہوں مگر اس معاملے میں نہیں۔“ وہ دونوں چھت پر رکھی چار پائی پر بیٹھی تھیں۔

”تو پاگل ہو گئی ہے بیا جیون ساتھی میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ امجد میں بدرجہ اتم موجود ہیں تو ایک ایسی خانی کو کیوں دیکھ رہی ہے جس میں اس کا کوئی ہاتھ ہی نہیں ہے تو خوبصورت ہے تو اس میں تیرا کیا کمال.....؟“

”میں نے اپنی خوبصورتی پر کبھی ناز نہیں کیا ہاں شکر ضرور ادا کرتی ہوں خوبصورتی میرا فخر نہیں میری چوائس ہے میں ضرورت کی ہر چیز خوبصورتی کو مد نظر رکھ کر لیتی ہوں تو شوہر میں بد صورت کیسے منتخب کر لوں.....؟“ وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔

”رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔“

”فیصلے تو زمین پر ہی ہوتے ہیں نا اور کوئی لڑکی ڈاکٹر یا فوجی سے شادی کرنا چاہے تو ٹھیک میں کسی خوبصورت بندے سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو غلط میں ہر طرح کا کپرو مائز کرنے کے لیے تیار ہوں بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ اس کا ظاہر و باطن خوبصورت ہو وہ خوبصورت شکل و صورت اور خوبصورت کردار کا حامل ہو امجد میں دوسری خوبی ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گی اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنے کا مجھے حق حاصل نہیں ہے میں نے ایسی کوئی نا جائز بات کر دی ہے امجد میرا کزن ہے میں نے کبھی اس کو خود سے کمتر و حقیر نہیں سمجھا خوبصورتی پسند ہے مجھے غرور میں مبتلا نہیں ہوں میں امجد کزن ہے کزن ہی رہے میں اس کو شوہر نہیں بنانے والی کہ میں جب بھی شادی کروں گی تو یہ دیکھ کر کہ میرا ہونے والا شوہر خوبصورت ہے یا نہیں کہ میں کم صورت بندے سے کسی طور پر شادی نہیں کروں گی۔“ اماں کے بعد پھوپھی سکی نہ کی بیٹی اسے سمجھانے آ گئی تھی اس لئے وہ اس سب سے بہت چڑی ہوئی تھی اس لئے اس نے ساری بھڑاس دوست کے سامنے نکالی تھی۔

”تو غرور نہیں کرتی اس کا اندازہ ہے مجھے مگر تو جس طرح کی اس معاملے میں شدت دکھاتی ہے اس سے غرور کی بوہی آتی ہے امجد کی تو ہزار خوبیاں صرف ایک خانی کی وجہ سے نظر انداز کر رہی ہے تجھے اندازہ نہیں ہے مگر تو غلط کر رہی ہے مارکیٹ کا سب سے خوبصورت سوٹ اور بیگ لینا آسان بھی ہے اور تیرے اختیار میں بھی مگر یہ معاملہ تیرے اختیار سے باہر ہے کہ شادی تیری وہیں ہوگی جہاں اللہ کی مرضی ہوگی اور تیرا بلا وجہ کا انکار اللہ کو ناراض کر سکتا ہے۔“

”بلا وجہ کا انکار.....؟“ وہ اس کی اس بات پر اٹک گئی۔

”میری پسند نا پسند بلا وجہ کا انکار کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ دوست کو گھور رہی تھی۔

”او کے جودل میں آئے کرو۔“ وہ لا حاصل بحث سے اکتا گئی تھی۔

”تم سب لوگ آخر امجد کو سمجھ کیا رہے ہو.....؟ وہ اس دنیا کا آخری مرد ہے کہ اس سے شادی نہ ہوئی تو میں کنواری ہی مرجاؤں گی یہ تو پہلا رشتہ ہے آگے جو رشتہ آئے وہ میری پسند کے مطابق بھی تو ہو سکتا ہے مگر تم سب لوگ امجد کو اول و آخر سمجھ بیٹھے ہو۔“ وہ کہاں اپنے ذہن و دل کی بات اس سے کہے بغیر چین پا سکتی تھی اس کے بات ختم کر دینے کے اشارے کو کسی خاطر میں ہی نہ لائی۔

”تو اپنی جگہ صحیح ہے تیری پسند نا پسند کو بھی کوئی غلط نہیں کہہ رہا مگر تیرا موقف کچھ زیادہ ہی سختی لئے ہوئے ہے اور یہ غلط ہے اور جب امجد اس ایک کی کے علاوہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے تو کیوں نا خالہ اماں تمہاری شادی اس سے کرنا چاہیں گی اور ویسے بھی رشتے تو آسکتے ہیں اور آئیں گے بھی انشاء اللہ لیکن کہتے ہیں لڑکی کا پہلا رشتہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور تم اللہ کی ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہو کہیں نہ کہیں تم نے چلک رکھی اس لئے اللہ نے کبھی تمہاری پکڑ نہیں کی ورنہ اللہ

کی بنائی ہوئی چیزوں کی تم بے عزتی کر جاتی ہو تم صورت کہہ کر انہیں نظر انداز کر کے مگر اس بار تم کسی کا دل توڑ رہی ہو! امجد تم سے محبت کرتا ہے اور تم اس کی ہزار خوبیوں.....

”خوبیاں خوبیاں اب امجد ایسی بھی خوبیوں کا مرقع نہیں ہے اب تم نے اس کی خوبیاں گنوائیں تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ وہ غصہ سے کھول رہی تھی کہ ہر کوئی اسے امجد کی خوبیاں گنوانے بیٹھ جاتا ہے وہ نہایت بدتمیزی سے کہتی سیڑھیاں اتر گئی۔

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم نے مجھ سے شادی نہیں کرنی ہے۔“ اس کو ایک فیصد بھی یہ امید نہ تھی کہ وہ یہ بات ڈائریکٹ اس سے کر لے گا اور اس کے خوبصورت لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ شرمندہ ہو گئی تھی اپنا آپ اس کا مجرم لگنے لگا اور اسے غور سے دیکھا تو وہ کافی پرکشش لگا اور وہ اسے کالا کلونا کہہ رہی تھی جبکہ درحقیقت وہ گندی رنگت اور کھڑے نقوش کا کافی قبول و خوش شکل تھا مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو اس کے بارے میں سوچ ہی نہیں پایا ماں کی ناراضی پر سوچنا چاہا تو ذہن و دل میں سناٹے ہی گونجتے رہے۔

”وہ میں..... امجد۔“ وہ نگاہ جھکا کر لب کچلنے لگی اور وہ اس حسن کے پیکر دشمن جاں کو دیکھنے لگا۔

”میں دعا کروں گا اللہ سے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر دعا ہر خواہش پوری کرے میں نے بارے تم سے بے انتہا بے تحاشہ محبت کی ہے اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہوں گا چاہے خوشیاں مجھ سے روٹھ جائیں تمہیں میں اپنے قابل نہیں لگتا دعا ہے میری کہ تمہیں تمہارے قابل تمہارے معیار کے مطابق شخص کا ساتھ نصیب ہو ہر پرانے یکطرفہ تعلق کو الوداع کہتا تم سے رخصت چاہوں گا جہاں رہو خوش رہو۔“ وہ اس کے تکیے میں نقش سے مزین چہرے کو نگاہوں میں جذب

کرتا وہاں ٹھہرا نہیں اور وہیں نہیں وہ شہر ہی نہیں ملک ہی چھوڑ گیا کہ اس دشمن جاں کو سامنے دیکھ کر بھلانا پاتا اور اسے اپنی نگاہ کے سامنے کسی اور کا ہوتے بھی دیکھ پانا کٹھن ہوتا اس لئے اس نے اپنے راستے ہی جدا کر لئے یہ اور بات کہ الوداع کہہ دینے سے رخصت لے لینے کے باوجود اس کی زندگی اسی کی یادوں سے مہکی ہوئی تھی کہ بچولانے کی چاہ میں اسے شدت سے یاد رکھے ہوئے تھا۔

”شمینہ آئی! وہ پھپھو۔“ امجد کی بہن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ساتھ ہی بولتی بھی جا رہی تھی کہ اس نوجوان کو دیکھ کر وہ ٹھک کر چپ کر گئی نگاہ اسی پر جمی تھی کہ وہ دیو مالائی حسن کا مالک بالکل اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا تھا شہابی رنگت کھڑے نقوش بڑی بڑی گہری آنکھیں بھرے بھرے عنابی لب کسرتی جسم وہ اگر اس کو یک ٹک دیکھ رہی تھی تو وہاں بھی بے خودی کا کچھ پونہی عالم تھا گلابی چہرے کی اسماں بارے کو بے خود کر گئی تھی شمینہ نے دونوں کی ہی ہنسی نگاہیں دیکھیں تو وہ کھنکھاری تو وہ دونوں ہی جھل ہو گئے۔

”بارے! یہ میرے جیٹھ احسان فاروقی ہیں اور احسان بھائی یہ میری اکلونی ماموں زاد بارے جمال ہے۔“ اس نے ان دونوں کا تعارف کروایا تھا۔

”ناکس ٹومیٹ یوس بارے۔“ اس کی طرح اس کا لہجہ بھی انتہائی خوبصورت تھا اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا اور اس کی مسکراہٹ بلاشبہ اتنی حسین تو تھی کہ وہ بری طرح چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا جو شمینہ کو صابرہ کا پیغام دے رہی تھی اور وہ اس کے نازک لبوں کی جنبش دل تھام کر دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلی گئی اس کی کھوئی کھوئی کیفیت شمینہ نے محسوس تو کی مگر بولی کچھ نہیں کہ اسی وقت احسان کی بیوی جو واش روم میں تھی وہ آگئی شمینہ کا رخصت سے ہوئے

نکاح کو دو سال ہو گئے تھے رحمان آؤٹ آف کنٹری تھا اس لئے اس کے آتے ہی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو گئیں رحمن دو ہی بھائی تھے احسان بڑا تھا اور اس نے نمرہ سے محبت کی شادی کی تھی شمینہ خالصتاً رحمن کی والدہ رقیہ کی پسند تھی رحمن نے نکاح سے قبل اسے نہیں دیکھا تھا مگر نکاح کی شام دیکھا تو اسے سادہ سی شمینہ اچھی لگی اور وہ اکثر اس کو فون کر لیتا رقیہ بیمار تھیں اس لئے رخصتی کی تاریخ رحمن کے بڑے بھائی بھانوج لینے آئے تھے اور اسی لئے ہاجرہ اور بارے ان کے گھر آئی ہوئی تھیں عین نکاح کے دن وہ بیمار ہو گئی تھی وہ شریک نہیں ہوئی تھی اس لئے رحمن اور اس کی بیوی سے پہلی دفعہ ملی اور جہاں احسان کو دیکھ کر دل کی دنیا زیر و زبر ہوئی تھی کچھ ہی دیر میں اس کی بیوی کو دیکھ کر بے یقینی سے وہ چکرا اٹھی تھی کہ یہ تو گمان میں ہی کہیں نہ تھا کہ خوابوں کا شہزادہ مگر آئے گا بھی تو غیر ہو جانے کے بعد وہ اداس ایسی ہوئی کہ بعد میں بھی یہ اداسی زائل نہ ہو سکی امجد جو واپس نہیں آنا چاہتا تھا بہن کا مان ماں کا فرمان رکھنے کو رخصتی سے دو دن قبل آ گیا وہ صبح 5 بجے آیا تھا اور شام میں مایوں مہندی کی رسم جس میں اسے ایک سال بعد دیکھا تو دل کی وہی تان نگاہ میں وہی بے تابی تھی اور وہ اسے چونکا گئی تھی کہ نک سک سے تیار رہنے والی بارے مہندی کی محفل میں بھی سادگی کی تصویر بنی ہوئی تھا کا ہی مہندی رنگ کے سوٹ میں آنکھوں میں کاجل اور لبوں پر گلابی لپ اسٹک لگائے وہ اسے کافی سگوار لگی۔

”بیا! تم ٹھیک تو ہو کیا بیمار رہی ہو.....؟“ اس کے لب و لہجے میں اس کے لئے بے پناہ فکر چھپی تھی۔

”ہاں نہیں..... تمہاری بددعا لگ گئی تھی مجھے۔“ وہ بری طرح چونکی اور آزر دگی سے بولی اور وہ اک نئے الزام پر تڑپ ہی تو گیا۔

”میں تمہیں بددعا دوں گا جو جب اللہ کے آگے دست سوال بلند کرتا ہے تو پہلے تمہارے لئے تمہاری

خوشیوں کے لئے دعا کرتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں بددعا دی ہے میں نے تو کبھی تمہارا برا چاہ ہی نہیں۔“ وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا اور اس کی آنکھیں جھلکانے لگیں۔

”مجھے تمہاری آہ لگ گئی ہے میری بد نصیبی تو دیکھو امجد کہ جس شخص کو خوابوں و خیالوں میں سوچا وہ جب مجسم میرے سامنے آیا تو میرا تھا ہی نہیں وہ جب میرا نہ تھا تو کیوں میں نے اس کی شبیہ خیالوں میں بسائی.....؟ جس خواب کی کوئی تعبیر نہ تھی وہ خواب میری پلکوں کی زینت کیوں بنا جس شخص کو دیکھ کر سارے خواب حقیقت میں بدلنے لگے تھے وہ تو میرے لئے تھا ہی نہیں وہ جب مجھے ملا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔“ وہ حیرانی و دکھ سے اس کو نر رہا تھا جس کی آنکھیں روانی سے بہہ رہی تھیں اور لہجے میں ایسی تھکن اور بے چارگی تھی کہ اس کے وجود میں اداسیاں گھل گئیں اور وہ آنکھوں میں تاسف لئے اسے خود سے لمحہ بہ لمحہ دور جاتے دیکھتا رہا۔

”اماں! احسان میں برائی کیا ہے.....؟“

”برائی..... اچھائی کیا ہے اس میں ایک شادی شدہ مرد جس کی بیوی بھی موجود ہے تم اس سے شادی کے لئے بے قرار ہو رہی ہو محض اس لئے کہ وہ خوبو ہے زندگی کی تلخیاں خدا نہ کرے سہی پڑ گئیں تو اچھی شکل و صورت کام نہ آئے گی وہ ایک دل پھینک شخص ہے ایک بیوی کو چھوڑ چکا ہے دوسری کی موجودگی میں تیسری کرنے کو تیار ہے۔ تیری تو مت ہی ماری گئی ہے مگر میں تجھے یہ بے عقلی نہیں کرنے دوں گی کسی قیمت پر تیری شادی احسان سے نہیں کروں گی اس موئے شادی شدہ احسان سے تو امجد لاکھ گنا بہتر۔“

”امجد! امجد سارا فساد پھیلا ہوا ہی اس امجد کا ہے جب مجھے اس سے شادی ہی نہیں کرنی تو بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہو اماں اور جب مجھے احسان سے

شادی سے انکار نہیں ہے تو تم کیوں نہیں مان جاتیں؟
مگر تم مانو گی تو جب اماں جب امجد کی اچھائی کا بھوت
تمہارے سر سے اترے گا وہ اتنا بھی اچھا نہیں ہے
جتنا لگتا ہے اور نہ ہی احسان اتنے برے ہیں تم میری
ان سے شادی نہ کر سکو اماں میں اگر شادی کروں گی
تو صرف احسان سے وگرنہ نہیں کہ مجھے ان کی دوسری
تیسری شادی سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمہیں بھی نہیں
پڑنا چاہئے کہ زندگی میں نے گزاری ہے تم نے
نہیں۔ وہ بدتمیزی و بد لحاظی کی انتہا کرتی وہاں رکی نہ
تھی اور ماں کے کمرے کے باہر کھڑے امجد سے
ٹکراتے ٹکراتے بچی وہ اسے زہر خندنگا ہوں سے
گھورتی وہاں سے چلی گئی وہ واپسی کا سوچ رہا تھا کہ
جو کچھ سنا تھا وہ اس کے دکھ کو بڑھانے کے ساتھ بارے
کی بدتمیزی پر وہ اندر تک کھول گیا تھا مگر وہ کچھ سوچ
کر خالہ کے کمرے میں داخل ہو گیا کہ اسے لگا تھا کہ
جتنی بدتمیزی بارے نے ماں سے کی ہے ان کو سہارے
کی ضرورت ہوگی کہ وہ جب اتنی تکلیف محسوس کر رہا
ہے تو وہ کس تکلیف سے گزر رہی ہوں گی اور اس کا
وہیں سے نہ پلٹنے کا فائدہ ہی ہوا کہ اس نے چکرا کر
گرتی خالہ کو تھام لیا تھا اور انہیں لئے ہاسپٹل دوڑا تھا
بیٹی کی حد درجے ضد اور بدتمیزی نے ان کے دل پر گہرا
زخم لگایا تھا اور وہ جو اپنی ہر بدتمیزی و غلطی سے بے حس
و ضد میں انجان بنی ہوئی تھی ماں کو آئی سی یو میں دیکھ کر
ٹپ اٹھی اور رہی سہی کسر امجد نے پوری کر دی۔
”اب کیوں رو رہی ہو.....؟ تمہیں تو خوش ہونا
چاہئے کہ آج خالہ ان حالوں پر صرف تمہاری وجہ سے
پہنچ گئی ہیں خالہ کی اس حالت کی صرف اور صرف تم
ذمہ دار ہو تم نے اپنی منہ زور خواہشات اور بے جا ضد
کے لئے اپنی ماں کی ہر قربانی فراموش کر دی تمہیں
احساس نہیں ہے کہ تم خالہ سے کس قدر بدتمیزی کر چکی
ہو اپنی اس ماں سے جس نے تمہاری پرورش تمہارے
اچھے حال و مستقبل کے لئے اپنی خوشیاں تباہ کر دیں“

محض 23 برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں دوسری شادی
کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے نہیں کی تم کو ناز و نعم میں
پالا اور تم نے اس کا یہ صلہ دیا ایک غیر شخص کے لئے
اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اپنی عظیم ماں کی تذلیل
کی انہیں دکھ پہنچایا۔ امجد کو اس پر اتنا غصہ تو جب بھی
نہ آیا تھا جب اس نے شادی سے انکار کیا تھا اس کی
قبول صورت کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا کہ وہ انکار و اقرار
کا اس کو حق دیتے ہوئے خود کو کیسے بھی کنٹرول کر گیا تھا
مگر ہاجرہ اسے اپنی ماں کی طرح ہی عزیز تھی بارے کی
بدتمیزی اس کا رویہ اسے سخت برا لگا تھا اس لئے اس کو
بری طرح روتے بلکتے ماں کے لئے پریشان ہوتے
دعائیں کرتے دیکھ کر وہ اس کو اس کے برے رویے کا
احساس دلانے پر مجبور ہو گیا کہ مائیں اس لئے تو نہیں
ہوتیں کہ جب دل چاہا تو ان کی بات مان لی عزت
کر لی اور جب موڈ نہ ہوا تو بے عزتی کر دی ضدیں
پوری کروانے کو جو منہ میں آیا کہہ دیا اور ضد پوری ہو گئی
تو خوش ہو گئے۔

”ایسے مت کہو امجد! میں اماں سے بہت محبت کرتی
ہوں ان کو کچھ ہو گیا تو میں جی نہیں پاؤں گی ایک اماں
ہی تو میرا سب کچھ ہیں۔ وہ سکتے ہوئے بولی تھی۔
”کاش تم محبت کی طرح خالہ کی عزت بھی کرتیں
تمہیں صرف اپنی نہیں خالہ کی بھی پرواہ ہوتی۔ وہ
نہایت سخی سے بولا تھا اور ڈاکٹر کو آئی سی یو سے نکل کر
ان کی طرف ہی بڑھتے دیکھ کر وہ اس کو کچھ کہنے کا ارادہ
ترک کرتی آنسو گڑتی جلدی سے لپک کر ڈاکٹر تک خود
ہی چلی آئی اور ہاجرہ کے ہوش میں آ جانے کی خبر سن کر
اس کی آنکھیں تشکر سے بننے لگیں کہ ہاجرہ ہی تو اس کا
سب کچھ تھیں اپنی غلطیوں کو تباہیوں کا آج سے قبل
احساس تک نہ تھا مگر ماں کو کھونے کا احساس ہوا تو
ساری منہ زور خواہشات ضدیں کہیں دور جا سوئیں
کہ وہ مجموعی طور پر بری نہیں تھی ہاجرہ اس کی ہر جائز و
نا جائز مان لیتی تھیں اس لئے اس کو کبھی احساس ہی نہ

ہوا کہ وہ کہاں غلط تھی مگر اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا
تھا اور وہ اپنی ماں کی خوشی کے لئے ایک احسان کی محبت
تو کیا ہزار محبتیں قربان کر سکتی تھی۔

”مجھے معاف کرو اماں! میں نے تمہارا دل دکھایا
ہے میں تم سے اپنے ہر برے رویے کی معافی مانگتی ہوں
شرمندہ ہوں تم سے مجھے معاف کر دو۔ وہ دو دن قبل ہی
ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو گئی تھیں وہ چاہ کر بھی ماں سے
اپنے رویے کی تلافی نہیں کر سکی تھی مگر آج سوپ پلاتے
ہوئے بے اختیار ہو گئی۔

”ارے باگل! میں تجھ سے نہ ناراض ہوں نہ تجھے
غلط سمجھتی ہوں غلطی میری ہی ہے کہ تیرے بار بار انکار
پر بھی میں نے امجد کا نام تیرے سامنے لیا تو احسان
سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں تیری شادی
احسان.....“

”نہیں اماں! میں احسان سے نہیں صرف اس شخص
سے شادی کروں گی جس سے تم چاہو گی بس مجھے میری
ہر بدتمیزی و خطا کے لئے معاف کر دینا کہ تمہارا دل
دکھانا تو نہیں چاہتی تھی مگر میں نے ایسا کیا تم سے
بدتمیزی کی۔ آنسو تیزی سے گر رہے تھے۔

”ارے پگلی روتی کیوں ہے جو ہوا وہ بھول جا اور
مجھے صرف تیری خوشی عزیز ہے اگر تجھے لگتا ہے کہ تو
احسان کے ساتھ خوش رہے گی تو میں دعا کروں گی کہ
تیری ہر خواہش تیری ہر آرزو پوری ہو۔ انہوں نے
اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکا تھا اور وہ ملنے لگی تھی۔

”اماں! مجھے معاف کر دینا تمہیں تکلیف دینا
نہیں چاہتی تھی مگر بس نہ جانے کیسے وہ سب تم سے کہہ
گئی احسان تمہیں نہیں پسند ناں اب کبھی وہ نام لب پر
بھی نہ لاؤں گی کہ تجھے تکلیف دے کر میں خوشی حاصل
کر ہی نہیں سکتی۔“

”بات پسند اور نا پسند کی نہیں ہے بیا! وہ پہلے سے
شادی شدہ ہے صرف اس لئے میں تعامل کا شکار ہوں

کہ تجھے جانتی ہوں تو سوکن کا دکھ برداشت نہیں
کر سکے گی کہ جس نے کسی بھی رشتے میں شراکت کا
دکھ نہ سہا ہو وہ ایک ایسے رشتے کو آدھے حق کے ساتھ
قبول نہیں کر سکتی کہ شوہر کا پیار اس کے حق بائنے کا
عورت تصور بھی نہیں کر سکتی میں تجھے سوچنے سمجھنے کے
لئے وقت دے رہی ہوں آگے تیرا نصیب۔ وہ
بوجھل لہجے میں کہتیں بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بات
سمیٹ گئیں کہ انہوں نے پہاڑ جیسی زندگی تنہا بیٹی
کے سہارے گزاری اس کی معمولی سی تکلیف بھی ان
سے برداشت نہیں ہوتی تھی اس لئے تو وہ چاہتی تھیں
کہ اس کی شادی امجد سے ہو جائے کہ وہ ہر لحاظ سے
انہیں بیٹی کے قابل لگتا تھا مگر وہ کہتے ہیں نا کہ دل
آئے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے وہ امجد کی سانولی
رنگت برداشت نہیں کر سکی اور احسان کی شادی اور
بیوی کو بھی برداشت کرنے کو تیار ہو گئی تھی یہ اس کی کم
عقلی و بے وقوفی تھی یا محبت.....؟

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی.....؟“ شمیمہ کی بتائی
ہوئی بات پر کچھ ٹانینے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا تھا یہ چند
لفظ بھی بمشکل زبان سے ادا ہوئے تھے۔

”یہی سچ ہے امجد! احسان بھائی بیا سے محض اس
لئے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ بھابی ماں نہیں بن سکتیں
اور انہیں وارث چاہئے وہ شادی کا کافی عرصے سے
سوچ رہے تھے مگر بھابی نہیں مان رہی تھیں مگر جب
احسان بھائی نے بیا کو دیکھا تو جیسے سارے فیصلے ہو گئے
بھابی تو راضی اب بھی نہیں ہیں مگر احسان بھائی کے
چھوڑ دینے کی دھمکی انہیں خاموش کر گئی ہے احسان
بھائی نے بیاہ کو محض اس کی خوبصورتی کی وجہ سے منتخب
کیا ہے کہ وہ کافی حسن پرست ہیں اور ان کی تمام
محرومیوں کو دور کرنے کو بیا جیسے راضی ہے لیکن میں
جانتی ہوں کہ بیا ان کے ساتھ خوش نہیں رہ پائے گی کہ
ایک تو وہ اسے صرف اپنے مفاد کے لئے اپنا رہے ہیں

دوسری یہ کہ وہ کافی بھنورا صفت کے حامل ہیں اور بیا کافی سیدھی سادھی بے وقوف سی لڑکی ہے جیسی تو انہوں نے اسے اتنی آسانی سے ٹریپ کر لیا ہے۔ وہ کافی تفصیل سے بولی تھی۔

”یہ سب مجھے بتانے کا مقصد.....؟“ وہ خود کو کمپوز کرتا بے رخی سے بولا تھا کہ بارعہ سے دوستانہ تعلقات تو پہلے بھی نہ تھے اب تو دونوں کے درمیان لافعلی و سرد مہری سی در آئی تھی۔

”اور یہ سب آپ اب کیوں بتا رہی ہیں جب شادی میں مشکل سے تین دن بھی باقی نہیں ہیں۔“

”اس سب سے میں لاعلم تھی رات میں نے بھابی اور احسان بھائی کی باتیں سنیں تو میں آج یہ سب تم سے ڈسکس کرنے آ گئی کہ مجھے لگتا ہے کہ تم بارعہ کی زندگی خراب ہونے سے بچا سکتے ہو۔ نرمی سے کہہ کر انہوں نے یکدم ہی بہت بڑی بات کہہ دی۔

”آپی.....“

”جانتی ہوں یہ مشکل ہے مگر تم نے بیا سے محبت کی ہے اور اسی محبت کے لئے اپنا طرف اور دل بڑا کر کے اسے اپنا لو کہ اسے کھو کر تم بھی خوش نہیں رہو گے مگر وہ ناخوش ہوئی تو تمہارے اندر سے خوشی کا ہر ایک احساس مٹ جائے گا تم صرف اپنی محبت اور خالہ کے لئے اس سب کے لئے راضی ہو جاؤ۔ وہ بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے امید سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں میں اپنا طرف بڑا کر بھی لوں تو کیا حاصل.....؟ بیا اس سب کے لئے راضی نہیں ہوگی۔“

”تم بیا کی فکر مت کرو میں اماں اور خالہ سے بات کر چکی ہوں اور ان دونوں کے ہی فیور کی روشنی میں تم سے بات کر رہی ہوں خالہ کہہ رہی تھیں کہ بیاہ واویلا ضرور کرے گی مگر پھر نارمل ہو جائے گی جب اسے احسان کی اصلیت پتہ چلے گی تم شادی کے لئے راضی ہو جاؤ تو خالہ بیا کو خود ہی راضی کر لیں گی۔ وہ تو

احسان سے بارعہ کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں اس کی اصلیت جان کر تو دل مزید خراب ہو گیا اور انہوں نے خود ہی بہن سے کہہ دیا کہ وہ بارعہ کو اپنی بہو بنائے صابرہ کی تو یہ دلی خواہش تھی کہ بیٹی کی خوشی سے وہ لاعلم نہ تھیں اور انہوں نے خود حامی بھر کر امجد سے بات کرنے کے لئے شمیمہ کو بھیج دیا کہ دونوں بہن بھائیوں میں کافی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

”آپ سب لوگ یہی چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تو جیسے کھل ہی اٹھی کہ اس نے بھی ہمیشہ بارعہ کو اپنی بھابی کے روپ میں ہی دیکھا تھا۔

”میں امی کو جا کر انہیں تمہارے راضی ہو جانے کا بتاتی ہوں۔ وہ چھوٹے بھائی کا پیار سے گال تھپتھپاتی روم سے نکل گئی تھی ہاجرہ تک امجد کا اقرار پہنچا تو بیا سے بات کرنے پہنچ گئیں۔

”اماں! جب میں تمہاری خوشی میں راضی ہو رہی تھی تو تم نے میری خوشی مان لینے پر زور دیا تو اب ان سب باتوں کا کیا مطلب.....؟“ وہ ساری تفصیل جان کر عام سے لہجے میں بولی تھی۔

”وہ تجھے دھوکا دے رہا ہے بیا! اسے تجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے وہ بس اولاد کے لئے۔“

”اماں! احسان نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا میں یہ سب پہلے سے جانتی ہوں پر پوزل دینے سے قبل ہی انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا کہ ان کی بیوی ماں نہیں بن سکتی اور اس لئے وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے انہوں نے پہلی نگاہ کی محبت کی ہے وہ مجھے کھونا نہیں چاہیں گے صرف اس لئے ہر بات کھل کر بتائی کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دینا چاہتے تھے وہ مجھے انگ گھر میں رکھیں گے میرا ہر حق ادا کریں گے اور وہ جب مجھ سے محبت کرتے ہیں مجھے حق دینے کو تیار ہیں مجھے ساری سچائی کھل کر بتادی میں بھی ان سے محبت کرتی ہوں ان کو ہر خامی و خوبی کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہوں تو ان سب تکلیف دہ باتوں کا کوئی مطلب نہیں

لگتا اور شمیمہ آپی انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سسرال کی باتیں ادھر ادھر کریں اس گھر کے عیب ڈھکنا اب ان کا فرض بھی ہے اور مجبوری بھی مگر وہ تو ہر بات طشت از بام کر گئی ہیں انہیں شرم.....“

”فضول بکو اس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور احسان مجھے نہ کل پسند تھا اور نہ آج ہے صرف تیرے خیال سے میں مجبوراً چپ کر گئی تھی مگر یہ بات میری برداشت سے باہر ہے میں احسان پر بھروسہ کر ہی نہیں سکتی ہوں ایک بیوی چھوڑ چکا ہے دوسری کو چھوڑنے کی دھمکی دے کر تیسری شادی کر رہا ہے اس طرح تمہیں بھی چھوڑ سکتا ہے کہ ویسے بھی تم سے تو اپنے مفاد کے لئے شادی کر رہا ہے مفاد پورا کر کے بھی چھوڑ سکتا ہے اور تم اس کی خواہش و امیدوں پر کھری نہ اتریں تو بھی جبکہ اولاد تو قسمت سے ہوتی ہے میں اپنی اولاد کو جانتے بوجھتے کنویں میں نہیں دھکیل سکتی۔“

”اماں! احسان ایسے نہیں ہیں جیسا آپ.....“

”وہ کیسا ہے؟ کیسا نہیں اب مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ تمہاری اس سے شادی نہیں ہوگی۔ اس کے چہرے پر سائے لرزاں ہو گئے۔

”اماں.....“

”یہ میرا آرنی فیصلہ ہے میں احسان کے گھر فون کر کے انکار کر رہی ہوں صابرہ سے میں نے بات کر لی ہے کل تیرا نکاح احسان کی بجائے امجد سے ہو جائے گا اور تو نے انکار کرنے یا واویلا کرنے کی کوشش کی یا من مانی کرنے کا سوچا تو ماں کا مرا منہ دیکھے گی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھیں اور اس کو آندھیوں کی زد پر چھوڑ کر وہاں سے نکل گئیں۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی امجد! یہ تمہاری اچھائی کا ہی بھوت ہے جو اماں پر ہمیشہ سوار رہا لیکن میں نے بھی تمہاری زندگی عذاب نہ بنا دی تو میرا بھی نام بارعہ ولید نہیں۔“ رورو کر تھک گئی ماں کو

کسی طور پر راضی نہ کر سکی تو خالہ سے بات کی مگر وہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی شمیمہ تو الٹا اسے سمجھانے لگی اس نے امجد سے رابطہ کرنا چاہا تو اس نے اس کی کال ہی ریسو نہیں کی اور وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچتی ماں کے فیصلے پر نہ چاہتے ہوئے بھی سر جھکا گئی مگر امجد کے لئے موجود ناپسندیدگی نفرت کے قالب میں ڈھل گئی اور اسی جذبے کو دل میں جگہ دیتے ہوئے اس نے نکاح نامے پر سائن کئے تھے اور دو آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے تھے کہ محبت پانے کے مقام پر پہنچی تھی تکلیف تو ہونا ہی تھی اور زخم تازہ تھا تو تکلیف بھی اسی مناسبت سے تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم نے کیا سمجھا تھا کہ میں تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں گی ایسا سوچنا بھی مت کہ میں کبھی تمہارا انتظار کروں گی تمہیں اور تم سے زبردستی جوڑے جانے والے رشتے کو رتی برابر بھی کبھی اہمیت دوں گی کچھ سمجھوں گی۔ وہ زیور اتار کر سادے سے کاٹن کے سوٹ میں واش روم سے نکلی تھی اور اس کی بے یقین نگاہیں خود پر محسوس کر کے انتہائی زہر خند لہجے میں بولی تھی امجد ایک سادہ سا بندہ تھا رشتوں کو اہمیت دینے والا اور رشتوں کے احترام میں محبت کے پاس میں اس نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ اس کی ہونے والی بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے اس نے طرف تو بڑا کر لیا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کم ظرف ثابت ہونے والی تھی اور اس کے صبر اور ضبط کو آزمانے والی تھی اس نے سختی سے لب بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا اس کی خاموشی اس کو شیر بنا گئی۔

”نفرت کرتی ہوں میں تم سے امجد صابر! شدید نفرت صرف تمہاری وجہ سے آج میں یہاں ہوں صرف تمہاری وجہ سے میں احسان کی نہیں بن سکی تم جانتے تھے کہ میں تم سے نہیں احسان سے محبت کرتی ہوں اس کے باوجود بھی تم نے مجھ سے شادی کی مر

رداؤ انجسٹ 63 ستمبر 2012ء

رہے تھے نا مجھ سے شادی کے لئے تو اب بھگتو اگر میں خوش نہیں ہوں تو تم کو بھی چین سے خوش نہیں ہونے دوں گی نہ ہی اس رشتے کو میں کچھ سمجھوں گی کہ اماں اگر مجھے اپنی جان کی دھمکی نہ دیتیں تو میں بھلے احسان کی نہ ہوتی مگر تم سے بھی کبھی شادی نہ کرتی تمہاری شکل تک سے نفرت ہے مجھے اماں پر تم نے اپنی نام نہاد اچھائی کا جادو کر کے ان کو اپنا اسیر کر لیا تھا میں اب دیکھوں گی کہ تم اپنی اچھائی کب تک قائم رکھ سکتے ہو۔ وہ آنکھوں میں غصہ و نفخہ لے لے اس پر گرج رہی تھی اس کی سانولی رنگت اتنی تذلیل پر دہک اٹھی تھی ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں لب اور مٹھیاں اس نے سختی سے بھینچ لی تھیں مگر جب بولا تو بے حد سرد لہجے میں کہ اس کا سرد لہجہ اس کے وجود میں کچی دوڑا گیا۔

”ہاں مروتو رہا تھا میں تم سے شادی کے لئے اور کیوں نہ مروتا تم ایک حسین و جمیل عورت اور میں ایک عام سا سانولی رنگت کا مرد میں نے تو تمہارے حسن کا اسیر ہونا ہی تھا۔ ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا بازو دو بوجھا تھا۔

”اور تم نفرت کرتی ہو مجھ سے محبت کرتی ہو احسان سے مگر اب کیا حاصل اس محبت سے کہ نفرت کرو یا محبت کچھ سمجھو یا نہیں رہو گی تو میری ہی بیوی اور مجھ میں اتنے گٹس تو ہیں ہی کم از کم کہ ایک بیوی کو قابو کر سکوں اس کے دماغ میں بھرے خناس کو نکال کر خود سے جڑے رشتے کی اہمیت سمجھا سکوں۔ وہ بے تاثر نگاہوں سے اس کے گلابی چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جو آنسوؤں سے تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ بازو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ناکام ہوتی اپنی بے بسی پر سسکنے لگی۔

”تمناشہ لگانا تمہاری فطرت و عادت ہوگی لیکن مجھے کھیل تمناشے کبھی پسند نہیں رہے یہ ایک حقیقت ہے کہ تمہارے لئے میرے دل میں سو فٹ کارنر موجود ہے تمہارے لئے بہت خاص انداز میں سوچا تھا میں

نے مگر جب تم نے شادی سے انکار کیا تو صرف تمہاری خوشی کے لئے میں اپنی محبت سے دست برداری قبول کر گیا مرنے نہیں رہا تھا تم سے شادی کے لئے مگر جب احسان کی اصلیت سامنے آئی آپنی نے اماں اور خالہ کی خواہش مجھ سے کہی تو میں خاموش ہو گیا کہ محبت میں انا نہیں چلتی مگر میں نے اپنی محبت کو بھی مان رکھا اور رشتوں کا بھی تم اب میری بیوی ہو مجھ سے جڑنے سے پہلے کیا کرتی رہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے مگر اب تمہارے لب سے کسی غیر مرد کا نام نہیں سن پاؤں گا کہ یہ میری انا و خوداری اور میری مردانگی کو کبھی گوارا نہیں ہوگا مجھ سے نفرت کرتی ہو کرو جب تک محبت نہ ہو جائے نفرت کرتی رہو مجھ سے مگر نفرت سے سوچو یا محبت سے اب سوچنا مجھے ہی پڑے گا اہمیت مجھے ہی دینا ہوگی اور مجھ سے جڑے رشتے کو بھی اس سب کو سمجھنے کے لئے تمہیں وقت چاہئے ہوگا میں دیتا ہوں کہ میں زبردستی کرنے کا قابل نہیں ہوں رشتے سے انکاری بھی ہوا تھا مگر خالہ کا منہ دیکھ کر اقرار کر گیا اور میں تمہاری اور خالہ کی محبت میں تمہیں وقت و مہلت دے سکتا ہوں اپنی توہین کرنے کی تمہیں اجازت نہیں دے سکتا یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔ ٹھنڈے لہجے میں اس کو بہت کچھ باور کرایا تھا اس کا بازو آزاد کر دیا تھا اور وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی تھی جبکہ وہ وہاں ٹھہرا نہ تھا کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر روم سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”امجد! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی تم نے یہی سب کرنا تھا تو شادی ہی کیوں کی تھی؟ کم ظرف ہی ثابت ہونا تھا تو اعلیٰ ظرفی دکھائی ہی کیوں کی تھی؟“

”بیانے آپ سے کچھ کہا ہے؟“ اس نے ماں کی بات کے درمیان میں سرد لہجے میں پوچھا تھا۔

”نہیں..... میں کوئی کم عقل عورت نہیں ہوں اتنی سمجھ بوجھ ہے مجھ میں کہ میں رویوں کو سمجھ سکوں اور

گزرے ماہ میں مجھے بارہا یہ احساس ہوا کہ بہت کچھ غلط ہے۔ وہ قدرے خفگی سے بول رہی تھیں۔

”اماں! آپ کو غلط نہیں.....“

”بکواس نہیں سنوں گی میں امجد! شادی کی پہلی رات تم اپنے کمرے میں نہ تھے تم دونوں کو گزرے ماہ میں ساتھ ہنستے بات کرتے نہیں دیکھا میں نے کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے اور کہتے ہو کہ مجھے غلط نہیں ہوئی ہے۔ وہ درشتگی سے بیٹے کی بات کاٹ گئی تھیں اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

”اماں! جن حالات میں شادی ہوئی آپ جانتی ہیں میں بیا کو یہ رشتہ سمجھنے کے لئے کچھ وقت۔“

”جھوٹ مت بولو امجد! تمہیں بیا سے شادی نہیں کرنا تھی نہیں کرتے اس کو نظر انداز کرنے حق ادا نہ کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے مجھے کتنا بھروسہ تھا تم پر کہ تم بیا کو سچے دل سے اپناؤ گے مگر نام دینے کو ہی تو اپنا نا نہیں کہتے اور یونہی کرنا تھا تو اپنا یا ہی کیوں.....؟“

میں بیا اور ہاجرہ آپا کے سامنے نظر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہی تمہاری کم ظرفی نے مجھے سب کی نظروں میں شرمندہ کر دیا ہے جس بیٹے کی اچھائی اور نرم خوئی کے سبب میں لوگوں سے فخر سے ملا کرتی تھی اب انہوں سے ہی نظریں چراتی ہوں۔ صابرہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں۔

”اماں! بیانے کیا کہا ہے آپ سے؟“ وہ خود کو بمشکل کنٹرول رکھتے ہوئے ہے۔

”یہی کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اس کو اس کا کوئی حق نہیں دیا ہم سب کو تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہئے تھی تم نے اس پر اتنا ظلم کیا اور پھر بھی اسے تمہاری اتنی پرواہ ہے اس نے احسان کی محبت بھلا کر تمہارے لئے دل میں جگہ بنائی وہ رشتے بنانا چاہتی ہے اور تم اپنی محبت کا بھی پاس نہ رکھ سکے یہ وہی بیا ہے جس کے لئے کچھ ماہ قبل تم ادا اس پھرتے تھے اس کو کھونے کے بعد تکلیف میں تھے ملک ہی

چھوڑ گئے تھے وہ تمہیں مل گئی ہے تو کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ وہ بہو کی باتوں اور جو دیکھا اور محسوس کیا تھا اس کی روشنی میں بیٹے کو بے نقط سنار ہی تھیں کہنے کو بہت کچھ تھا وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر ماں کے احترام بیوی اور اپنا بھرم رکھنے کو خاموش ہی رہا اور جب ماں کی باتیں برداشت سے باہر ہونے لگیں تو بہت خاموشی سے ماں کے سامنے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا ان کا تو اس کا یوں چلے جانے پر غصہ اور بڑھ گیا اور بہو کی باتوں اور اپنے واہیات پر یقین ہو گیا ان کی پر تشویش سوچیں گہری ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

”تم صرف روتی رہو گی یا مجھے کچھ بتاؤ گی بھی۔“

ربیعہ آج اجانک ہی اس سے ملنے اس کے گھر آ گئی تھی اور وہ دوست کو دیکھتے ہی یوں لپک کر اس کے سینے سے لگی جیسے طویل مدت بعد کوئی اپنا نظر آیا ہو اور وہ اس کے مستقل رونے پر پریشان ہو گئی۔

”بیا! پلیز کچھ کہو مجھے عجیب وہم ستانے لگے ہیں۔ بمشکل اسے خود سے الگ کر کے پانی کا گلاس تھمایا تھا۔ اس نے سکتے ہوئے بمشکل ایک گھونٹ پیا تھا اور اس نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم نہیں جانتیں ربیعہ! آج میں اپنی منہ زور خواہشوں کی بدولت کہاں تک جا پہنچی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں اور اس کی آنکھیں حیرت سے کھلنے لگی تھیں۔

”تم سب نے کتنا کہا تھا کہ احسان اعتبار کے لائق نہیں ہے اسے مجھ سے نہیں صرف میری خوبصورتی سے لگاؤ ہے مگر میں نے کسی کی بھی نہیں سنی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اماں سے بدتمیزی کی اور اماں نے احسان کو میرے لئے نامناسب سمجھتے ہوئے میری شادی زبردستی امجد سے کر دی تو میں نے نہ امجد کو کچھ سمجھا نہ اس سے جڑے رشتے کو ذرا برابر

بھی اہمیت دی اسے خالہ کی نظروں سے گرا دیا اور وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد میں آزادی محسوس کرنے لگی کہ اماں سے شادی کے بعد میں نے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا اور خالہ مجھے کبھی بھی کہیں بھی آنے جانے سے قطعی نہیں روکتی تھیں اماں کے گھر غربت کی وجہ سے جو خواہشیں ادھوری سسک رہی تھیں ان کو تکمیل کا راستہ مل گیا شاپنگ پارٹی کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک پارٹی میں احسان سے ملاقات ہوئی وہ عین ٹائم پر میرے انکار و فرار پر مجھ سے ناراض تھا بات کرتے ہوئے دکھ کا شکار تھا اور میں پہلے کی طرح اس کی لچھے دار باتوں میں الجھتی چلی گئی اس کے کہنے پر میں نے امجد کو طلاق کا نوٹس تک بھیج دیا میں اس کے ساتھ سنسیر تھی اس سے محبت کرتی تھی مگر اس نے مجھ سے محبت تو کی ہی نہیں تھی مجھے اس نے صرف طلب بنانا چاہا اپنی طلب کے حصول کے لئے وہ پیش قدمی کرتا رہا سیدھا راستہ اس کی سرشت میں نہ تھا مگر اولاد کی طلب نے اسے مجبور کر دیا اور اس نے میری طلب کو جائز حصول سے جوڑ دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی میری عزت پر ہاتھ ڈالا اس شخص نے جس پر میں نے بہت اعتبار کیا تھا جس کی خاطر اپنوں اور روایات کے خلاف گئی تھی ماں اور ماس سے جھوٹ بولے امجد سے طلاق کا مطالبہ تک کر دیا اس کو شوہر تسلیم ہی نہیں کیا کیسے کیسے میں نے امجد کی تذلیل نہیں کی ربیعہ مگر اس نے یہ حق رکھتے ہوئے بھی مجھے چھونے کی کوشش نہ کی کیونکہ میں ایسا نہیں چاہتی تھی اور اس شخص نے میرے ساتھ کیا کرنا چاہا جس پر میں نے بھروسہ کیا تم سب لوگ ٹھیک کہتے تھے حسن و خوبصورتی ظاہری نہیں باطنی ہونی چاہئے اور باطنی خوبیوں والے نے حق رکھتے ہوئے بھی میری رضا و خوشی کے احترام میں حق کا استعمال نہ کیا اور ظاہری خوبصورتی والے

شخص نے محبت کے نام پر دھوکا دیا اور عزت آگینہ چور چور کر دینا چاہا میری سوچ و پسند کو محدود اور گھٹیا بھی یہ سب مجھے کتنی دیر میں سمجھ آیا۔ بولتے بولتے خود ہی تھک کر چپ کر گئی اور وہ تو اس کی حرکتوں سے انجان تھی مگر اب کہتی بھی تو کیا کر لگنے والی چوٹ نے اس کی عقل و آنکھیں کھول دی تھیں اور اب ایسے میں اس کے کچھ کہنے یا سمجھانے کی کوئی گنجائش بچی ہی نہیں تھی۔

”تم اپنے کئے پر نادم ہو شرمندگی محسوس کر رہی ہو اس سب کی پہلے اللہ سے معافی طلب کرو اور اس کے بعد امجد کو آواز دے لو کہ وہ امجد اللہ کا انعام ہے تمہارے لئے جس کی بہت ناقدری کر لی اب عقل آگئی ہے تو سب سے پہلے اس کو واپس بلانا ہوگا اپنے کئے کی معافی۔۔۔۔۔“

”وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔“

”ہاں حق بجانب ہوگا وہ ایسا کرنے میں مگر تمہیں کوشش تو کرنی ہی ہوگی کہ معافی نہ ملنے کے ڈر سے معافی نہ مانگنے سے بہتر ہے کہ معافی مانگ کر معافی ملنے کا انتظار کر لیا جائے۔ وہ دوست کی پہلے بھی درست رہنمائی کرتی رہی تھی آج بھی اسے درست راستہ ہی دکھایا تھا مگر وہ پہلے بھٹک گئی تھی اور اب ہمت نہیں تھی وہ اللہ سے صبح و شام اپنے کئے کی معافی طلب کرتی امجد کے واپس آنے کی دعا میں مانگتی خود سے فون کرنے کی اس کو ہمت نہ ہو پارہی تھی کہ بات اس نے طلاق کی نوبت تک پہنچا دی تھی رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو گیا تھا اس کے سجدے اور دعائیں بہت لمبی ہو گئی تھیں صابرہ نے اس میں بدلاؤ محسوس کیا انہیں اس کی تبدیلی اچھی لگی تھی کہ وہ نماز روزے کی بہت پابند نہ تھی مگر اب پورے روزے یا قاعدگی سے رکھ رہی تھی فرض نمازوں کے ساتھ نفل نمازیں خاص کر تہجد اور دیگر تسبیحات پڑھتی رہتی۔

”بیا! امجد کو صرف ایک کال کر کے واپسی کا کہہ دو جیٹا کہ میں اسے جانتی ہوں جس طرح گیا ہے وہ اب لوٹنے والا نہیں ہے وہ تمہاری مثبت تبدیلی سے بھی انجان ہے۔“ سترہویں روزے کی افطاری سے قبل اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ دل بھرا آیا تھا اور وہ رو پڑی تھی جب صابرہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرمی و شفقت سے کہا تھا اور اذان کی آواز پر مجبور اس کی طرف پڑھایا تھا افطار کے بعد اس نے مغرب کی نماز ادا کی تھی اور امجد کا نمبر ڈائل کیا تھا تیسری بیل پر کال ریسپونڈ گئی تھی اور اس نے ہیلو بولا تھا اس نے سلام دعا کے بغیر کہنا شروع کیا تھا۔

”امجد! لوٹ آؤ کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے میں بھٹک گئی تھی میں غلطی پر تھی مجھے میری غلطیوں گناہوں کا اندازہ ہو گیا ہے اللہ سے معافی طلب کر چکی ہوں مگر اللہ مجھے جب تک معاف نہیں کرے گا جب تک تم مجھے معاف نہیں کر دو گے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں امجد معافی مانگ رہی ہوں معافی نہ دو سزا دو لیکن واپس آ جاؤ میری نہیں خالہ جان کی خاطر واپس آ جاؤ ہم سب تمہارے منتظر ہیں امجد خدا کے لئے واپس آ جاؤ۔ وہ بہت رورو کر بولی تھی اور اس کی سنے بغیر لائن کاٹ دی تھی پھر شدتوں سے رونے لگی تھی فون کے اس پار کھڑا شخص ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا اس کی سماعتوں میں بارعہ کی گریہ و زاری اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں اس کے دل کو ٹکے لگ گئے تھے اور اس نے ہاتھ میں موجود سیل فون سے اسی وقت نمبر ڈائل کئے اور واپسی کی سیٹ کنفرم کروانے لگا اس سے کہہ دینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا لیکن بے قراری کے انداز بدل گئے تھے وہ آہنوں پر چوکنے لگی تھی نگاہ دروازے پر جمائے آنسو گرنے لگتے اس نے رمضان کے مہینے میں جتنی ممکن عبادت کر سکتی تھی کی تھی اور اس کا بے قرار اور منتظر دل سجدوں میں ٹھہر سا جاتا تھا مگر

راتیں بے قراری سے بستر پر گروٹھیں بدلتے گزر رہی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے رمضان کا پورا مہینہ ختم ہو گیا تھا چاند رات بڑی اداس اور خاموشی سے سرکتی جا رہی تھی آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے اور بے کلی و بے قراری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی وہ کافی دیر تک رونے کے بعد سوئی جا گی سی کیفیت میں تھی کہ ادھ کھلے کمرے کا دروازہ کھلا کمرے میں نیم تار کی تھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ ٹکے میں منہ دیئے لیٹی تھی اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی تمام لائٹس آن کر دیں کمرہ روشن ہوا تو وہ سوئی جا گی سی کیفیت میں بھی چونک اٹھی سیدھی ہوئی تو ادھ کھلی نگاہ سے وہ سامنے نظر آیا جسے وہم سمجھ کر بھی جھٹک نہ سکی تو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہی وہ اس کو پورے چھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا وہ انھی اور اس کے عین سامنے آرکی چہرہ چھو کر شک کو یقین میں بدلا اور اس کے سینے میں سا گئی اس نے اسے ضبط سے رونے دیا اور اسے کافی دیر بعد جیسے ہی احساس ہوا وہ اس سے دور ہو گئی ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا اور اس کے مسکرانے پر اس کی شرمندگی نے اس پر حملہ کر دیا تو اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”امجد! مجھے معاف کر دو میں بہت بری ہوں تم جیسے اچھے انسان کے میں ہرگز لائق نہیں تھی تم تو اللہ کا انعام تھے جس کی میں نے قدر نہ کی صورت پر مرنی رہی سیرت اور کردار کو اہمیت نہ دی اور اس کا انجام بھی دیکھ لیا میں تم سے بہت زیادہ شرمندہ ہوں کیا تم مجھے میری ہر غلطی کے لئے معاف کر کے مجھے اپنالو گے۔۔۔۔۔؟“ وہ روتے ہوئے اپنی غلطیوں کا اور اس کی اچھائیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔

”تمہیں معاف کر دیا ہے بیا! جیہی تو پاکستان لوٹ آیا ہوں کہ جس دن تم نے وہ سب اماں کو بتایا تھا مجھے تم پر غصہ تھا اور میں ملک ہی چھوڑ گیا تھا کہ اماں کے سامنے نہ خود کو صحیح ثابت کر سکتا تھا نہ تمہارا

کسے کروں میں شکر اور

اس نے اس گھر میں صرف اور صرف غربت دیکھی۔ غربت میں آنکھ کھلی اور غربت میں ہی زندگی بسر ہوتی آ رہی تھی۔ مزدور باپ کی بیٹی مزدور کے ساتھ ہی بیٹھی گئی۔ اب جبکہ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، دن رات سوائے اس غربت کو کوئی دیکھنے کے اس کے پاس کوئی اور بات نہ ہوتی۔ فجر کے قریب بارش تھی تو کچھ سانس میں سانس آئی، خدا کی رحمت اسے اب زحمت لگنے لگی تھی، دل و دماغ اب صرف اور صرف منفی سوچوں میں گھرنے لگے تھے۔ صبح کی ہلکی ہلکی جب روشنی ہوئی تو وہ باہر صحن میں نکل آئی یہ سوچ کر کے نجانے اب باہر کیا تباہی پھیلی ہوگی۔ بچے رو دھو کر تھک کر سو گئے تھے۔ پر پریشانی سے اس کی آنکھوں کی نیند غائب تھی، جب وہ باہر صحن میں آئی اور صحن کی حالت دیکھی تو دل چاہا اپنا سر پیٹ لے یا پھر یہاں سے کہیں دور ایسی جگہ چلی جائے جہاں صرف سکون ہی سکون ہو، جہاں ایسی غربت بھری زندگی نہ ہو، پر یہ صرف سوچنے کو ایک خوش کن خیال تھا۔

اس نے گہری سرد سانس بھری اور جھاڑو اٹھا کر ٹوٹے پھوٹے صحن کو صاف کرنے لگی، تیز ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے گلیوں کا کچرا گھر میں آ گیا تھا اور جہاں جہاں سے صحن ٹوٹا ہوا تھا، وہاں سے صفائی کرنا مشکل ہو گئی تھی، بڑی مشکل سے اس نے صحن صاف کیا، پر اتنی آسانی سے ابھی اس کی مشکل ختم نہیں ہوئی تھی، بے ساختہ جب اس کی نظر دروازے پر پڑی تو صدمے سے

رات سے بارش زو و شور سے جاری تھی، تیز برستی بارش نے ہر شے کو بھگو کر رکھ دیا تھا، مسلسل ہوتی بارش نے غریبوں کا سکون اڑا دیا تھا، کچے اور کمزور مکانوں میں رہنے والے غریبوں کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی کتنے ہی مکان ٹوٹ کر گرے، کتنی بستیاں ڈوب گئیں اور نجانے کتنے ہی لوگ اس تباہی کا حصہ بن کر زندگی کی بازی ہار بیٹھے، کلثوم کی جان بھی سولی پر لٹکی ہوئی تھی ان کے گھر کا شمار بھی غریبوں کے کچے مکانوں میں ہوتا تھا، چالیس گزر کا چھوٹا سا دو کمروں پر مشتمل یہ مکان اپنی غربت کی حالت خود بتا رہا تھا، کمرے میں ٹین کی چھت سے مسلسل پانی ٹپک رہا تھا، کلثوم تو ادھ موٹی ہو گئی، کمرے سے بارش کا پانی نکالتے ہوئے چھ عدد بچوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا، ٹھیک سے نہ سونے کی وجہ سے سب ہی کی ریں ریں جاری تھی تھے بھی سب اوپر تلے کے چھوٹے چھوٹے، کلثوم کا غصہ سا تو اس آسمان سے باتیں کر رہا تھا، ایسے وقت میں اس نے کس کس کو سونے نہ دیئے ہوں گے، برستی بارش کو بجلی والوں کو جنہوں نے پچھلے چودہ گھنٹے سے بجلی بند کر رکھی تھی، اپنے میاں کو جو بے خبر سو رہا تھا، بچوں کو غربت کو تقریباً اس وقت ایسا کوئی نہ تھا جسے اس نے کوسا نہ ہو، ساری رات اسی فکر اور پریشانی میں کٹ گئی، بے بسی سے وہ ٹین کی چادروں سے ٹپکتے پانی کو دیکھتی تو دل خون کے آنسو روتا، جس دن سے وہ اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی

نکاح میں ہو کر مجھ سے بے وفائی کی ہے، اور میرے نزدیک بے وفائی کی کوئی معافی نہیں ہے۔ وہ یہ تذلیل ایک دفعہ تو بھول گیا تھا کہ اس نے اسے ٹھکرادیا تھا اور احسان کی چاہت کی تھی، مگر وہ یہ تذلیل اب نہیں بھول سکتا تھا، کہ وہ اسی شخص کی خاطر اسے چھوڑنا چاہتی تھی، اس کے سجدے اس کی دعائیں، اس کے حق میں اچھے ہی ثابت ہوئے تھے کہ امجد نے اس سے رشتہ توڑا نہ تھا، اور جڑے ہوئے رشتے سے آگے ہر ایک اچھی امید رکھی ہی جاسکتی ہے۔

”تم نے ٹھیک کہا امجد! میرا قصور معافی کے لائق ہر گز نہیں ہے مجھے تمہاری سزا قبول ہے میں اللہ سے دعا کروں گی کہ وہ میرے مشکوک ہونے والے کردار کو تمہاری نگاہ میں ایک نہ ایک دن سرخرو ضرور کر دے، آمین مگر تم یہ یقین ضرور رکھنا امجد کہ میں بھنگی ضرور تھی، مگر گرتے گرتے سنبھل بھی گئی ہوں، میں نادانی کرنے چلی تو تھی، لیکن اللہ نے میری حفاظت کی تھی اور اسی لئے میں آج تم سے نظر ملانے کے قابل ہوں کہ میں نے تمہاری امانت میں کوئی خیانت نہیں کی ہے۔“ وہ زخمی مسکراہٹ کے سنگ بولی تھی اور آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

”تم سفر سے آئے ہو فریش ہو جاؤ، میں تمہارے لئے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ صبح عید تھی اس کی عید کچھ اداس کچھ اطمینان کے ساتھ گزر گئی تھی وہ اسی پر خوش تھی کہ اس نے اسے معاف کر دیا ہے، اور اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کے دل و نگاہ میں اپنا کھویا ہوا مقام بھی پالے گی، یہ عید نہ سہی آگے ابھی اس نے امجد کے ساتھ بہت سی عیدیں دیکھنی تھیں کوئی تو عید اس پر مہربان ہوگی کہ اللہ اس پر مہربان تھا، بھٹکتے بھٹکتے اس کو تھام لیا اور جب اللہ مہربان ہو تو عرش اور زمین پر بسنے والے بھی مہربان ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆

امجد خراب ہوتے دیکھ سکتا تھا، مگر مجھے اس وقت زیادہ غصہ آیا جب تم نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا میں نے سوچا تھا کہ میں تمہیں آزاد کردوں گا، اور جب میں نے اماں کو فون کیا تھا انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم پر ظلم کرنے کی پاداش میں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گی، میں لوٹ کر تمہیں خوشیاں دوں، تمہارے حقوق ادا کروں، وگرنہ وہ مجھے اپنا دودھ نہیں بخشیں گی، اماں کی بے انتہا سختی کے سبب میں نے طلاق کا ارادہ کینسل کر دیا لیکن واپسی کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکا، اور یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ جو جیسا چل رہا ہے چلے دو، جو ہوگا دیکھا جائے گا، اس سب میں کافی وقت گزر گیا، اماں نے بات تک کرنا چھوڑ دی، پھر اللہ کو مجھ پر رحم آ گیا اور تمہاری سوچیں بدل گئیں، تمہارے ارادے بدل گئے، تم نے لوٹ آنے کو کہا میں لوٹ آیا کہ تم سے خفا بھی ہوں، تم پر غصہ بھی ہوں، تمہاری حرکتوں سے ناراض بھی ہوں، لیکن میں اس سب کے باوجود تم کو کوئی سزا نہیں دے سکتا کہ تم میری ماں کی خوشی ہو، میری خوشی تو بہت پیچھے بہت پہلے ہی رہ گئی تھی، رشتہ قائم تھا تو اماں کی وجہ سے اور رشتہ قائم رہے گا بھی تو اماں کی وجہ سے کہ میں تمہاری ہر خلی، نفرت اور ہر ایک بد تمیزی بھول سکتا ہوں، معاف کر سکتا ہوں، بلکہ کر چکا ہوں، مگر تمہارا بھٹکا ہوا ایک قدم بھی برداشت نہیں ہے مجھے، تم نے کہا لوٹ آؤ، تم نے کہا اماں اور خدا کے لئے لوٹ آؤ، میں فوراً آ گیا، اور تمہیں معاف بھی کر دیا، دل وسیع کر سکتا ہوں، نظر وسیع کر سکتا ہوں، غیرت اور مردانگی کو نہ تمہارے نہ اپنے پیروں تلے چل سکتا ہوں، میں وہاں ہو کر بھی انجان نہ تھا، اور تم میرے دل سے اس وقت اتر گئی تھیں جب تم نے میرے گھر کی دہلیز پار کی تھی اور احسان سے روابط بڑھائے تھے، روابط کی نوعیت اور ٹوٹنے کے اسباب سے لاعلم ہوں، مگر تم میرے دل سے اپنا مقام کھو چکی ہو کہ تم نے میرے

ارد گرد اس کے منڈلانے لگیں، جب سوچتے سوچتے تھک گئی، تو ہار کر پرانے لان کے سوٹ کے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور آنا گوندھنے لگی، آنا کم ہونے کی وجہ سے اس نے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائے تاکہ رونی زیادہ بن جائے چائے کے طور پر صرف قہوہ ہی تیار کر سکی، تھوڑی دیر میں ٹکیل کرے سے نکل آیا، ٹکیل اپنی جمائیوں کو روکتے ہوئے اور آنکھوں کو مسلتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھا۔

”ناشتے میں کیا بنایا ہے.....؟“ وہ اپنی مسلسل آتی جمائیوں کو ہاتھ سے روکتے ہوئے بولا، ٹکیل کے بولنے کی دیر بھی وہ تو گویا پھٹ پڑی۔

”کیا بننا ہے وہی بنا ہے جو روز کھاتے ہیں پوچھ تو ایسے رہا ہے جیسے مجھے بڑے پیسے دیے ہوں، مرغ مسلم بنانے کے لئے۔“ وہ روٹیوں کو روٹی کے کپڑے میں لپیٹتے ہوئے جلے کٹے لہجے میں بولی، ٹکیل کے ماتھے پر تیوریاں نمودار ہو گئیں۔

”تو سدا کی ناشکری رہتا۔“ اس نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کڑوے کیلے لہجے میں کہا۔

”ناشکری.....؟ تو مجھے یہ بتا یہاں ایسا کیا ہے یا تو نے آج تک مجھے ایسا کیا دیا ہے جس پر میں شکر کروں جس دن سے میں نے اس گھر میں قدم رکھا ہے سوائے غربت کے میں نے کچھ نہیں دیکھا، تھک گئی ہوں میر یہ غربت بھری زندگی گزار کے نہیں ہوتا مجھ سے اب مزید صبر۔“ وہ بھری بیٹھی تھی جس کا سارا بال اب ٹکیل پر ٹکنا تھا۔

”واہ..... بول تو ایسے رہی ہے جیسے تو مخلوق سے آزاد ہو جو یہ زندگی نہیں گزاری جا رہی یاد کر لے تیرے باپ گھر میں بھی ایسی ہی غربت تھی۔“ وہ تملاکر کھڑا ہو گیا۔

”اسی کا تو دکھ ہے آخر خدا نے کیوں میرا مقدر پتھر جیسا بنایا، اگر دنیا میں ایسی زندگی گزاری تھی تو کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی، ٹکیل نے اسے زہریلی نگاہوں سے دیکھا اسے کبھی بھی اس

برا حال ہو گیا، ہواؤں کے زور کی وجہ سے زنگ آلود دروازہ تقریباً آدھا دیوار سے علیحدہ ہو گیا تھا، ویسے بھی دروازے کی حالت پہلے سے ایسی تھی کہ کوئی ہلکا سا بھی دھکامارتا تو وہ اگلے پل زمین بوس ہو جاتا تھا، اس لئے وہ زیادہ تر دروازے پر پردہ ہی لٹکا کر رکھتی تاکہ آنے جانے والا ہر کوئی اسے استعمال نہ کرے ایسا وہ صرف اس خوف سے کرتی تھی کہ اگر دروازہ ٹوٹ گیا تو اتنے بھی پیسے نہ ہوتے کہ وہ اسے دوبارہ صحیح کر دیا پاتے، ظاہر تھا مزدور شوہر صرف اتنا کماتا جس میں صرف وہ کھانا کھا پاتے تھے۔

”چلو اچھا ہی ہوا، اس روز روز کی فکر سے جان تو چھوٹی، اب گرا تو تب گرا۔“ وہ غصے میں بھنا کر بولی جتنا وہ اس کے لئے فکر مند ہوتی، اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی، لہذا اب صبر کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا، سورج کافی حد تک طلوع ہو چکا تھا، سورج کی کرنیں ہر طرف پھیلنا شروع ہو چکی تھیں، اس سے پہلے کہ سورج سر پر پہنچتا اس نے سوچا جلدی جلدی ناشتہ بنالے ساتھ ہی وہ دوپہر کے لئے بھی کچھ نہ کچھ بنا لیتی، ویسے بھی کونسا اس نے کھانے کے لئے اہتمام کرنا ہوتا تھا، زیادہ تر دال یا آلو ہی پکتے تھے، وہ صحن میں بنے ٹیمپریری کچن میں آئی چولہے کو سیدھا کر کے رکھا، جو کہ بارش کی وجہ سے اس نے اندر رکھ دیا تھا، گیس سیلنڈر کے ساتھ چولہے کا گیس پائپ جوائنٹ کیا، روٹی بنانے کے لئے جب اس نے آئے کا ڈبہ کھولا تو اس میں بامشکل پانچ روٹیوں کا آنا تھا، جو کہ آٹھ افراد کے لئے نہ کافی تھا اور اگر ابھی یہ استعمال کر لیتی تو دوپہر اور رات میں کیا بناتی، اس نے ایک ایک کر کے دال، چاول اور مسالوں کے سب ڈبے چیک کر لئے، سوائے پتی اور تھوڑی سی چینی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اپنی تو اتنی نہیں پر بچوں کی فکر تھی، ابھی تو کچھ نہ کچھ کر کے انہیں کچھ کھلا دے گی، پر دوپہر اور رات میں کیا کرے گی، پتا نہیں ٹکیل کو آج کوئی مزدوری ملنی بھی تھی کہ نہیں، فکریں



یہ ناشتہ اچھی نہ لگتی تھی۔

”بس روتی رہنا اور ہمیشہ ناشتہ ناشتہ کرتی رہنا“ اسی وجہ سے تو آج ایسی زندگی گزار رہی ہے۔“ وہ بولتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا، پیچھے سے وہ روتی رہی۔ تھوڑی دیر میں بچے بھی اٹھ آئے اور بھوک بھوک کر نے لگے ان سب کو ناشتہ کروانا بھی کسی مشکل سے کم نہ تھا، ایک روٹی کے پیچھے سب اپنے لڑتے جیسے چیل کوے گوشت کے ٹکڑے کو جھپٹنے کی کوشش کرتے تھے۔

”مت لڑو منخوس مارو“ کم از کم کھانا تو ڈھنگ سے کھالیا کرو۔“ اس نے ایک دودھو کے سب کو جڑ دیئے۔

”اماں! اس نے میرا حصہ لے لیا ہے۔“ بڑے والے نے اپنے سے چھوٹے کی فوراً شکایت کی جو سب میں شاطر تھا۔

”اماں! جھوٹ بول رہا ہے میں نے نہیں لیا۔“ چھوٹے نے فوراً اپنی تصحیح کی۔

”مت لڑو کوئی زیادہ بولا تو مار مار کر حشر بگاڑ دوں گی۔“ اس نے روٹی اور چائے کی پیالیوں سے کھیاں اڑاتے ہوئے جھڑکا۔ شکیل تیار ہو کر جانے لگا تو اس نے پیچھے سے پکارا۔

”ناشتہ تو کر لے۔“

”اونہہ..... تیری بکواس سے میرا پیٹ بھر گیا ہے۔“ وہ غصے میں بھنا کر بولا۔

”کیوں ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟“ وہ بھی تملائی۔

”یہ تو خود سے پوچھ۔“ وہ کہہ کر پلٹنے لگا تو اس نے پھر پکارا۔

”راش سارا ختم ہے نہ دوپہر کے لئے کچھ ہے نہ رات کے لئے اور نہ انگلی کئی دنوں کے لئے اور یہ بھر دروازہ آج اس نے بھی دم توڑ دیا ہے۔“ وہ سخت لہجے بولی، شکیل غصے میں بھناتے ہوئے نکل گیا۔

کی طویل لسٹ تھی اور دو پیسہ جیب میں نہ تھا، بے میں سوائے کڑھنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا، بچے سے وہ غصے میں برتن جتنے لگی۔

”ساری مصیبتیں میری جان کو ہیں خود تو چلا کر مزے سے جان تو میری لٹکتی ہے سولی پر کیا دوں گی کھانے کو ان کو مانگیں گے تو مجھ سے ہی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی، صبح سے شام ہونے کو آگئی تھی بچے سارا دن بھوک سے روتے رہے خود وہ بھی روتی رہی اور کڑھتی رہی سوائے کڑھنے کے اسے اور کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا، کتنی ہی دیر سے وہ دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی، ٹوٹا پھوٹا بھر دروازہ اپنی بے قدری کا رونا رورہا تھا، اس گھر میں کوئی بھی تو ایسی چیز نہ تھی جس کو دیکھ کر وہ خوش ہو، اب اسے حقیقت میں احساس ہو رہا تھا آخر کیوں آئے دن لوگ غربت سے تنگ آ کر خود کشیاں کر لیتے ہیں حقیقت میں تو اس وقت اس کا بھی یہی دل کر رہا تھا، پیٹ میں جو بھوک کی آگ لگی تھی اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا، یہ آگ اس وقت زیادہ بھڑک اٹھتی، جب بچوں کو بھوک سے رونا دیکھتی، اس وقت اس کا بس نہ چلتا وہ کیا ایسا کرے جس سے ان کی بھوک مٹا دے، کتنے ہی گھنٹے گزر گئے تھے سوچتے سوچتے بچے بھی صحن میں اس کے پاس روتے روتے سو گئے تھے۔

”پتا نہیں آج رات یونہی بھوک کے پیٹ سو جانا تھا یا کچھ کھانے کو ملے گا بھی نجانے شکیل کو مزدوری ملی بھی ہوگی کوئی کے نہیں یا اس نے بھی خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے ہے۔“ سیاہ آسمان پر نظریں جمائے سوچ سوچ کے اس کا دماغ مفلوج ہو رہا تھا اپنی قسمت اس سیاہ آسمان جیسی ہی لگ رہی تھی جس میں سوائے اندھیروں کے اور کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا، پر سیاہ آسمان پر روشنی کی چھوٹی سی کرن لئے چاند ستارے جگمگاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس اندھیرے پر وہ غالب ہونے کی کوشش کر رہے ہوں اور یہ تاریک رات بھی بھلا کب تک رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تو اس نے فوراً چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، شکیل تھکا ہارا ملگجے سے حلے میں اندر داخل ہوا، اس کی نظر فوراً شکیل کے ہاتھوں

پڑی، جس میں اس نے کچھ تھیلیاں پکڑی ہوئی تھیں جن میں کیا سامان تھا یہ تو اسے سمجھ نہ آیا، پر یقین تھا وہ کچھ کھانے کو لایا تھا، وہ فوراً اٹھ کر اس کی طرف لپکی اور بناء اس کی خیریت دریافت کئے اس پر چڑھ دوڑی۔

”یہ کوئی وقت ہے تیرے گھر آنے کا دوپہر سے بھوکے بیٹھے ہیں ہم پر کچھ کیا ہم جنس یا مریں.....؟“

”ہاں تو میں کون سا عیاشی کر کے آرہا ہوں تم لوگوں کے پیٹ بھرنے کے لئے اپنی ہڈیاں توڑتا ہوں پر تجھ جیسی بے صبری اور ناشتہ شکر عورت کو کیوں احساس ہوگا“ میاں باہر سے تھکا ہارا آیا ہے بجائے اس کی خیریت پوچھنے کے اس کو پانی دینے کے اپنی چڑچڑ شروع کر دی۔ وہ صحن میں رکھی کمزور سی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے غصے میں بولا، ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے تھیلیاں سائینڈ پر رکھیں۔ آگے سے کلثوم منہ میں بڑبڑانے لگی اور جھٹ سے چارپائی سے تھیلیاں اٹھا کر چیک کرنے لگی۔

”یہ کیا بس تو پکانے کے لئے یہ دال چاول لایا ہے گھر میں سارا راشن ختم ہو گیا ہے ابھی یہ بنا کے کھالیا تو کل کیا بناؤں گی.....؟“ اس کا خالی کچے دال چاول دیکھ کر پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا، شکیل کے ماتھے پر تیوریاں نمودار ہو گئیں اس کی بات سن کر سارا دن کس مشکل سے صرف اتنا کما رکھا تھا کہ خالی دال چاول خرید سکے، اس کا اندازہ صرف اسے ہی تھا، سڑکوں پر پیدل چل چل کے اس کا جسم درد سے چور چور ہو رہا تھا اور جب اوپر سے کلثوم کا منہ بنتا ہوا جب دیکھا تو تکلیف کی شدت اور بڑھ گئی۔

”دفع ہو جا میری نظروں سے“ جولا کر دیا ہے ناں“ سیدھی طرح پکالے یہ میں جانتا ہوں اور میرا خدا کے کس مشکل سے میں یہ لے کر آیا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں اتنا غصہ اتر آیا تھا کہ ایک پل کے لئے کلثوم بھی کچھ گھبرا گئی تھی اس لئے خاموشی سے دال چاول پکانے چلی گئی، جتنی دیر میں کھانا تیار ہوا وہ مسلسل بڑبڑاتی رہی، غربت کو کوسے کوسے اب جیسے وہ خود بھی جھٹکتی لگی تھی۔

شکیل نے ایک سرد آہ بھر کر صحن میں فرش پر لیٹے

اپنے بچوں کو دیکھا جو بے خبر سو رہے تھے اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی نجانے انہوں نے سارا دن کیسے بھوک کاٹی ہوگی، کیا اس کا دل نہیں کرتا تھا اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے کو جتنا اس سے ہو پاتا تھا وہ کرتا تھا پر قسمت کے آگے خود کو بے بس پاتا، مہنگائی جوں جوں بڑھتی جا رہی تھی حالات اتنے ہی تنگ ہوتے جا رہے تھے، پر وہ اس کے باوجود خدا کی ذات سے مایوس نہ تھا، جتنا ہو سکتا تھا وہ اپنے طور پر کوشش کرتا رہا تھا، اس کی کتنی خواہش تھی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی۔ اس کی سمجھ بھی اسے تب آئی تھی جب خود کورلتا ہوا دیکھا کمانے کے لئے پر اب تو جیسے یہ خواہش بھی ماند پڑتی جا رہی تھی، زمانے کی درد کی ٹھوکروں سے اس کے قدم لڑکھڑانے لگ گئے وہ کتنی ہی دیر اپنے بچوں کو یک ٹک دیکھتا گیا اور نجانے کیا کیا سوچتا رہا، کچھ کلثوم کھانا بنا کر لے آئی اس نے کھانے کا دسترخوان صحن میں ہی لگا دیا وہ پلیٹیں سیٹ کر رہی تھی جب شکیل نے اسے بغور دیکھا کیسی کھلتا ہوا گلاب تھی وہ جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی اور اب غربت نے تنگ دستی نے اس کی خوبصورتی تو خوبصورتی چہرے کی خوشی بھی چھین لی تھی اسے یاد پڑ رہا تھا پچھلے کچھ عرصے سے وہ کھل کر بھی مسکراتی ہو، کہاں تو وہ زندگی سے بھرپور کھلکھلاتی ہنسی مسکراتی تھی سنواری سی رہتی تھی اور اب تو وہ ایک جوڑا مستقل چڑھائے رہتی، جس کی رنگت دھودھو کر نہیں کھو گئی تھی شاید اسی طرح وہ خود بھی کہیں کھو گئی تھی۔

کلثوم نے کھانا لگانے کے بعد بچوں کو اٹھایا، بچے گہری نیند سے آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے لگے کھانے کے دسترخوان کو دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، بھلے کوئی مرغ مسلم نہ تھا پر بھوک کے پیٹ کو بھرنے کے لئے یہ مرغ مسلم سے انہیں کم نہ لگا، بچے قنافت کھانے پر ٹوٹ پڑے بچوں کی افرا تفری دیکھ کر کلثوم انہیں جھڑکنے لگی، بچوں کو کھانا دینے میں وہ اتنی مشغول ہوئی کہ اسے شکیل کی خبر ہی نہ رہی

اس کی یاد آنے پر اس نے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا، جہاں وہ چار پائی پر بیٹھا خاموشی سے اسے ہی ایک ٹک دیکھ رہا تھا، کلثوم کو اس کا خاموش اور اس چہرہ کہیں کھویا ہوا لگا۔

”تو کیوں اتنا خاموش بیٹھا ہے آ کے کھانا کھا۔“ وہ اپنے مخصوص کڑک انداز میں بولی تو وہ چونک اٹھا۔

”ہاں..... آتا ہوں ہاتھ منہ دھو کر۔“ وہ چپ چاپ کہہ کر اٹھ گیا، کلثوم کا دل ڈوب سا گیا، ٹکلیل کے اداس چہرے کی وجہ جانتی تھی پر کیا کیا جاسکتا تھا یہ سوچ کر وہ بچوں کی پلیٹ بھرنے لگی۔

☆.....☆

ماہ و سال چپ چاپ سڑکتے جا رہے تھے ان کی زندگی کا وہی معمول تھا، ابھی ایک وقت پیٹ بھر کے کھانا کھالیا، تو دو وقت بھوک کاٹنی پڑتی اور اگر خوش نصیبی سے تین وقت کا کھانا مل جاتا، تو اگلے دنوں کا پتہ نہ ہوتا کلثوم کے مزاج میں کئی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، ٹکلیل بھی اس کی اس عادت سے بیزار رہنے لگا تھا۔

شام کا پیر تھا، جب وہ رات کا کھانا پکانے کے لئے آلو چھیل رہی تھی، بچے گلی میں کھیلنے گئے تھے اس لئے گھر میں بھی امن و سکون تھا، وہ خاموش سی خالی ذہن آلو چھیلے جا رہی تھی اب وہ کسی بھی بارے میں زیادہ نہیں سوچتی تھی مایوسی نے اس کے اندر مضبوط ڈیرے جمائے تھے اس لئے زندگی کی کوئی خوشی اور رفق اس کے اندر اب موجود نہ تھی اب تو جیسے وہ ان حالات سے سمجھوتا کرنے لگ گئی تھی، دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تو وہ چونکی۔ سامنے سے نوران دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو ہٹاتی ہوئی اندر داخل ہوئی، نوران اس کی پڑوسن تھی، کم و بیش اس کے حالات بھی اسی کی طرح تھے، تقریباً اس غریب محلے میں رہنے والے سبھی کی زندگی تنگ دستی کا شکار تھی۔

”خیر تو ہے نوران! آج بڑے دنوں بعد آنا ہوا اور یہ کیا ہے.....؟“ نوران اس کے پاس چار پائی پر بیٹھ گئی، کلثوم نے اس کے بیٹھے ہی نوران اس کی حیرت دریافت

کی ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیالی رکھ کر چونکی جس پر پلیٹ ڈھکے ہوئے کی وجہ سے معلوم ہو سکا اندر کیا ہے، نوران اس کو دیکھ کر دھیمسا سا مسکرا اور پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔

”یہ میں نے نیاز دلوائی تھی محلے میں بانٹنے لگی، سو چاہے پہلے اپنی سہیلی اور پڑوسن کو دوں، وہ بھی کچھ دینے میں پڑوسنیوں کا حق پہلے ہوتا ہے۔“ اس نے رسانیہ سے کہا۔ کلثوم نے پیالی اس کے ہاتھوں سے لے کر تھامی، کلثوم کو تو اس کے انداز و اطوار پر یقین ہی نہ آ رہا تھا، وہ نوران جس کے گھر میں کھانے پینے نجانے کتنے جھگڑے ہوتے تھے وہ لوگ جو پائی پائی ترستے تھے آج وہ محلے میں کھیر بانٹتی پھر رہی تھی اسے یہ کسی معجزے سے کم نہ لگ رہا تھا۔

”نوران! یہ تیرے حالات اچانک کیسے سدھ گئے کیا بھائی کی کوئی اچھی نوکری لگ گئی ہے.....؟“ اس نے اپنا انداز لگایا۔

”نہیں نوکری تو نہیں لگی پر مجھے خدا پر یقین ہے انشاء اللہ بہت جلد لگ جائے گی۔“ نوران پر یقین ہو کر بولی، کلثوم کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”نوران! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، اگر بھائی کی نوکری نہیں لگی تو تو یہ کھیر کیوں بانٹتی پھر رہی ہے مطلب ہے تیرے گھر کے حالات تو ایسے ہیں جہاں تین وقت کا پورا کرنا مشکل ہے وہاں محلے والوں کے لئے گنجائش نکالنا تو بہت مشکل ہے۔“

”بس کلثوم! گنجائش نکلتی نہیں ہے نکالنی پڑتی ہے اور جب انسان ایک بار سچی نیت کر لے تو اللہ تعالیٰ بخود راستے بنا دیتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو کلثوم اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا اسے آج نوران بڑی بدلی بدلی لگی، کہاں تو وہ ہر وقت گھر کے حالات کا رونا روتی رہتی تھی اور آج اتنی صابر اور شاکر اچانک اس کے اندر کا بدلہ لے لیا۔

”نوران! آج تو بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی

ہے۔“ نوران کلثوم کی حیرت پر دھیمسا سا ہنس دی۔ ”اچھا ایسی کیا تبدیلی دیکھ لی تو نے مجھ میں.....؟“ ”کہاں تو؟ تو ایک روپے کے لئے ترستی تھی اور اب ایسی صابر اور شاکر۔“ کلثوم نے بنا لگی لپٹی کے صاف کہا۔

”بس کلثوم! خود پر افسوس ہوتا ہے بڑا غلط کیا میں نے جو اس خدا کی ذات پر یقین نہ رکھا، بھٹک گئی تھی میں یہ اسی کی مہربانی ہے جس نے مجھ ادنیٰ سی انسان کو ہدایت دی، اگر وہ نور بی بی کو ذریعہ نہ بناتا تو شاید پتہ نہیں میرا کیا ہوتا۔“ نوران سنجیدگی سے بولی۔

”نور بی بی.....؟ کون.....؟ نوران۔“ کلثوم نور بی بی کے نام پر چونکی۔

”مٹھر میں تجھے پوری بات بتاؤں، ایسے تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ نوران نے کلثوم کے نہ سمجھنے والے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”اصل میں پچھلے دنوں میرے گھر کے حالات بہت زیادہ ہی خراب ہو گئے تھے رشید کو کئی کئی دن مزدوری نہیں ملتی تھی بچوں کو بھوک سے بے حال دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے والا ہو جاتا، بس پھر میں نے تہیہ کر لیا، رشید کو کوئی کام ملے یا نہ ملے پر میں اپنے بچوں کو بھوکا مرنے نہیں دوں گی، اس لئے میں نے لوگوں کے گھر صفائی کا کام شروع کر دیا، پر کام کرنے کی وجہ سے کلثوم میں اتنی تھک جاتی کہ نجانے غصے میں کیا کیا بولتی، اسی وجہ سے رشید سے میرا آئے دن جھگڑا رہتا، غربت کو کوستے میں تھکنے لگی تھی، نجانے خدا سے کتنے شکوے کئے جن کا کوئی حساب نہیں پھر ایک دن جب میں نے نور بی بی کی درس میں باتیں سنیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے سچ کلثوم! نور بی بی واقعی اللہ کی بڑی چٹکی بندی ہے، اتنی اچھی باتیں بتاتی ہیں کہ دل کرتا ہے بندہ ستار ہے لوگ تو ان سے خصوصی دعا کرواتے ہیں ان کی باتوں کا اثر ہے کہ آج مجھے احساس ہوا ہے، ہم واقعی بڑے ناشکرا ہیں جتنا مل جائے کم ہی لگتا ہے۔“ نوران نے

کھوئے ہوئے انداز میں کہا، پر کلثوم کی سوئی نور بی بی پر ہی اٹک گئی تھی اس کے ذہن میں صرف اتنی بات سما سکی کہ وہ نوران جو پائی پائی کو ترستی تھی آج کھیر بانٹتی پھر رہی ہے تو یقیناً کوئی تو انہوں نے نوران کو ایسا جادو بتایا ہوگا، جو اس کے حالات اتنے بہتر ہو گئے۔

”پر یہ نور بی بی ہے کون.....؟ تیری ملاقات کیسے ہوئی ان سے.....؟“ کلثوم نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”اصل میں میں جس باجی کے گھر کام کرتی ہوں ناں وہ انہی کی ماں ہیں کافی اللہ لوگ ہیں، جمعرات کے جمعرات ان کے ہاں درس ہوتا ہے جس میں وہ غریبوں کو نیاز بھی تقسیم کرتی ہیں بڑے لوگ آتے ہیں ان کے پاس کتنے ہی لوگ اپنے مسائل بھی انہیں بتاتے ہیں اور وہ بڑے طریقے سے ان کے حل بتاتی ہیں انہیں پتا ہے جب میں نے بڑی مایوسی سے نور بی بی سے اپنے گھر کے حالات کا رونا روایا تو انہوں نے صرف مجھے اتنا کہا نوران رب کا شکر ادا کرو جو مانگتا ہے صرف اس سے مانگو اور صدقہ خیرات ضرور کر، بس پھر اللہ کرم کرے گا، یقین جان کلثوم وہ دن اور آج کا دن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمارے گھر میں رزق کی بڑی برکت پیدا ہو گئی ہے۔“ نوران نے سنجیدگی سے کہا۔

”نوران! تو مجھے بھی اس نور بی بی کے پاس لے چل۔“ کلثوم نے چل کر کہا اسے لگا شاید ایک نور بی بی ہی ہے جو اس پر کچھ کرم کر دے۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کل جمعرات ہے ناں تو چلی چلتا میرے ساتھ۔“ نوران اس کے خیالات سے انجان بولی۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں کلثوم! مغرب کی اذان ہونے والی ہے نماز کی تیاری بھی کرنی ہے اور پھر اور لوگوں کے ہاں بھی تو کھیر بھجوانی ہے۔“ نوران رسانیہ سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، کلثوم اس کے نئے روپ پر بڑی حیران تھی جب تک نوران اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ اسے جاتا تکتی رہی۔

☆.....☆

اس کی گردن جھکتی ہی چلی گئی اور رو کر اپنے عمل کی معافی مانگتی رہی، کیسے وہ زندگی کو برا بھلا کہتی رہی، کیسے کس زبان سے وہ اس کی ناشکری کرتی رہی، یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا اور وہ اتنا غفور و رحیم تھا اس نے نہ ہی تو اس کی ناشکری پر اس سے زبان چھین لی نہ ہی اس کی غلطیوں پر اس پر ظلم کئے، یہ اس کی رحمت و شفقت ہی تھی جو وہ اس کے کسی بھی عذاب سے محفوظ تھی۔

دن رات اس کے انہی سوچوں میں گزرنے لگے کوئی پل ایسا نہ گزرتا جس میں وہ خدا سے معافی نہ مانگتی، اس کا دن پہلے سے کہیں زیادہ پرسکون ہو گیا تھا، اگر ایک وقت کھانا نہ بھی ملتا تو اسے یقین تھا وہ انہیں بھوکا نہیں مارے گا، یہ یقین ایسا یقین تھا جس سے دل و دماغ دونوں پرسکون ہو گئے تھے۔ اس نے نوراں سے بات کی کہ وہ اسے بھی کام کے لئے دو تین گھر دلوادے، شکیل کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو وہ چپ سا ہو گیا۔

☆ رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہوا تو ہر طرف رونق کا سماں ہو گیا، ہر کوئی اس مہینے کی برکتیں سمیٹنے کے لئے عبادتوں میں مصروف رہتا، کلثوم کے گھر میں افطار میں بھی دال اور روٹی ہی ہوتی، پر اب کی بار اس کے دل میں اعلیٰ قسم کے پکوان کی کوئی چاہ نہ ابھی پر شکیل کے چہرے پر دکھ تھا وہ بیوی بچوں کو اچھا کھانا چاہتا تھا۔

پہلا عشرہ گزرا تو بانی دو عشروں کا پتہ ہی نہ چلا، اس رمضان اس نے خوب دل لگا کر عبادت کی اور شوہر بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگیں، عید میں تین دن باقی رہ گئے تھے اور بچوں نے اس کی جان کھا رکھی تھی، عید کے لئے انہیں بھی نئے کپڑے دلوائے، جواباً وہ خاموش رہتی، تو وہ اور واویلا مچاتے، شکیل نے بچوں کو جھوٹی تسلیاں دیں تو وہ غصہ ہوئی۔

”کیوں جھوٹی تسلیاں دیں تو نے بچوں کو.....؟“
”جھوٹی تسلی نہیں دی میں نے،“ کوشش کروں گا عید سے پہلے اتنی دھاڑی لگا لوں جس سے بچوں کو عید کی

تیاری کروادوں۔“ شکیل اس سے کہتے ہوئے آنکھیں نہ ملا سکا، اس لئے کہہ کر فوراً اٹھ گیا، جواباً وہ خدا بہتری کی دعا مانگنے لگی۔

☆ عید کا چاند نظر آ گیا تھا، ہر طرف رونق کا سماں باندھ گیا، ہر کوئی عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا، کلثوم صحن میں دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی، بچے صحن میں کھیلتے ہوئے عید پر پہننے والے کپڑوں پر ڈنکس کر رہے تھے، جوان کے خیال میں ان کے ابا ساتھ لے کر آئیں گے، کلثوم معصوم چہروں پر پھوٹی مسکراہٹ کو بغور دیکھ رہی تھی ساتھ سوچ رہی تھی، کیا ہوگا جب بچے شکیل کے خالی ہاتھ دیکھیں گے، وہ بھی کچھ نہ کر سکی، ان کے لئے نوراں سے اس نے کہا بھی تھا اس کے لئے کوئی کام ڈھونڈ دے، پر اس نے بھی ابھی تک کچھ نہ بتایا تھا، رات کے بارہ بج گئے، شکیل کا کچھ اتنا پتا نہ تھا اتنی دیر تو اس نے کبھی نہیں کی تھی، کلثوم کو فکر ہونے لگی، بچے نیند سے جھوم رہے تھے، پر عید پر پہننے والی چیزوں نے انہیں جا رکھا تھا، کہ کب چیزیں آئیں اور وہ انہیں دیکھ کر اطمینان سے سو جائیں، کلثوم بے چینی سے ٹپٹپٹ لگی، گھڑی گھڑی دروازے پر سے پردہ ہٹا کر گلی میں جھانکتی پر وہاں شکیل کو نہ دیکھ کر دل اور ہولتا، رات کے دو بجے شکیل گھر میں داخل ہوا، اسے دیکھ کر کلثوم کی سانس میں سانس آئی۔

”یہ کوئی وقت ہے شکیل! تیرے گھر آنے کا جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی میری۔“ اس کے لہجے سے فکر عیاں تھی جسے شکیل نے واضح محسوس کیا، شکیل اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا، وہ کہہ کر جلدی سے اس کے لئے پانی لینے چلی گئی اور جب آئی تو دیکھ کر چونک گئی، بچے نجانے کب کمرے سے نکل آئے تھے جبکہ وہ ان کو سنانے کے لئے لٹا کر آئی تھی اور اس سے زیادہ حیرت کا جھٹکا بچوں کے ہاتھ میں عید کے کپڑے جوتے اور مختلف سامان دیکھ کر ہوئی۔

”شکیل! یہ سب کہاں سے اتنے پیسے آئے تیرے“

پاس.....؟“ اس نے شکیل کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
”چلو بچو! اپنا اپنا سامان سمیٹو اور جا کر سو جاؤ صبح پھر جلدی اٹھنا بھی ہے۔“ شکیل نے فی الحال کلثوم کا جواب نہ دیا۔

”نہیں ابا! ابھی نہیں۔“ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔
”سنا نہیں تم لوگوں نے کیا کہہ رہے ہیں تمہارے ابا، جا کر سوور نہ لگاتی ہوں دو ہاتھ۔“ کلثوم نے بچوں کے اڑ جانے پر سختی سے کہا تو وہ لوگ شرافت سے اٹھ گئے۔ ان کے جاتے ہی کلثوم، شکیل کے برابر چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی اور ایک نظر چیزوں پر ڈالی، جس میں راشن بھی شامل تھا، اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی اتنا سب لینے کے لئے اس کے پاس آخر پیسے آئے کہاں سے۔
”اب بتا مجھے آخر تیرے پاس اتنے پیسے آئے کہاں سے.....؟“

”کلثوم اب سمجھ ہمارا مشکل وقت ٹل گیا۔“ شکیل نے کہتے ہوئے پانی کا گلاس حلق میں اٹھایا اور اس ایک وقفے میں کلثوم کی بے چینی مزید بڑھنے لگی، شکیل نے پانی پینے کے بعد اسٹیل کا گلاس چار پائی کے نیچے رکھا اور بات کو آگے بڑھایا۔

”آج صبح جس گھر میں مجھے مزدوری ملی وہاں اس گھر کی بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا، کیا میں اس کے پارلر کے باہر چوکیداری کروں گا، ساتھ چودہ ہزار مہینہ کی تنخواہ کا کہا، تو میں نے ایک منٹ نہ لگایا منع کرنے میں انہوں نے مجھے ایک مہینے کا ایڈوانس بھی دے دیا، بس پھر سارا دن ادھر ادھر مزدوری کرنے کے بعد مغرب کے بعد میں سیدھا بازار چلا گیا، وہاں سے گھر کے لئے راشن لیا اور پھر بچوں اور تمہارے لئے کپڑے لئے، اس لئے آنے میں دیر بھی ہو گئی تو یہ دیکھ اور بتا تجھے یہ سوٹ اور چوڑیاں کیسی لگیں.....؟“ شکیل نے تفصیل بتاتے ہوئے شاہر میں سے ایک جھلملاتا ہوا لال جوڑا نکالا، ساتھ ہم رنگ چوڑیاں بھی، کلثوم کے یہ دیکھ کر

چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔
”بتا کیسا لگا تجھے پسند آیا.....؟“ شکیل نے اشتیاق سے پوچھا۔
”بہت خوبصورت ہے۔“ اس نے ریشمی جوڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہاں پر تجھ سے زیادہ نہیں۔“ شکیل نے اسے چھیڑا تو وہ جزبزی ہو گئی۔
”اچھا خیر چھوڑ یہ بتا سارے پیسے خرچ کر دیئے یا کچھ بچایا بھی ہے.....؟“ کلثوم نے فوراً بات بدلی۔
”تو کیوں فکر کرتی ہے یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔“ شکیل نے اسے تسلی دی۔
”کیسی باتیں کر رہا ہے، فکر تو ہوتی ہے نا اور تیرا کیا پتہ تو نے سارے پیسے خرچ کر دیئے ہوں۔“

”اوہو..... یہ کیا فکریں لے کر بیٹھ گئی ہے خوشی کا موقع ہے کچھ اچھی بات کر۔“ شکیل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔
”کیا ہوا کدھر چل دی.....؟“ شکیل کو حیرت ہوئی۔
”پہلے تجھے کھانا ڈال دوں باتیں تو ہوتی رہیں گی اور پھر شکرانے کے نفل بھی تو ادا کرنے ہیں، میرے مالک نے بڑا کرم کیا ہے ہم پر۔“ اس کی سنجیدگی سے کہی ہوئی بات پر شکیل اسے حیرت سے تنگ رہا تھا۔

”کتنا بدل گئی ہے تو کلثوم اور میں شکر ادا کرتا ہوں اس مالک کا جس نے تجھ میں اتنا اچھا بدلاؤ پیدا کیا۔“ شکیل مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی اندر کی طرف پلٹ گئی یہ سوچتے ہوئے۔

”ٹھیک ہی کہا شکیل تو نے اس مالک کا بڑا کرم ہے جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اس نے تو لازوال نعمتیں عطا کی ہیں پر میں ہی ناشکری کرتی آئی، لیکن اب اس کے آگے سجدہ کرنا ہے اور اس کا شکر ادا کرنا ہے۔“ یہ سوچتے ہوئے اس نے وضو کے لئے نلکا کھول دیا تھا۔ یہ عید ان کے لئے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئی تھی۔

☆

سافلی سرائے اور سکوت

شان کے سوال پر وہ چند لمحے خاموشی کے بعد دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
”تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”اگر آپ اس کے ساتھ وفادار ہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ زیادہ عرصے تک مزید رہ پائیں گے۔“ شان کے لہجے میں ہلکا سا طنز نمایاں تھا۔

”وہ ایک سہیل لڑکی ہے اور آپ کی دنیا اس تک محدود نہیں رہی ہے مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ اس انتہا کے لبرل اور چمکتے دھندلے ماحول میں کس طرح ایڈجسٹ ہوئے ہیں۔“ شان کے لہجے میں اب ناگواری کا عنصر تھا۔
”پہلی بات تو یہ کہ تم سب نے مل کر مجھے اس فیلڈ میں جانے کے لیے فورس کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ صرف ذمہ داری پوری طرح نبھانے کے لیے مجھے اس ماحول کا حصہ بننا پڑتا ہے میں جانتا ہوں وہ بالکل الگ دنیا ہے مگر مصنوعی۔ میری ایڈجسٹمنٹ بس کچھ وقت کے لیے اس دنیا میں ہوتی ہے اور تیسری اور آخری بات یہ کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے دوبارہ اس ”سہیل لڑکی“ کا ذکر درمیان میں مت لانا۔“ شیٹ کے سنجیدہ لہجے پر شان نے بغور اسے دیکھا تھا۔



اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنی طرف متوجہ ہوتے عاطف کو دیکھا تھا۔

”تشریف لے آئیں آپ اپنی ضد میں کلاس کا تو بایکاٹ کر رکھا ہے آپ نے۔“ مسکراتی نظروں سے اس نے سارہ کے بہت سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا جو کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔
”مجھے نہیں سمجھ آتا میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں سارا! تمہاری ناراضی بے وجہ ہے۔“ وہ زچ ہو کر بولا تھا۔



”میں ناراض نہیں ہوں آپ سے آپ کی زندگی ہے اس میں کس کو شامل کرنا ہے یہ فیصلہ بھی آپ بہتر کر سکتے ہیں مجھے تو بس اس بات کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ آپ جیسا اچھا انسان ایک ایسے دل سے محروم ہی رہے گا جسے آپ کی کوئی خامی کوئی برائی کبھی نظر نہیں آ سکتی مگر مجھے امید ہے کہ آپ اپنی شریک سفر کے ساتھ اچھی زندگی گزاریں گے..... کسی بھی سنگین غلطی کے باوجود“۔ اس کے مدھم گہرے لہجے پر عاطف کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ آپ ہمیں کچھ دن کا گپ دے دیں، نینب کی والدہ بیمار ہیں اس دوران ہم پریکٹس کرتے رہیں گے۔“

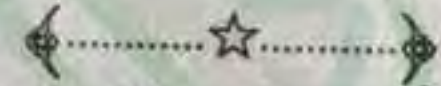
”کیسی طبیعت ہے اب نینب کی والدہ کی؟“ عاطف نے پوچھا تھا۔

”وہ ہارٹ پسٹنٹ ہیں ابھی ان کی طبیعت بہتر نہیں ہے انشاء اللہ کچھ دن میں بہتر ہو جائیں گی وہ“۔ بولتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر نینب کے آنے پر کلاسز اشارت کریں گے مگر اس سے کہہ دینا کوشش کرے کہ پریکٹس نہ رکے“۔ عاطف کی ہدایت پر وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی سمت بڑھی مگر پھر یکدم ہی رک کر پلٹی تھی۔

”میں اس گھر میں رہوں یا نہ رہوں مگر میں نے ٹھان لیا ہے کہ نینب کو اسی گھر میں آپ کے خاندان کے درمیان ہمیشہ کے لیے لاؤں گی“۔ اس کے اچانک سنجیدگی سے یہ کہنے پر عاطف خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس کے لیے آپ جیسا کوئی دوسرا تو نہیں ہو سکتا مگر اس گھر میں بہت اچھے انسانوں کی کمی نہیں ہے“۔ بولتے ہوئے سارہ نے بغور اسے دیکھا تھا جس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا کچھ بھی کہے بغیر وہ مکمل کمپیوٹر کی روشن اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔



کچھ چونک کر رکتے ہوئے اس نے ڈرائنگ روم میں جھانکا تھا جہاں شان جو توں سمیت صوفے پر دراز چھت پر لٹکے روشن فانوس کو تنک رہا تھا۔

”کس سوچ میں گم ہو لگتا ہے وہاں اچھا وقت نہیں گزرا“۔ سارہ کی مسکراتی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا تم واپس کب آئے ذرا بتاؤ مجھے کہ وہاں کتنی خواتین فریفتہ ہوئی ہیں تم پر؟“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر جواباً اس کی خاموش سنجیدہ نظروں پر وہ الجھی تھی۔

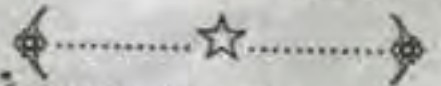
”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہ دیکھ رہا ہوں کہ کیا واقعی تم دنیا کی احمق ترین لڑکی ہو“۔ شان کے عجیب سے لہجے پر وہ دنگ ہوئی تھی۔

”یہ کیوں کہہ رہے ہو تم؟“

”تمہیں یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا“۔ بولتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ گیا تھا۔

”مجھ سے کھل کر بات کیے بغیر تم یہاں سے نہیں جاسکتے“۔ اسے روکتے ہوئے وہ قطعی لہجے میں بولی تھی۔



گیٹ لاک کرنے کے بعد اندر آتے ہوئے وہ چونک اٹھا تھا لاؤنج میں موجود سارہ اپنی جگہ سے اٹھتی مکمل اس کی طرف متوجہ تھی جو اسے نظر انداز کرتا لاؤنج سے گزرتا چلا گیا تھا دوسری جانب وہ جو سلکتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی ایک فیصلہ کرتی تیز قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے ہی کچن کی طرف گئی تھی۔ عقب میں اس کی موجودگی کا یقین ہونے کے باوجود شیٹ نے بہت اطمینان کے ساتھ پانی کا گلاس ختم کیا تھا اور پھر اس کی سمت پلٹا تھا جو شعلہ بار

نظروں سے اسے دیکھتی مقابل آرہی تھی۔

”اب تک کتنی تعداد ہو چکی ہے ان پرستاروں کی جو تمہاری قربت کے لیے بے قرار ہیں؟“ اس کے زہر خند لہجے پر بس ایک پل کے لیے شیٹ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

”ان پرستاروں میں کیا تم بھی شامل ہونا چاہتی ہو؟“ سرد لہجے میں پوچھتا وہ جھپتی نگاہوں سے اس کے آگ کی طرح تپتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”راستے میں اگر کوئی چمکتی چیز پڑی ہو تو کئی لوگ اسے دیکھنے کے لیے رک بھی جاتے ہیں اور ان کی تعداد و شمار یاد کرنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس“۔ وہ تلخ لہجے میں مزید بولا تھا۔

”اس راستے تک خود پہنچے ہو تم اپنی نمائش کے لیے“۔ وہ کاٹ دار لہجے میں بولی تھی۔

”اور تب تک وہاں پڑا رہوں گا جب تک تم اپنی زبان سے اس راستے سے واپس آنے کے لیے نہیں کہو گی“۔

بچنے لہجے میں بولتا وہ اس کے سامنے سے ہٹ رہا تھا جب سارہ نے سرعت سے اسے روکا تھا جبکہ وہ بھی اسی سرعت سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ ہٹا گیا تھا۔

”جس پر تھوک دیا جائے اس سے اپنے لئے فیصلے نہیں مانگے جاتے شیٹ شاہنواز! تمہیں عیاشیوں سے روک کر میں اپنی ذات پر مزید کسی الزام کی سیاہی نہیں لپ سکتی تھی“۔ وہ انگارے چباتی بولی تھی۔

”مجھے عیاشیوں کا طعنہ دوبارہ مت دینا“۔ وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ بولا تھا۔

”کیوں..... برا لگ رہا ہے تمہیں؟“ وہ تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”اس وقت کیسا لگ رہا تھا جب وہ عورت تمہیں آفر کر رہی تھی کس چیز نے روک لئے تھے تمہارے قدم؟“ اس کا لہجہ زہر سے تر تھا۔

”نہیں رکتے میرے قدم اگر اس عورت کی جگہ تم ہوتیں“۔ وہ سرد لہجے میں اسے بھڑکتی آگ کے شعلوں میں دھکیل گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کا ہاتھ اٹھا ہوش تب آیا جب وہ سرعت سے اس کا ہاتھ اپنے چہرے تک پہنچنے سے پہلے ہی روک چکا تھا۔

”کیوں برداشت نہیں ہوا؟“ اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں جکڑے وہ اس کی خونخوار نگاہوں میں دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری زبان کے نشتر نہیں روک سکتا مگر ہاتھ روکنے کا حق ہے مجھے“۔

”ہاتھ چھوڑو میرا.....“ غصے کی شدت سے کانپتی وہ غرائی تھی۔

”میرا ہاتھ لگانا تم سے برداشت نہیں ہوتا مجھ سے پوچھو کس طرح میں نے برداشت کیا تھا جب تمہارے نام نہاد

عاشق بھائی نے میری نظروں کے سامنے تمہیں تمہارے چہرے کو چھوا تھا“۔ سرخ چہرے کے ساتھ بول رہا تھا۔

”میرے روپے لیتے ہوئے تمہیں شرم آتی ہے مگر اس کے دیئے ہوئے روپے تم اپنے پاس سنبھال کر رکھتی ہو مجھ

سے کوئی فرمائش کرتے ہوئے تمہاری زبان رکتی تھی مگر وہ بغیر کہے تمہاری ہر فرمائش پوری کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے..... کیوں؟“ شدید اشتعال میں شیٹ نے کچھ اس طرح اس کا ہاتھ چھوڑا تھا کہ وہ لٹھے کی مانند سفید چہرے کے ساتھ لڑکھڑا کر کاؤنٹر سے جا لکرائی تھی۔

”تمہارا اعتبار رکھو دینے کے بعد مجھے اب موت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے“۔ دھندلائی آنکھوں کے ساتھ وہ کانپتی آواز میں بولی تھی دوسری جانب اس کے خطرناک ارادوں کو بھانپتے ہی شیٹ برق رفتاری سے اس تک پہنچا تھا اور اس کی مزاحمت کے باوجود چند سیکنڈ میں ہی تیز دھار چھری اپنے قبضے میں لے کر دور پھینک دی تھی۔

”اگر دوبارہ تم نے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ نقصان میں اپنے ہاتھوں سے خود کو پہنچاؤں گا“ سناتم نے۔ ”شدید غصیلے انداز میں وہ اسے وارن کر رہا تھا جو یکدم پلٹ کر بھاگتی ہوئی کچن سے نکل گئی تھی۔

شیث کو کچھ وقت لگا تھا اپنے خطا ہو جانے والے اوسان پر قابو پانے میں، گہری سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ رک کر شان کی طرف متوجہ ہوا تھا جو کچھ شرمندگی اور کچھ سبے تاثرات چہرے پر سجائے قریب آ رہا تھا۔

”مجھے آپ سے بس یہ کہنا ہے کہ مجھے بالکل افسوس نہیں ہے کہ میں سارہ سے کچھ نہیں چھپا سکا تھا، ویسے بھی اس کی طرح اب میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ اس فیلڈ سے کوئی تعلق رکھیں۔“ خفت زدہ نظروں سے شیث کو دیکھتے ہوئے وہ ڈھٹائی سے بولا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر اسے جا کر یہ بھی بتا دینا کہ میں آج اور اسی وقت خود کو ہمیشہ کے لئے اس فیلڈ سے الگ کر چکا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا تھا۔

”زبردست فیصلہ ہے آپ کا میں ابھی جا کر سارہ کو بھی یہ خوشخبری سنا دوں؟“ خوشی سے کھلتے چہرے کے ساتھ شان بے تاب ہوا تھا۔

”ضرور سناتا اسے یہ خوشخبری اتنی جلدی بھی کس بات کی ہے۔“ بہت نرم لہجے میں شیث نے یہ کہا تھا اور اگلے ہی پل اس کا زوردار مکاشان کے چہرے سے ٹکراتا اسے زمین بوس کر گیا تھا۔



گلاس ڈور کھولتے ہوئے اس نے رک کر ریوالونگ چیئر پر براجمان شخص کے متوجہ ہونے کا انتظار کیا تھا۔

”آؤ شیث! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ حسن حیات استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔

”آپ کا انتظار میرے لیے ایک اعزاز ہے۔“ وسیع ٹیبل کے گرد بیٹھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”مجھے آسمان پر مت پہنچاؤ ورنہ میں جانتا ہوں کہ میری کسی بات پر تم سوچنے کی زحمت بھی نہیں کر رہے۔“ حسن حیات شکایتی لہجے میں بولے تھے۔

”میں جانتا ہوں آپ مجھ سے کیا امید رکھتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا مشکور بھی ہوں مگر آپ کو یاد ہو گا کہ کمپنی کی دوسری پروڈکٹ کی پروموشن کے لیے حامی بھرتے ہوئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں مزید اب اس سلسلے کو آگے جاری نہیں رکھ سکوں گا۔“ وہ یاد دلار ہوا تھا۔

”اور میں نے اُس وقت بھی تم سے کہا تھا کہ اپنے فیصلے پر اچھی طرح سوچ بچار کرو۔“ حسن حیات نے کہا تھا۔

”میں نے اُس وقت بھی بہت سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ سنایا تھا۔“

”شیث! تم جانتے ہو مجھ سمیت ساری آرگنائزیشن تمہارے فیصلے سے کس قدر ناخوش ہے، کوئی تمہیں الگ نہیں کرنا چاہتا، اتنے کم عرصے میں تم نے نا صرف کمپنی میں بلکہ اس سے منسلک ہر شخص کے دل میں اہم اور محکم جگہ بنالی ہے اس کمپنی کو اور بہت سے نئے چہرے مل جائیں گے یہاں تک کہ Celebrities بھی مگر ہماری براڈ زکوتم جیسے Brand Ambassador کی ضرورت ہے، تم ایک Well connected شخص ہو، کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک Brand Ambassador کی ویلوی کیا ہوتی ہے؟“ حسن حیات اسے کونٹینس کرنے کی کوشش میں تھے۔

”میرے لیے سب سے اہم میری اپنی ویلوز ہیں، میری زندگی نے مجھ پر کچھ اصول لاگو کر رکھے ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں، کچھ حدود ہیں جن کو کراس کرنے کی اجازت میں خود کو کبھی نہیں دے سکتا، اس فیلڈ کی طرف آتے ہوئے جس طرح میری زندگی متاثر ہوئی ہے میں اب مزید اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ اس کے گہرے سنجیدہ لہجے پر حسن حیات چند لمحوں تک بغور اسے دیکھتے رہے تھے۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گے تمہاری زندگی کیسی ہے؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”بہت حد تک سر پھری۔“ شیث نے برجستہ کہا تھا۔

”اندازہ ہو رہا ہے تمہاری ڈھٹائی سے بخوبی۔“ حسن حیات نے خشکی نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو گھورا تھا۔

”میں واقعی اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہتا ہوں اور اس سے مطمئن بھی ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

”مجھے تمہارا کوئی فیصلہ نہیں سننا، مجھے اب شمس سے ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔“

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ ہو گا تو ان سے ضرور رابطہ کریں۔“ شیث نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”اب مجھے اجازت ہے؟ آفس سے کچھ ٹائم لے کر میں یہاں آیا تھا۔“

”ہاں ضرور۔“

”شیث! ان کی پکار پر وہ رکا تھا۔

”تمہارے انکار کے باوجود کمپنی کی آفر اپنی جگہ قائم رہے گی، بہت وقت ہے تمہارے پاس اپنی زندگی سے مشورہ کرنے اور اسے راضی کرنے کے لئے ویسے بھی زندگی آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی بھی تمہیں آگے بڑھنے سے نہیں روکے گی بلکہ تمہارے ہمقدم ہی آگے بڑھے گی۔“ حسن حیات نے مسکراتے ہوئے بڑی گہری بات کی تھی جو اب وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خدا حافظ کہتا آفس سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

حیران نظروں سے شان کے چہرے کو دیکھتے وہ اندر داخل ہوئے تھے اس کی آنکھ کے قریب کافی حصہ سوچ کر نیلا پڑا ہوا تھا۔

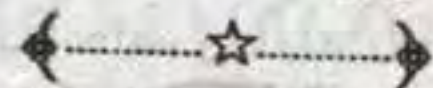
”کس کی کارستانی ہے یہ؟ کس سے جھگڑا کیا تم نے؟“ شمس نے غصیلی نظروں سے اس کے لٹکے چہرے کو گھورا تھا جبکہ شان نے کیونکہ تو نظروں سے اسے گھورا تھا جو شمس کے پیچھے ہی اندر آیا تھا۔

”میں نے کیا پوچھا ہے تم سے؟“ شمس کے سوال دہرانے پر وہ اسی خاموشی سے پھر پتھلاؤنچ کی طرف چلا گیا تھا۔

”مجھے بھی کچھ نہیں بتا رہا ہے اب اس چہرے کے ساتھ چپ کر بیٹھے ہیں زبان بند رکھے۔“ پانی کے گلاس شیث اور پھر شمس کو دیتے ہوئے سدرہ بولی تھیں۔

”کس نے مارا ہے تمہیں بتاؤ ابھی جا کر اس کے ہاتھ توڑنا ہوں۔“ شیث نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”بہت شکریہ اس ہمدردی کا۔“ شان کھول ہی تو اٹھا تھا جبکہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے شیث نے پانی کا گلاس لمبوں سے لگا لیا تھا تب ہی وہاں مومو کی آمد ہو گئی تھی۔



”شان! تمہیں دیکھ کر لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔“ مومو کے چھیڑنے نے اسے مزید غضبناک کر دیا تھا۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر مومو کے پیچھے دوڑا تھا جو سرعت سے فلائیں بھرتی پہلے ہی بھاگ اٹھی تھی۔

”سارہ کہاں ہے؟“ لاؤنج سے نکلتے ہوئے شیٹ نے سنا تھا شمس پوچھ رہے تھے۔

”اس کی طبیعت صبح سے خراب ہے مگر وہ ایک ٹیبلٹ تک لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔“ اسے سدرہ کی آواز بھی بخوبی سنائی دے گئی تھی۔ ایک تشویش بھری نظر اس نے سارہ کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر ڈالی تھی اور پھر تیر قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا۔

سدرہ کی آواز پر اس نے بمشکل اپنی جلتی آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کے عقب میں ہی موجود شمس نے دنگ نظروں سے اس کے ہلدی کی طرح زرد پڑے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر خود ہی آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا جو توقع کے عین مطابق انگاروں کی طرح دھک رہی تھی۔

”پتا نہیں کن جھیلوں میں الجھی رہتی ہو تم“ صبح سے وہ اس حالت میں ہے اور تم نے مجھے ایک فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔“ شمس بری طرح سدرہ پر برسے تھے۔

”انہیں کچھ مت کہیں میں خود ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔“ نڈھال انداز میں بولتی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں ڈاکٹر کو گھر ہی بلوا لیتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں چاہتی ہوں اس طرح ہی میرے کچھ گناہ کم ہو جائیں۔“ اس کے کمزور مگر عجیب سے لہجے پر شمس اور سدرہ کے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔

”اچھا“ ابھی تو اٹھو ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ“ میں نے تمہارا فیورٹ دلیہ بنایا ہے وہ کھا کر ٹیبلٹ لینا ڈاکٹر کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“ نرم لہجے میں سدرہ اس کا ہاتھ پکڑے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھیں جبکہ شمس انتہائی پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جو انہیں کہیں سے بھی نارمل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے شیٹ میں ہمت نہیں تھی کہ دوبارہ اسے نظر بھر کر دیکھ لے سامنے ہی وہ کھلائے چہرے کے ساتھ موجود تھی اس کے نقوش پر بکھری مردنی سی چھاپ پر شیٹ کے دل و دماغ منتشر ہونے لگے تھے غیر معمولی تاؤ محسوس سب ہی کر رہے تھے مگر خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے چور نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے جو سر جھکائے باؤل میں موجود دلیے میں بس چچہ دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی۔

”میں ہاسٹل میں شفٹ ہونا چاہتی ہوں جلد از جلد۔“ یکدم ہی اس کی ابھرتی سرد آواز نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ شیٹ کے علاوہ سب کی نظریں اس پر ساکت تھیں مگر وہ بس شمس کی دنگ نظروں میں دیکھ رہی تھی۔

”آپ میرے ہاسٹل میں رہنے کا انتظام کروا سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ یہ کام میرے لئے بھی مشکل نہیں ہے۔“

”تمہارا بخار کیا دماغ پر چڑھ گیا ہے جو یہ فضول بات کر رہی ہو۔“ شدید بے یقینی کے ساتھ شمس نے اسے جیسے گھر کا تھا۔

”بخار تو اب اتر رہا ہے مجھے اب کسی صورت اس گھر میں نہیں رکنا ہے۔“ فیصلہ کن لہجے میں بولتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ ایک تیز نظر شمس نے اس پر ڈالی تھی جو گلاس پر نظر جمائے بالکل ساکت بیٹھا تھا اس پر سے نظر ہٹاتے شمس وقت ضائع کیے بغیر سارہ کے پیچھے ہی گئے تھے۔

بیڈ کے کنارے بیٹھی وہ سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جو سدرہ کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”مجھے سے کوئی سوال مت کیجیے گا خدا کے لئے۔“ لرزتی آواز میں وہ بولی تھی مگر اندر بھڑکتے آتش فشاں نے اسے ہتھے سے اکھاڑنا شروع کر دیا تھا۔

”تم اس گھر کو چھوڑ جانا چاہتی ہو؟ مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟“ سدرہ کی آواز بھرانے لگی۔

”ہاں..... میں جانا چاہتی ہوں اس گھر سے اور کیوں نہ جاؤں؟ یہاں رک کر اپنے زندہ درگور ہونے کا انتظار کروں؟“ حلق کے بل چیختی وہ اٹھی تھی۔

”اس گھر میں ختم کر دیا ہے میں نے خود کو یاد دیا ہے میں بھول چکی ہوں میری حقیقت کیا تھی یہ میں نہیں ہوں یہ میں نہیں ہوں۔“ بیجانی کیفیت میں وہ چیخ رہی تھی سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا مگر شمس نے سرعت سے آگے بڑھ کر اس کے بکھرتے ٹوٹے وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سدرہ بے دم ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ دروازے کے پاس ساکت کھڑے شاہ رخ نے باہر موجود شیٹ کے چہرے پر لہراتے تاریک سائے نمایاں طور پر دیکھے تھے وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اسٹپس طے کرنا اوپر جا رہا تھا کہ وہاں رک کر کمرے سے ابھرتی گھٹی گھٹی سسکیوں کو سننا انتہائی اذیت ناک تھا بالکل تلواری کی دھار پر برہنہ پاؤں چلنے کے مترادف۔

خاموشی کے ساتھ عاطف بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا جو ٹیبل کی سطح پر اپنی سرخ اور متورم آنکھیں جمائے ساکت بیٹھا تھا مگر اس کے چہرے پر گردش کرتا اضطراب اندرونی خلفشار کی نشاندہی کر رہا تھا۔

”ایسی تکلیف کیوں دیتے ہو اسے جس کی اذیت خود تمہاری اپنی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔“ عاطف کے سخت لہجے پر اس نے بھیگی سنہری پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”وہ نہیں رکے گی چلی جائے گی میں جانتا ہوں وہ اب نہیں رکے گی۔“ وہ مدہم اضطرابی لہجے میں بول اٹھا تھا۔

”جس طرح اس کے ساتھ تم نے بے اعتنائی کے مظاہرے کیے ہیں اس کے بعد بھی تم چاہتے ہو کہ وہ یہاں رکے گی؟“ عاطف نے ناگواری سے اسے گھر کا تھا۔

”جب وہ تمہاری نظروں کے سامنے رہ کر بھی تمہارا دل اپنی طرف سے صاف نہیں کر سکی تو جانے دوائے کیا ہو جائے گا اس کے جانے پر بھی۔“

”میں مر جاؤں گا۔“ وہ مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”کوئی کسی کے لئے نہ مرتا ہو اس دنیا میں مگر..... سارہ کے لیے مر سکتا ہے شیٹ۔“ اس کی بھاری لرزتی آواز میں کچھ تھا جو عاطف نے دنگ نظروں سے اس کے جھکے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔

کروٹ بدلتے ہوئے اس کے سوکھے خشک ہونٹوں سے کراہیں بلند ہوئی تھیں سر سے پیر تک اسے اپنا وجود شعلوں میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھٹنے والے آتش فشاں کا لاوا جیسے مساموں سے پھوٹا اسے شدت کی پیش سے بے حال کر رہا تھا کسی کروٹ سکون نہیں تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھتے جارہے تھے۔ بمشکل جلتی آنکھیں کھول کر اس نے اپنے غڈ حال وجود کو حرکت دینا چاہی تھی بالآخر ہمت مجتمع کرنی وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اس میں ہی اس کی سانس دھونکی کی طرح چلنے کا تھا انتہائی بے بسی کے ساتھ اس کے آنسو رواں ہو گئے تھے جب اس نے سائیڈ ٹیبل سے ہاتھ بڑھا کر پانی کی بوتل اٹھانی چاہی تھی جو اس کے بے جان کانٹے ہاتھ کی بے ترتیبی سے گرتی دور چلی گئی تھی اسے یاد آیا تھا کہ وہ بوتل تو آدھے گھنٹے میں اس نے خالی کر دی تھی جانے اندر کیسی آگ جل رہی تھی کہ اتنا پانی پینے کے بعد بھی

رواڈ انجسٹ [87] ستمبر 2012ء

رواڈ انجسٹ [86] ستمبر 2012ء

بھڑکتی جا رہی تھی۔ بے ترتیب کھلے بال ایک ہاتھ سے سمیٹ کر دائیں شانے پر ڈالتے ہوئے اس نے دوپٹہ شانوں کے گرد لپیٹا تھا۔

بیخ بستہ ماربل کافرش اس کے چلتے نرم ٹکڑوں میں چبھتا چلا گیا تھا۔ نڈھال قدموں کے ساتھ دروازہ کھولتی وہ باہر آئی تھی مگر اسٹیرز کی سمت نظر جاتے ہی اس کے قدم رکے تھے۔ ساکت نظروں سے اسے دیکھتا وہ اسٹیپ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اگلے ہی بل سرعت سے اس کی طرف گیا تھا جو فوراً ہی پلٹ کر کمرے میں گئی تھی مگر دروازہ مکمل بند کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

”سارہ!“ ایک کراہ کے ساتھ وہ اسے پکار گیا تھا مگر دروازے میں پھنسا ہوا ہاتھ نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی دوسری جانب وہ پوری قوت دروازہ بند کر دینے میں استعمال کر رہی تھی۔

”تم صرف میری بات سن لو۔“ وہ مدھم آواز میں التجا کر رہا تھا مگر سارہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجبوراً شیٹ کو وہ کام کرنا پڑا تھا جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک ہی جھکے میں اس نے دروازہ کھول دیا تھا بغیر کوئی آواز نکالے وہ منہ کے بل جا گری تھی۔ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتی وہ دیوار کی جانب ہسکتی چلی گئی تھی۔

”چلے جاؤ یہاں سے ورنہ۔۔۔۔۔“ اس کی کانپتی آواز حلق میں ہی گھٹ گئی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ تختی سے اس کے منہ پر رکھ چکا تھا۔ سرخ مدھم روشنی میں وہ ساکت نظروں سے اس کے دزدیدہ تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔

”جانتی ہو تم یہاں سے جاتے ہوئے کیا کچھ ساتھ لے جاؤ گی؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ پوچھ رہا تھا۔ ”میری دھڑکتیں میری روح اور سانس لینے کا حق بھی۔۔۔۔۔ بتاؤ ان سب کے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گا؟ کیا تم چاہتی ہو میں ٹپ ٹپ کر مر جاؤں؟ ایسا چاہتی ہو تم؟ بولو۔۔۔۔۔“ جذبات کی شدت سے بچنی آواز میں وہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر ہی جمائے بولنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

”تم دوبارہ یہاں سے جانے کی بات نہیں کرو گی گردن ہلا کر جواب دو سارہ! میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ اس کے لہجے کی لرزش پر وہ جو ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی فوراً ہی نفی میں گردن کو حرکت دے گئی تھی دوسری جانب وہ چند لمحوں تک اس کی پھیلی آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا اس کے بعد وہ نہیں جانتا اسے کیا ہوا تھا انگڑوں کی طرح دھکتے لیوں پر رکھے اپنے جھلٹے ہاتھ کی پشت پر وہ لرزتے ہونٹ رکھ چکا تھا اور سارہ کے دل کی دھڑکن ہی نہیں اس کی سانس بھی رک گئی تھی۔ ایک بار پھر اس کی ساکت نظروں میں دیکھنے کے بعد شیٹ نے دروازے کی سمت نظر ڈالتے ہوئے اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

”باہر کیوں جا رہی تھیں؟“ مدھم لہجے میں وہ اس سے پوچھ رہا تھا جس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی اس کے چہرے سے نظر ہٹائی وہ اپنا چہرہ پھیر گئی تھی۔ دوسری جانب شیٹ نے گردن موڑ کر فرش پر گری بوتل کو دیکھا تھا۔ ”میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔“ بولتے ہوئے وہ اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اس کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور دروازہ لاک کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”اسے واقعی یہاں سے چلے جانا چاہیے دو دن میں سب ٹریک پر آ جائیں سسے شان بیزاری سے سر جھٹکا بولا تھا۔“

”ٹریک سے اور پرے ہٹ جائے گا وہ بے چاری ہاسٹل گئی تو بڑے بھائی آسان زمین پر لے آئیں گے اور اگر اپنی پیچھو کے گھر گئی تو چھوٹے بھائی عاشر صاحب کو آسان پر چھوڑ آئیں گے۔“ سارہ نے کہا تھا۔

”چھوٹے بھائی تو میری سمجھ سے باہر ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے اور اپنے بارے میں سارہ اپنے کزن کو سب بتا چکی ہے۔“ مومونا گواری سے بولی تھی۔

”کیا بات کر رہی ہو سارہ نے بتا رکھا ہے عاشر بھائی کو کہ اس نے میرے بھائی کو اپنے جال میں پھانس رکھا ہے۔“ شاہ رخ شدید حیرانگی کے ساتھ بولا تھا۔

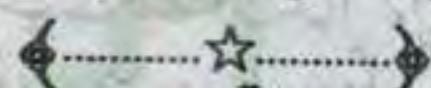
”سب کچھ اس نے کیا تمہارے بھائی کے ہاتھ میں تو جیسے فیڈر تھا۔“ مومونا نے جل کر کہا تھا۔

”میں تو بڑے بھائی کی طرف سے بہت زیادہ پریشان ہوں بالکل خاموش ہو گئے ہیں۔“ شان تشویش سے بولا تھا۔

”اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ سارہ کی ہی فکر میں مبتلا ہیں ویسے ایک میان میں دو ٹواریس ایڈجسٹ کیسے ہو گئیں میرے خیال میں اس کا سارا کریڈٹ سارہ کو جاتا ہے۔“ شاہ رخ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے تو سارہ کی ہی فکر ہے آخر وہ کتنا برداشت کرے گی اسے تو یہ گھر چھوڑنے کی بات اسی وقت کر دینی چاہیے تھی جب چھوٹے بھائی نے انکار کیا تھا۔“ مومونا نے تاسف سے کہا تھا۔

”اب یہ تم سارہ کے سامنے مت کہہ دینا۔“ شان نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔



تیز قدموں کے ساتھ مومونا کی طرف ہی بڑھ رہی تھی جو برآمدے میں حواس باختہ سی کھڑی تھیں۔

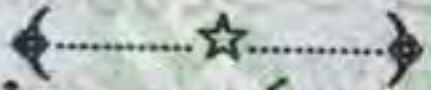
”مجھے معلوم ہی نہیں وہ کب گھر سے نکل گئی تھی شمس تو قیامت اٹھا دیں گے۔“ سدرہ کے انکشاف پر وہ حق دق رہ گئی تھی۔

”صبح میرے سامنے نینب کے گھر جانے کی بات کر رہی تھی۔“

”اور میں نے تمہارے ہی سامنے اسے سختی سے منع کر دیا تھا اس کی طبیعت کی وجہ سے۔“ سدرہ نے درمیان میں کہا تھا۔

”میرے پاس نینب کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔“

”میرے پاس بھی نہیں ہے مگر آپ پریشان مت ہوں میں ابھی چھوٹے بھائی کو فون کرتی ہوں وہ نینب کے گھر جا کر معلوم کریں گے۔“ مومونا کی تسلی کے باوجود سدرہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔



دور فلیٹس کی خستہ حال عمارتیں پھیلی تھیں جبکہ دائیں جانب اجاڑ خنجر زمین کا وسیع سلسلہ اس سڑک کے ساتھ تھا جس کے چوڑے پاٹ کے کنارے پر وہ دھیرے دھیرے نینب کے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس علاقے میں اب یہی ایک پرسکون جگہ رہ گئی تھی جب جب موقع ملتا وہ نینب کے ساتھ یہاں واک کرنے ضرور آتی تھی نینب کے گھر جانے کے لیے وہ شارٹ کٹ کے طور پر اس سڑک کو استعمال کرتی تھی۔

”پہلے مجھے لگتا تھا کہ دل کو مار کر زندگی گزارنا بھی کوئی زندگی ہوتی ہے مگر اب وقت کے ساتھ یہ سمجھ آ گیا ہے کہ

زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے ورنہ زندگی کی مار چٹنی سخت ہے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ دل کو مار لیا جائے۔“ تارکول کی چمکتی سطح پر نظر جمائے وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔ ایک بار پھر گھرے ہوتے سکوت سے گھبرا کر اس نے نینب کو دیکھا تھا جس کی پتھرائی آنکھیں دور ہوا سے اڑتی دھول پر جمی تھیں۔

”اپنی ذات کو بے وقعت کرنے سے بہتر ہے کہ راستہ بدل لو زندگی ہر بار وہ سب کچھ دامن میں نہیں ڈال سکتی

حالتِ دل کیسے بتائیں

تم میری زندگی ہو یہ تمہیں ہم بتائیں گے
کیا ہو تم میرے لیے کبھی ملو تو سمجھائیں گے

”رمشاء! کیا کر رہی ہو تم؟“ حنا نے رمشاء کے ہاتھ میں ڈائری دیکھتے ہوئے کہا۔



جس کی چاہت ہوتی ہے۔“ مدھم لہجے میں بولتے ہوئے اس نے رک کر زینب کو دیکھا تھا جس کے چہرے پر پھیلا سناٹا اطراف میں پھیلے سناٹے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ سارہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی جو شاید زمین آسمان کے درمیان متعلق تھی سارہ کے رکنے کا اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی ٹرانس میں وہ بے جان قدموں کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی ماحول پر طاری سکوت کو یکدم ہی ایک آواز نے توڑنا شروع کر دیا تھا۔ زینب کی پشت سے نظر ہٹا کر وہ پلٹی تھی دور سے اسے ایک بانیک بہت تیز رفتاری کے ساتھ قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر سائیڈ میں ہوتے ہوئے اس نے زینب کو پکارا تھا۔

”سڑک سے ہٹ جاؤ زینب! یہ سڑکیں کسی کی نہیں ہوتیں اور جس کی ہو جاتی ہیں اسے کبھی اپنے حصار سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتیں۔“ خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سنہری چہرہ لہرایا تھا۔ کچھ چونک کر اس نے قریب سے گزرتی بانیک کو دیکھا تھا جو واپسی کے لیے پلٹی زینب کے قریب یکدم رکی تھی اس شخص کے کریہہ چہرے کو پہچاننے میں جہاں سارہ کو دیر نہیں لگی تھی وہیں زینب دہشت میں گہری پتھر کی مورت بن چکی تھی۔ ساکت کھڑی سارہ نے اس شخص کے ہاتھ میں موجود کسی چیز کو دیکھا تھا۔

”زینب.....“ اس کی چیختی آواز پر زینب نے جیسے ہوش میں آ کر اپنی جگہ سے حرکت کی تھی مگر پھر بھی وہ زد میں آ گئی تھی اگلے ہی پل اس کی فلک شکاف چیخوں پر دہشت سے سارہ کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

”معیز.....“ حلق کے بل چلاتی وہ چیل کی طرح اس پر چبھتی تھی جو سفاکی کی انتہا کرتا بانیک اشارت کر رہا تھا۔ زینب کی بلبلائی آسمان تک جاتی چیخوں پر باگل ہوتی وہ معیز کے بھاگنے کی کوشش ناکام کر رہی تھی جب معیز کی ایک ہی ضرب پر سڑک پر وہ منہ کے بل گری تھی مگر بھوک شیرنی کی طرح اس بار وہ اس کے پیر کو دبوچ گئی تھی جو بانیک اشارت کر چکا تھا اگلے ہی پل وہ بانیک کے ساتھ ہی سڑک پر کھسکتی جا رہی تھی۔ معیز کی بوکھلاہٹ عروج پر تھی اپنے ارادوں میں وہ پہلے ہی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا اپنا پیر سارہ کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش میں وہ بانیک کا توازن قائم نہیں رکھ پا رہا تھا اگر اس کے پاس تیزاب کی ایک اور بوتل ہوتی تو وہ ضرور اسے سارہ پر انڈیل دیتا۔ اس بار سر پر لگتی بھاری ضرب نے اس کے زخمی و بے حال وجود کو بے جان کر دیا وہ حلق کے بل چیخ رہی تھی اس لیے نہیں کہ کھر دردی سڑک نے اسے لہو لہان کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ ایک گدھ اس کی گرفت سے نکل چکا تھا دوسری جانب اپنی کامیابی پر ہوتی معیز کی خوشی کا نور ہو چکی تھی کیونکہ بہت قریب اسے اپنی موت کھڑی دکھائی دے رہی تھی جانے کہاں سے نمودار ہوتی وہ کار سڑک کے درمیان اس طرح رکی تھی کہ بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا تھا کار کی چھت سے ٹکرا کر دوسری جانب گرنا اس کا وجود سڑک سے دو ٹوٹا اور اچھلتا ٹکراتا دور چلا گیا تھا۔ بمشکل سر اٹھا کر اس نے اپنی خون سے بھیکتی آنکھوں سے اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی تھی جو بلند آواز میں اس کا نام لیتا دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

”شیث.....“ سر سے پیر تک وہ پکار بنی اٹھنے کے قابل نہیں تھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا چلا گیا تھا۔

”شیث کی زندگی بھی تم پر قربان ہے۔“ اس کا نیم جاں وجود سینے میں چھپائے وہ تڑپ اٹھا تھا مگر سارہ کے حواس بس یہیں تک ساتھ دے سکے تھے۔

(جاری ہے)

ہوں۔“ سمیر نے بے قراری سے کہا۔
”سمیر! پلیز چھوڑ مجھے۔“

”سمیر پلیز! مجھ سے ایسا مذاق مت کرو۔“ رمشاء کی دھڑکن ایک دم سے تیز ہو گئی۔

”او کے! تو عملی مظاہرہ کر کے دکھاؤں؟“ سمیر نے شرارت سے کہا۔

”شٹ اپ..... ایک اور لفظ نہیں۔“ وہ سمیر سے ہاتھ چھڑا کے دور ہٹتی۔

”تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو، میرا کوئی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہو۔“ رمشاء نے غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے کہا۔

”واٹ؟ یہ کیا بکواس کر رہی ہو، میری محبت کو گالی مت دو رمشاء! اس سے پہلے میں واقعی میں کچھ کر بیٹھوں دفع ہو جاؤ۔“ سمیر نے پورے کمرے کی چیزوں کو تہس نہس کر دیا، رمشاء گھبرا کے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

”اونو..... یہ میں نے کیا کر دیا۔“ رمشاء نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”سمیر کو کتنا کچھ بول دیا میں نے۔ اے میرے اللہ! میں کیا کروں۔ کیوں خوشیاں مجھے راس نہیں آتیں۔ مجھے معاف کر دینا سمیر پلیز!“ رمشاء نے کہا اور وہ روتے روتے سو گئی۔

اس دن کے بعد سے سمیر کو چپ لگ گئی۔ رمشاء نے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے موقع نہیں دیا۔

☆.....☆.....☆

”سمیر! کہاں ہوتے ہو آج کل، نظر نہیں آتے ہو۔“ ممی نے پوچھا۔

”ممی! آپ نے ہی تو ذمے داری سوچی ہے، ماہین آپنی کی شادی کی کتنی تیاریاں باقی ہیں اور اس بار آپ لوگوں کو میں ایک سر پرانز دینے والا ہوں۔“ سمیر نے رمشاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی کون سا سر پرانز ہے؟“ علیزہ نے پوچھا۔

”میں لوگوں کی طرح نہیں ہوں کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔“ وہ رمشاء پر طنز کے تیراچھاٹا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اچانک ماہین کے مایوں والے دن اعظم صاحب آ گئے۔ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

”کہاں تھے تم؟ اعظم تمہیں گھر والوں کا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔“ بڑے پاپا نے غصے سے پوچھا۔

”بھائی صاحب! اپنے ناکرہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ اگر پچھلے دنوں سمیر مجھے نہیں ملتا تو شاید میں گھر کبھی نہ آتا۔“ انہوں نے سمیر کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر سمیر نے تو ہمیں کبھی نہیں بتایا۔“ بڑی ممی نے سمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے منع کیا تھا سمیر کو کہ گھر میں نہیں بتانا، وہ آج بھی ضد کر کے لایا ہے، بھابی میں شرمندہ تھا آپ سب کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔“ انہوں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”پاپا.....!“ رمشاء بھاگتے ہوئے اپنے پاپا کے گلے لگ گئی۔

”رمشاء! مجھے معاف کر دو میری بچی، سب سے زیادہ گناہ گار تو میں تمہارا ہوں۔“ رمشاء کے پاپا نے رمشاء کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”رمشاء! چپ ہو جاؤ۔“ رمشاء تو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”تم لڑکیوں کے پاس اتنے آنسو کہاں سے آتے ہیں، بس کر دو ورنہ ہمارا گھر بہہ جائے گا۔“ شایان کی بات پر سب مسکرا دیے۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا بھائی اتنا اکڑتا کیوں ہے، معافی تو مانگ رہی ہوں ناں میں اس سے۔“ جب سے رمشاء کے پاپا آئے تھے وہ ہر دم مسکراتی رہتی تھی۔

”ڈیر بھابی! غلطی ہی آپ نے ایسی کی ہے۔“

شایان نے رمشاء کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”واٹ..... بھابی.....؟“ رمشاء نے شایان کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی! بڑوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ماہین آپنی کے ساتھ ساتھ سمیر بھائی اور آپ کا نکاح کر دیا جائے، دیے کتنا مزہ آئے گا ناں، گھر میں دو دو شادیاں ہوں گی۔“ شایان مزے سے بولا۔

”بدتمیز یہاں تمہارا بھائی مان کے نہیں دے رہا اور تمہیں ہری ہری سوچ رہی ہے، کوئی آئیڈیا دو ناں۔“ رمشاء نے پوچھتے ہوئے کہا۔

”بہت آسمان ہے کوئی رمانس بھرا جملہ بول دو۔“ علیزہ نے بھی شرارت سے کہا۔

”تم لوگوں سے بات کرنا ہی بے کار ہے۔“ رمشاء نے شرما تے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

رمشاء کا رڈ رکھ کر جا ہی رہی تھی کہ سمیر نے پکڑ لیا۔
”کیوں آئی ہو یہاں پر تم؟“ سمیر نے رمشاء کو حیرت سے اپنے کمرے میں دیکھ کر پوچھا۔

”سمیر وہ.....“ رمشاء کی بولتی بند ہو گئی۔
”کیا..... پھر کوئی الزام لگانا ہے۔“ سمیر نے نروس ہوتی رمشاء کو دیکھ کر کہا۔

”وہ..... میں سوری کرنے آئی تھی، پلیز اس دن میں وہ سب نہیں کہنے والی تھی پر پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔“ رمشاء نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ سمیر نے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔
”وہ..... وہ سوری کا کارڈ ہے۔“ رمشاء نے ڈرتے ہوئے کہا۔ سمیر نے کارڈ پڑھ کے رمشاء کی طرف دیکھا۔

”او کے! تم جاؤ۔“ سمیر نے رمشاء سے کہا۔
”نہیں..... نہیں میں نہیں جاؤں گی، جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔“ یہ کہتے ہوئے رمشاء، سمیر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سمیر نے حیرانگی سے رمشاء کا یہ

انداز دیکھا۔
”میں خود نہیں جانتا کہ میں تمہیں کب سے چاہتا چلا آ رہا ہوں، شاید تب سے جب خود مجھے اس کے معنی بھی نہیں پتہ تھے لیکن جب تم نے میری محبت کو.....“ سمیر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پلیز سمیر!“ رمشاء ہاتھ جوڑ کر رودی۔ سمیر سے رمشاء کا رونانہ دیکھا گیا۔ سمیر نے رمشاء کے ہاتھ پکڑ کر اس پر اپنے لب رکھ دیے۔ رمشاء گھبرا کے دور ہٹتی۔

”کیا ہوا؟“ سمیر نے گھبرائی، شرمائی سی رمشاء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کیا خیال ہے، کل ماہین آپنی کی شادی میں ہمارا نکاح ہے، ڈائریکٹ رخصتی نہ کرالوں۔“ سمیر نے شرارت سے رمشاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سمیر تم مجھ پر بہت غصہ بھی کرتے ہو۔“ رمشاء نے مسلسل خود پر جی سمیر کی نظروں سے گھبرا کر کہا۔
”اچھا جی اب نہیں کروں گا۔“ سمیر نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”اور لڑنا بھی نہیں۔“ رمشاء نے کہا۔
”یا اللہ! یہ لڑکی اب بھی بے یقین ہے۔“ سمیر نے والہانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رمشاء نے سمیر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو فوراً اپنی نگاہ جھکا گئی جہاں چاہت کا ایک جہاں آباد تھا۔ سمیر نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔
”کیوں جھکا لی تم نے اپنی نگاہ جاناں ان آنکھوں میں دیکھنے کا حق صرف تمہیں ہے تو پھر کیوں نگاہ جھکا لی۔“ سمیر نے شرمائی رمشاء کو دیکھ کر کہا۔ سمیر کے اس طرح بولنے پر رمشاء کا سر مزید جھک گیا۔

رمشاء دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی جس نے اسے اس کی ساری خوشیوں کو واپس کر دیا تھا اور سوچ رہی تھی کہ ہم کتنی جلدی بدگمان ہو جاتے ہیں جبکہ خدا اپنے بندوں کو کبھی بھی مایوس نہیں کرتا۔

سلسلے وار ناول

شرقیہ صدف کی جانا

”تایا ابو! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”بیٹا! تو اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟ بلا جھجک بات کریں۔“

”تایا ابو! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ حسنین کی بات پر سب ہی اُسے بڑی حیرانگی سے دیکھنے لگے تھے کیونکہ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ سب کہے گی۔

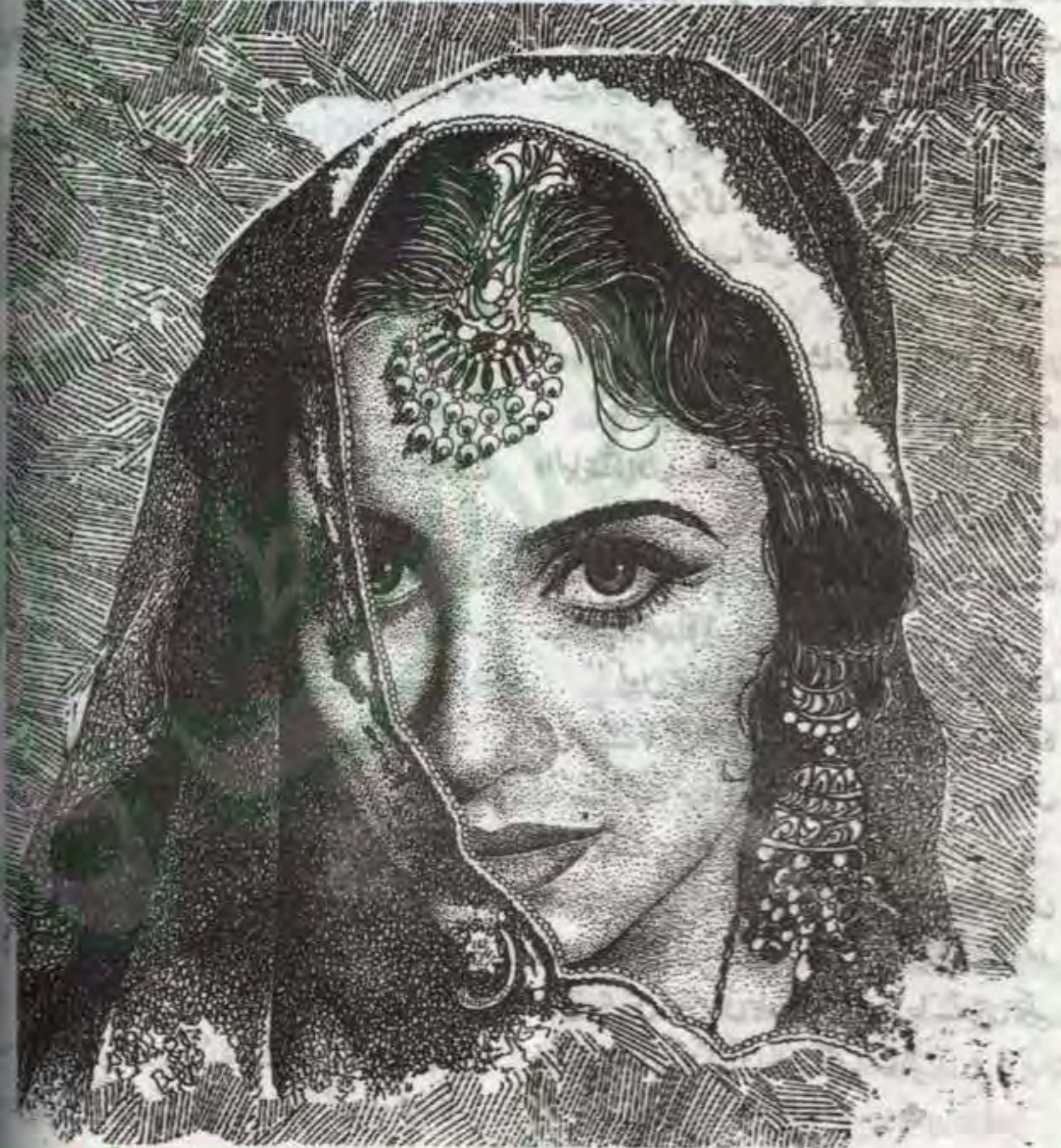
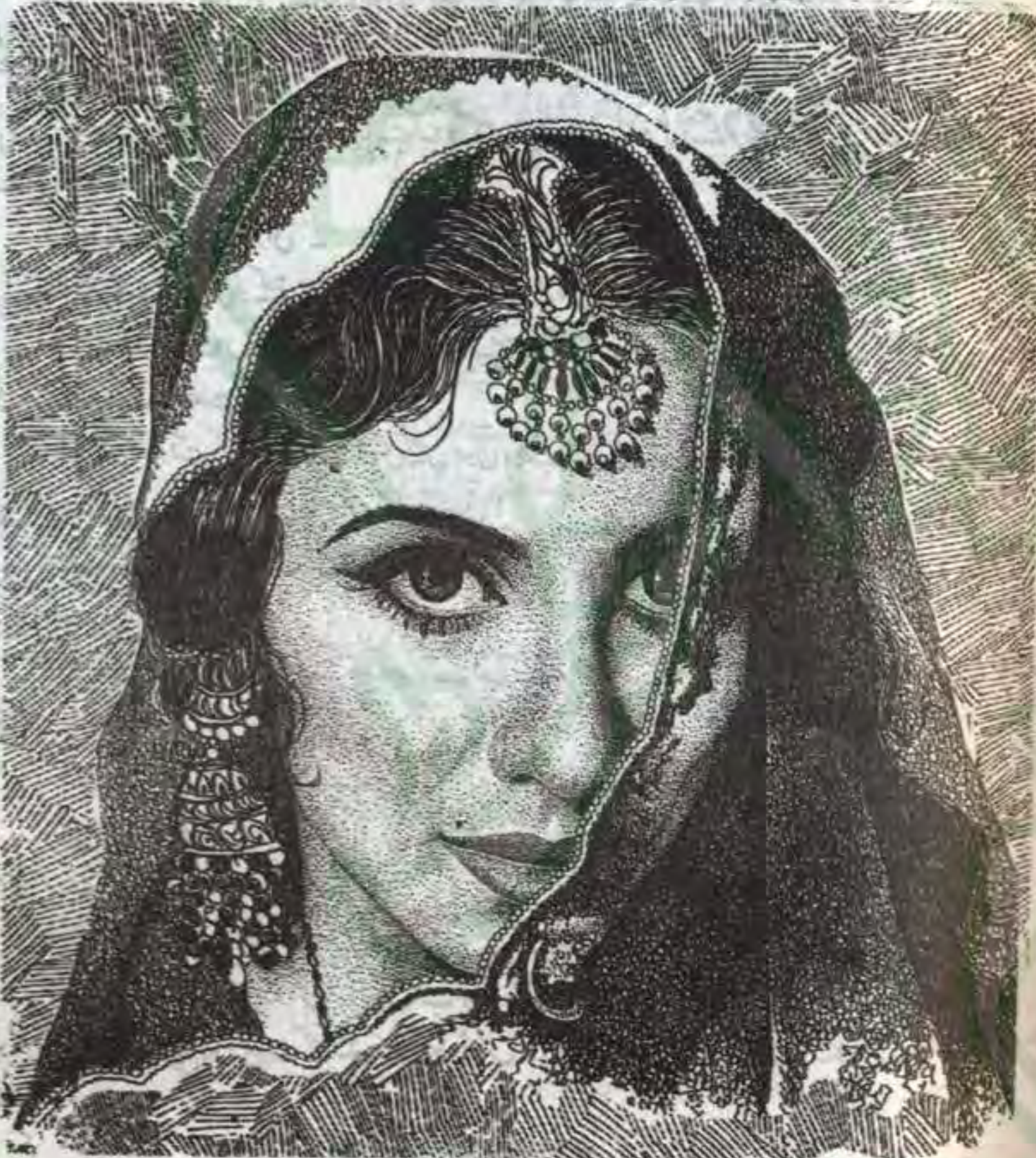
”حسنین بیٹا! آپ جانتی بھی ہیں کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”تایا ابو! میں جاب کرنا چاہتی ہوں اور یہ بات آپ سے میں نے بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔“ حسنین کی سنجیدگی پر ذرا برابر فرق نہیں پڑا تھا، جبکہ وہ عموماً کافی غیر سنجیدہ ہی رہتی تھی اور اس کی سنجیدگی کی وجہ سے ہی نوید عالم کچھ شکر ہوئے تھے۔

”آپ کو جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے آپ اپنی ایجوکیشن تو کمپلیٹ کر لیں۔“

”تایا ابو! میں ایک بزنس وومن بننا چاہتی ہوں۔“

”بیٹا! پہلے وومن تو بن جائیے، بزنس وومن بننے کی بات تو بعد میں آتی ہے، ابھی آپ کا انٹرک کمپلیٹ نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ بزنس وومن بننا چاہتی ہیں۔“ نوید عالم کے لیوں پر بڑی شریر مسکراہٹ نے بڑی تیزی سے جگہ بنائی



تھی۔

”حنین! فضول باتیں بہت ہو گئیں، اب اٹھو اور جا کر سوؤ۔“

”ممی! میں فضول باتیں نہیں کر رہی، آئی ایم سیریس۔“ اُسے ماں کا اس طرح بولنا پسند نہیں آیا تھا، اوپر سے تایا کی مسکراہٹ بھی اُس کا دل جلا رہی تھی۔

”ساجدہ! آپ پلیز کچھ مت کہیں، میں حنین سے بات کر رہا ہوں۔“

”بھائی صاحب! اس کا تو دماغ خراب ہے، نئے نئے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے ہیں، ڈھنگ سے گھر کا تو یہ کوئی کام کر نہیں سکتی، چلی ہے جاب کرنے۔“ نوید عالم کے اشارے پر وہ چپ کر گئیں تھیں۔

”ممی! مجھے گھر کے کاموں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے، میں بزنس وومن بننا چاہتی ہوں اور پلیز تایا ابو! آپ مجھے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔“ حنین نے ماں اور تایا سے باری باری کہا تھا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ آپ آفس جوائن کریں، لیکن ابھی یہ سب قبل از وقت ہوگا، آپ پہلے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کریں اس کے بعد میں آپ کو آفس جوائن کرنے سے نہیں روکوں گا۔“

”تایا ابو! بعد میں تو میں کروں گی، لیکن آج کل میں فارغ ہوں تو میں آفس جوائن کرنا چاہتی ہوں، تاکہ مجھے کچھ ایکسپیرینس ہو جائے۔“

”حنین! جب بھائی صاحب نے کہا ہے کہ وہ تمہیں اجازت دے دیں گے تو پھر تم کیوں بحث کر رہی ہو؟“ انہوں نے بیٹی کو گھورا تھا۔

”ممی! میں بحث نہیں کر رہی۔“

”تو پھر بحث کرنا کس کو کہتے ہیں؟“ اب کے انہوں نے اس کو ڈپٹا تھا۔

”ساجدہ! ڈانٹ کیوں رہی ہو حنین کو؟ اگر بچی اپنے دل کی بات گھر والوں سے نہیں کرے گی تو پھر کس سے کرے گی؟“ راشدہ نے مداخلت کی تھی۔

”آپا بیگم! ہر وقت کی ضد اور بحث اچھی نہیں ہوتی، جب حنین سے کہا کہ جب وقت آئے گا تو اس کو جاب کرنے کی اجازت مل جائے گی تو یہ کیوں خاموش نہیں ہو جاتی؟“

”جب حنین مجھ سے بات کر رہی ہیں تو آپ لوگوں کو بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے روتے دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

”آئی ایم سوری بھائی صاحب!“ ساجدہ نے قدرے شرمندگی سے اپنے جیٹھ کو دیکھا تھا اور معذرت طلب کی تھی۔

”حنین! رونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا!“

”تایا ابو! مجھے معاف کر دیں، میں آپ سے بحث نہیں کر رہی، میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔“

”بیٹا! ابھی آپ کو بزنس کی نوہاؤ نہیں ہے تو میں کیسے آپ کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔“

”تایا ابو! جب میں آفس جوائن کروں گی تب ہی تو مجھے بزنس کی نوہاؤ ہوگی۔“

”حنین بیٹا! آپ میری بات سمجھ نہیں رہی ہو، آفس جوائن کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھا نہیں پاس

تھے۔

”اگر مشکل ہے تو بھی میں میج کر لوں گی تایا ابو!“

”حنین! میں آپ کو ابھی اجازت نہیں دے سکتا۔“ انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔

”لیکن کیوں تایا ابو؟ آپ مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھیں۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ آپ پر بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے اجازت نہیں دے رہا ہوں میں، میں تو فی الحال اس لئے منع کر رہا ہوں کہ جاب کرنا، آفس سنبھالنا ایک ٹھٹھا ٹائم ڈیوٹی ہے اور جس کو آپ میج نہیں کر سکتیں، اس لئے پہلے تعلیم مکمل کریں تاکہ آپ کو پتہ ہو کہ آفس کیسے سنبھالتے ہیں؟“

”وہی تو میں سیکھنا چاہتی ہوں۔“

”کچھ بھی ایسے نہیں سیکھا جاتا حنین! ہر چیز وقت پر ہی اچھی لگتی ہے اور اگر میں آپ کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دوں تو آپ کیا کریں گی؟ آفس کے کام کے بارے میں آپ جانتی ہی کیا ہیں؟“

”تایا ابو! میں کسی بہت بڑی پوسٹ پر کام کرنے کے لئے نہیں کہہ رہی، میری ایجوکیشن کے مطابق جو آپ کو ٹھیک لگے۔“

”تمہاری ایجوکیشن ہی کتنی ہے؟ محض انٹر، اس کا بھی ابھی رزلٹ نہیں آیا۔“

”تو کیا انٹر کے کوئی جاب نہیں کرتا، کتنی ہی لڑکیاں اور لڑکے انٹر کے بعد بھی جاب کرتے ہیں، جب ان کو جاب مل جاتی ہے تو کیا مجھے اپنے گھر کے بزنس میں بھی ایڈ جسٹ نہیں کیا جاسکتا؟“

”حنین! بس چپ کر جاؤ، سارے لحاظ بھولتی جا رہی ہو تم، تایا سے دوبارہ بحث کرتے تمہیں ذرا سی شرم نہیں آ رہی۔“

”ممی!“

”شٹ اپ حنین! اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ، اب کچھ کہا تو بہت پٹوگی مجھ سے۔“ اُسے منہ کھولتے دیکھ وہ درشتگی سے بولی تھیں اور وہ صوفے سے اٹھتی تھیں اور کسی کو بھی دیکھے بغیر لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

”بھائی صاحب! حنین کی طرف سے میں آپ سے معافی۔۔۔“

”ساجدہ! حنین میرے لئے کوئی غیر نہیں ہے، میری اپنی بیٹی ہے۔“

”یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے بھائی صاحب! کیا میں نہیں جانتی کہ حنین آپ کو کتنی عزیز ہے، جاوید کی موت کے بعد آپ نے ہی تو سارے لاڈ اٹھائے ہیں، اپنے بچوں سے بڑھ کر حنین کا خیال رکھا، اس کی ہر خواہش پوری کی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب جو سوچ لیتی ہے اسے پورا کروا کے ہی چھوڑتی ہے، اتنی ضد اور من مانی اچھی نہیں ہوتی، کل کو اگلے گھر جائے گی تو کون برداشت کرے گا یہ سب؟ مجھے تو سوچ سوچ کر ہی ہول اٹھتے ہیں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ساجدہ! حنین میری ذمہ داری ہے، جسے میں آخری سانس تک خوش دلی سے اٹھاؤں گا اور بچے والدین سے بھی ضد یا فرمائش نہیں کریں گے تو پھر کس سے کریں گے؟ آپ ہر وقت حنین کے پیچھے نہ پڑ جایا کریں، اگر ضد کر بھی رہی ہے تو اسے پیار سے سمجھایا جاسکتا ہے، بڑی ہوتی ہوئی اولاد پر ہر وقت تنقید کی جائے یا روک ٹوک، اس کا بڑا اثر پڑتا ہے، اس لئے پیار و محبت سے پیش آیا کریں، آپ کی روک ٹوک حنین پر بھی برا اثر ڈالے گی اور جب بات پیار و محبت سے سلجھائی جاسکتی ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ سختی سے پیش آئیں؟“

”نوید ٹھیک کہہ رہے ہیں ساجدہ! تم ہر وقت ہی حنین کے پیچھے پڑی رہتی ہو کہ اتنی دیر کیوں سوئیں، رات دیر تک کیوں جاگتی رہیں، کھانا بنانا سیکھو، سلائی سیکھو۔ وہ وقت کے ساتھ سب سیکھ لے گی، تم کیوں اتنی فکر مند ہوتی ہو؟“

راشدہ نے شوہر کی حمایت میں بات آگے بڑھائی تھی۔

”آپ بیگم! میں بھی کیا کروں، اور بچیاں بھی تو ہیں، زرین نے پورا کچن سنبھالا ہوا ہے اور شاز مین سلائی کڑھائی میں ماہر ہے اور حنین ہے کہ نہ چائے بنانا آتی ہے نہ ہی سوئی میں دھاگہ ڈال سکتی ہے، دونوں بچیوں کی طرح گھر داری میں انٹر سٹ لے تب اسے کچھ آئے گا، اُسے تو بزنس وومن بننے کا خبط ہو چلا ہے۔“ وہ بیٹی کی حرکتوں سے سخت نالاں تھیں۔

”وقت کے ساتھ سیکھ لے گی، تم پریشان نہ ہوا کرو۔“ راشدہ نے اپنا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں ساجدہ کے ہاتھ پر رکھا تھا، راشدہ اور ساجدہ دو بہنیں جو شادی کے بعد جھٹائی دیورانی بن گئیں، نوید اور جاوید دو بھائی اور ایک بہن فریدہ۔ نوید سب سے بڑے تھے اور ان کی دو بیٹیاں زرین اور شاز مین اور اکلوتا بیٹا اسجد جو بہنوں سے بڑا تھا۔ اسجد نے بی بی اے کرنے کے بعد باپ کا بزنس سنبھال لیا تھا، زرین نے گریجویشن کے بعد اپنی مرضی سے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا، شاز مین بی ایس سی کے آخری سال میں تھی۔ جاوید عالم کا انتقال بہت ہی کم عمری میں ہو گیا تھا ان کو کینسر تھا اور علاج کروانے کے باوجود مالک حقیقی کی مرضی کے تحت روبہ صحت نہ ہو سکے اور دنیا سے منہ موڑ گئے، اُس وقت جاوید کی اکلوتی بیٹی حنین محض 4 برس کی تھی، نوید عالم اور راشدہ نے بہت کوشش کی کہ ساجدہ دوسری شادی کر لیں مگر وہ کسی طور راضی نہ ہوئیں، جس طرح جاوید کی زندگی میں وہ رہتے تھے ویسے ہی رہ رہی تھیں، دونوں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے حنین نے انٹر سائنس کے ایگز امز دیئے تھے، حنین کو باپ کی کمی محسوس نہ ہو اس لئے نوید عالم نے اسے اپنے تینوں بچوں سے زیادہ محبت و چاہت اور توجہ دی تھی اور گھر والوں کی توجہ نے ہی اسے کافی ضدی اور موڈی بنا دیا تھا، فریدہ کے دو بیٹے ارحم ارحم اور راحم ارحم تھے۔ ارحم نے سی ایس ایس کیا تھا اور حال ہی میں پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ زرین کی ہم عمر ماندہ نے بھی گریجویشن کیا تھا اور ماندہ کی اسجد سے اور شاز مین کی راحم سے 3 ماہ قبل ہی بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی، فریدہ کے شوہر یوسف ایئر فورس سے وابستہ تھے، حال ہی میں انہوں نے ریٹائرمنٹ لی تھی، جبکہ راحم کو اس شعبے سے دلچسپی نہ تھی اس لئے اس نے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے وابستہ تھا۔ تینوں گھرانوں میں بے حد محبت اور انسیت تھی، ان لوگوں میں رشتوں کی اصل مشاس شدت سے محسوس کی جاسکتی تھی جبکہ آج کل کا دور کہ جس میں جوائنٹ فیملی سسٹم تقریباً ختم ہو رہا ہے اور قریبی رشتے دار بھی ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی آپسی محبت اور یگانگت قابل ذکر ہی تھی کیونکہ اپنوں کو سمجھنا اور ان کی قدر کرنا آج کل کے دور میں بہت کم نظر آتا ہے۔

☆.....☆.....☆

”پھپھو! اس دفعہ آپ نے کافی دنوں بعد چکر لگایا ہے، سچ میں آپ کو بہت س کر رہی تھی۔“ شاز مین لاڈ سے بولی تھی۔

”پھپھو کو مس کر رہی تھیں یا پھپھو کے بیٹے کو مس کیا جا رہا تھا؟“ چلغوزوں کی پلیٹ سے انصاف کرتی حنین کے شرارت سے کہنے پر شاز مین بڑی طرح جھینپ گئی تھی اور جھینپ مٹانے کو اُس کے بازو میں چٹکی کاٹی تھی۔

”ہر وقت فضول بولا کرو۔“

”لو بھئی نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔“ وہ بازو کو سہلاتے ہوئے بولی تھی اور فریدہ ہنسنے لگی تھیں اور ہنسنے ہوئے اُسے چھیڑنے کو بولی تھیں۔

”شاز مین بیٹا! کیا حنین سچ کہہ رہی ہے؟ یاد مجھے نہیں بلکہ....!“ جان کر انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارت

بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا۔

”آپ بھی نا پھپھو! اس کو تو بکواس کرنے کی عادت ہے، میں آپ کے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس کا خوبصورت چہرہ اناری ہو چلا تھا اور اُس نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”زرین! آپ سے کہہ دینا چاہئے بنانے کے لئے، جو شانہ پینے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔“ حنین نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

”تم سے تو اچھی چائے بناتی ہوں، تمہیں تو یہ بھی شاید پتہ نہ ہو کہ چائے بناتے وقت ڈالتے کیا کچھ ہیں؟“ اس نے مز کر کہتے ہوئے حساب بے باک کیا تھا اور سب ہی جانتے تھے کہ شاز مین نے بالکل سچ کہا ہے اس لئے فریدہ اور راشدہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی جبکہ ساجدہ کو فکروں نے آگھیرا تھا۔

”ساجدہ بھابی! آپ کیوں خاموش بیٹھی ہیں؟“

”ہاں.... نہیں.... میں بچیوں کی نوک جھونک سن رہی تھی، تم آتے ہوئے ماندہ کو بھی لے آئیں۔“

”نہیں بھابی! اچھا نہیں لگتا، یہ ماندہ کی ہونے والی سرال ہے، سرال میں شادی سے پہلے آنا کچھ معیوب سی ہی بات ہے۔“

”تم بھی کن زمانوں کی بات کرتی ہو فریدہ! زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور ماندہ کا یہ سرال بعد میں، ماموں کا گھر پہلے ہے، اس لئے اُس کے آنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔“ راشدہ نے کھلے دل و سچائی سے کہا تھا۔

”بھابی بیگم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مگر احتیاط کرنا اچھی بات ہے۔“

”فریدہ کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر منگنی نہ جانے ابھی کتنے ماہ یا سال رہے، تو بچے کیا ماموں اور پھپھو کے گھر ہی نہیں جائیں گے؟“

”مُمی! تو بچوں کی جلدی شادی کر دیں، ویسے ہی انتظار اب نہیں ہوتا۔“ چائے کی ٹرائی لاتی شاز مین کو دیکھ کر وہ شرارت سے بولی تھی۔

”ساجدہ بھابی! حنین نے مشورہ تو کافی درست دیا ہے، اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“ فریدہ کی بات پر حنین نے فخر سے فرضی کالز کھڑے کیے تھے اور وہ محض بیٹی کو گھور کر رہ گئی تھیں۔

”فریدہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ شاز مین چھوٹی ہے، میں پہلے زرین کی شادی کروں گی، میں تو منگنی کے بھی خلاف تھی، مگر تمہاری ضد کے آگے چپ ہو گئی، مگر زرین کی شادی سے پہلے میں شاز مین کی شادی نہیں کروں گی۔“ راشدہ قطعیت سے بولی تھیں کیونکہ وہ شاز مین کا رشتہ کرنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں مگر فریدہ بھی کیا کرتیں، بڑا بیٹا شادی کے نام سے چڑتا تھا اور دوسرے بیٹے نے خود شاز مین کا نام لیا تھا ورنہ تو ان کا ارادہ ارحم کے لئے زرین کو مانگنے کا تھا مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا تو انہوں نے چھوٹے بیٹے کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے شاز مین کو مانگ لیا تھا۔

”بھابی بیگم! میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ پہلے کہیں ہماری زرین کا رشتہ ہو جائے اور آج میں اسی سلسلے میں حاضر ہوئی تھی۔“

”میں سمجھی نہیں فریدہ!“

”بھائی صاحب! آجائیں پھر بات کروں گی، ابھی بچیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔“

”پھپھو! ایسی کیا بات ہے جو ہم سے چھپانا چاہتی ہیں؟“ حنین کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”پھپھو کی دادی! آپ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کریں، ہم جب ضروری سمجھیں گے تمہیں بتا دیں گے،

آج کل فارغ ہوا اتنا نہیں ہوا کہ پھپھو کے گھر آ جاؤ، مگر نہیں جناب، پھپھو سے تو منہ دیکھے کی محبت نبھائی جاتی ہے۔ انہوں نے مذاق سے کہتے ہوئے اُس کا کان پکڑا تھا، جسے چھڑاتے ہوئے اس نے فریدہ کے کاندھے پر اپنا دایاں ہاتھ پھیلاتے ہوئے لاڈ سے کہنا شروع کیا تھا۔

”جی پھپھو! میں آپ سے منہ دیکھے کی محبت نہیں کرتی، یہ کام تو شازمین بجو کا ہے، آپ آتی ہیں تو ان کو یاد آتا ہے کہ یہ آپ کو یاد کر رہی تھیں، ورنہ تو آپ کا نام بھی نہیں لیتیں۔“ وہ ہنستے ہوئے شازمین کو نارگٹ بنا رہی تھی۔

”میں تمہاری طرح بدتمیز نہیں ہوں کہ بڑوں کے نام لوں۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”یعنی آپ شادی کے بعد راحم بھائی کا نام نہیں لیں گی، وہ بھی تو آپ سے بڑے ہیں، ویسے بجو! آپ ان کا نام نہیں لیں گی تو پھر انہیں کیا کہیں گی؟ جانو، ڈارلنگ یا سوئیٹ ہارٹ!“

”شٹ اپ!“ چہرہ سرخی مائل ہو گیا تھا اور وہ شرم و حیا سے لال پڑتی وہاں سے تقریباً بھاگتے ہوئے نکلی تھی۔

”بتا کر تو جائیے کہ آخر راحم بھائی کو آپ کیا کہیں گی؟“ اسے روکنا چاہتا تھا۔

”تم سے مطلب، تم اپنے کام سے کام رکھو مجھیں؟“ وہ پلٹ کر کہتی بھاگ گئی تھی۔

”بریں بات حسین! بہن کو تنگ نہیں کرتے۔“

”جی پھپھو! تنگ کرنے میں جو مزہ ہے وہ کسی بھی چیز میں نہیں اور شازمین بجو کو تو ستانے میں بڑا ہی مزہ آتا ہے، راحم بھائی کے نام پر جو شرماتے ہوئے بھاگتی ہیں، ان کا یہ انداز سچ میں لطف دے جاتا ہے۔“ وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے بولی تھی۔

”جب تمہاری باری آئے گی تو پوچھوں گی کتنا لطف آتا ہے؟“ زرین نے کباب کھاتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا

مگر اس کو کیا پتہ تھا کہ اب نشاندہ خود ہی بن جائے گی۔

”میرا نمبر تو بہت بعد میں آئے گا، پہلے تو آپ اپنی خیر منائیں، پھپھو آج اسی مقصد سے آئی ہیں۔“

”اس لڑکی کے سامنے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر سکتا۔“

”مئی! آپ کو تو میرے خلاف بولنے کی عادت ہو گئی ہے، میں نے کچھ اپنی طرف سے کب کہا؟ یہ سب تو پھپھو ہی بول رہی تھیں۔“ اُس نے تیزا کباب اٹھاتے ہوئے ٹھکی دکھائی تھی اور اُسی وقت اسجد اور نوید عالم آفس سے لوٹتے

سیدھے لاؤنج میں ہی آئے تھے اور وہ نوید عالم کو دیکھ کر آدھا کھایا ہوا کباب واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ وہ آج کل ان سے ناراض تھی اور یہ ناراضی ظاہر کرنے کا اس کا اپنا انداز تھا۔ محسوس تو فریدہ کے علاوہ سب ہی نے کیا تھا مگر کہا کسی نے کچھ نہیں تھا اور وہ لاؤنج سے نکل کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔

یوسف ساتھ نہیں آئے؟ انہیں بھی لے آئیں۔“

”بھائی صاحب! ان کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لئے نہیں آئے اور جبکہ میرا آنا بھی ضروری تھا، مہوش نے فون کر کر کے میرا دماغ خراب کیا ہوا تھا، میں نے سوچا فون پر آپ لوگوں سے کیا بات کروں گی، اسی بہانے ملے آ گئی۔“

فریدہ نے اپنی اکلوتی بچپن کی سہیلی کا نام لیا تھا اور اس نام سے سب ہی واقف تھے۔

”کیوں بھئی.... مہوش نے آپ کا کیوں دماغ خراب کیا ہوا تھا؟“

”زرین! جا کر اپنے ابو کے لئے چائے لے آؤ۔“ فریدہ کی باتوں سے اندازہ لگاتے ہوئے ساجدہ نے زرین کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا اور وہ چائے کے خالی کپڑاں میں رکھتی اور برتن سمیٹ کر ٹرائی گھسیٹ کر وہاں سے نکل گئی تھی۔

”بھائی صاحب! میری دوست مہوش اپنے بیٹے کے لئے زرین کا ہاتھ مانگنے کے لئے یہاں آنا چاہتی ہے۔“

زرین کے جانے کے بعد وہ بولی تھیں۔

”اب آپ جو بھی کہیں گے، ہاں، ناں وہ میں اُسے بتا دوں گی۔“

”مہوش کو تو ہم کافی عرصے سے جانتے ہیں، وہ بہت چھوٹی عمر سے ہمارے گھر آتی رہی ہیں، ان کی ایسی کوئی خواہش ہے تو آپ اُن کو بلا لیں، آگے ہماری زرین بیٹی کا نصیب۔“ انہوں نے لمحہ میں مثبت جواب دے دیا تھا

کیونکہ مہوش کی فیملی سے اُن کے فیملی ٹرمز تھے، شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی، وہ ان کی گھریلو تقریبات کا ہمیشہ سے حصہ رہی تھیں۔ مہوش فیاض کے 2 بیٹے فیصل اور فیصل جبکہ ایک ہی بیٹی سحرش تھی۔ فیصل کی اپنے ماموں کی بیٹی سے بات ملے تھی جبکہ فیصل کے لئے ہی مہوش، زرین کا ہاتھ مانگنا چاہتی تھیں، فیصل آرکیٹکٹ تھا اور سحرش نے

حال ہی میں انٹر سائنس کے پیپر زد کیے تھے۔ فیصل فیاض تینوں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔

☆.....☆.....☆

”حسین کہاں ہے، وہ کھانا نہیں کھا رہی؟“ نوید عالم نے چیئر سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”مئی! میں اُسے بلانے گئی تھی مگر اُس نے آنے سے منع کر دیا کہ اُسے بھوک نہیں ہے۔“

”اُس نے دوپہر میں بھی یہی کہا تھا، زرین! جاؤ ذرا بلا کر لاؤ اُسے۔“ راشدہ نے کہا تھا۔

”رہنے دیں بھابی! جب کھانا ہوگا کھالے گی، زرین! آ جاؤ بیٹا! تم کھانا کھاؤ۔“

”کوئی بات ہوئی ہے؟“ نوید عالم نے بیوی سے پوچھا تھا تب ساجدہ بولی تھیں۔

”بات کیا ہوئی ہے بھائی صاحب! دماغ خراب ہو گیا ہے اس لڑکی کا۔“

”آخر یہ بھی تو چلے کہ حسین کہہ کیا رہی ہے؟“

”بھائی صاحب! اُس کی ایک ہی رٹ ہے کہ آفس جوائن کرنا ہے، نرمی سے سمجھایا تو مانی نہیں، سختی سے کہا تو دوپہر سے کمرہ بند کیے بیٹھی ہے، نہ کسی سے بات کر رہی ہے اور نہ ہی کچھ کھا رہی ہے، مجھے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔“

ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر گالوں پر گرنے لگے تھے۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا ساجدہ کہ حسین کے ساتھ سختی نہ کرو۔“

”میں بھی کیا کروں آپا بیگم! حسین کو میں نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کم از کم گریجویشن تو کر لے، اس کے بعد آفس جوائن کر لے مگر اس کی ایک ہی ضد ہے کہ وہ ابھی جوائن کرے گی، ناک پر مٹی تو بیٹھنے دیتی نہیں ہے

جواب کیسے کرے گی؟“ وہ بیٹی کی حرکتوں سے نالاں نظر آ رہی تھیں۔

”شازمین بیٹا! آپ جا کر بہن کو بلا کر لاؤ۔“ شازمین خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔

”کہاناں میں نے، مجھے کھانا نہیں کھانا ہے تو کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں؟“ شازمین کے دروازہ بجانے پر وہ اندر سے چیختی تھی، دروازہ ہنوز بند تھا۔

”تمہیں ابو بکلا رہے ہیں، کم از کم اُن کی بات تو سن لو۔“

”مجھے کسی کی بھی بات نہیں سنی، جب کسی کو میری پرواہ نہیں ہے تو میں کیوں سب کی پرواہ کرتی پھروں، آپ چڑ جائیں بجو! مجھے نہیں آنا ہے۔“

”شازمین! کیا ہوا ہے، یہ حسین دروازہ کیوں نہیں کھول رہی؟“ اسجد اپنے کمرے سے نکلا تھا اور شازمین کے سامنے آڑ کا تھا۔

”بھائی! حنین ناراض ہے اور غصہ میں اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔“

”تم ہٹو، میں دیکھتا ہوں۔“ شازمین کے سائیڈ میں ہوتے ہی اُس نے دروازہ پر زوردار دستک دی تھی۔

”شازمین بھو! مجھے تنگ مت کریں۔“

”حنین! دروازہ کھولو۔“ شازمین کے بجائے اسجد برہمی سے بولا تھا۔

”آپ چلے جائیں اسجد بھائی! بار بار مجھے آپ لوگ تنگ کریں گے تو میں اپنے ساتھ کچھ غلط کر بیٹھوں گی۔“ اس کی روتی ہوئی آواز ان کے کانوں تک آئی تھی اور اسجد کی برداشت ختم ہو گئی تھی، وہ کچھ دنوں سے اس کی حرکتیں دیکھ کر محسوس کر رہا تھا مگر کچھ کہا نہیں تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا سنجیدہ مزاج کا حامل شخص تھا جب تک اس کی لاطعلقی ممکن ہوئی وہ لاطعلقی رہتا تھا مگر جب ایئر فیئر کرنے کی ضرورت ہوتی تو ضرور کرتا تھا۔

”حنین! ایک منٹ میں تم نے دروازہ نہیں کھولا تو میں دروازہ توڑ دوں گا۔“ وہ اسجد کے غصے سے ڈرتی تھی، اس وقت بھی اُس کے غصے کو محسوس کرتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا تھا۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے حنین! وہاں نیچے سب تمہارا ڈانگنگ ہال میں انتظار کر رہے ہیں اور تمہارے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے ہیں۔“

”آپ کچھ نہیں جانتے اس لئے بیچ میں مت بولیں۔“ وہ اُس کے تیز لہجے سے خائف سی ہو کر بولی تھی۔

”کیا نہیں جانتا؟ کچھ کہتا نہیں ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم جو چاہو کرتی رہو، جب ابو اور چچی نے ہمیں جاب کرنے سے منع کر دیا ہے تو کیوں ضد پراڑی ہوئی ہو؟“ تیکھے چوتھوں سے اُس کے سلگتے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔

”ضد پر میں نہیں تایا ابو اڑے ہوئے ہیں، دنیا کی کتنی ہی لڑکیاں جاب کرتی ہیں، ایک میں بھی کر لوں گی تو کون سی قیامت آجائے گی؟“

”شٹ اپ حنین! مجھ سے زیادہ بدزبانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شازمین! اسے لے کر نیچے آؤ۔“ وہ انگلی اٹھا کر کہتا شازمین کو آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکلنے لگا تھا۔

”میں نہیں آؤں گی، آپ اپنا فیصلہ مجھ پر نہیں تھوپ سکتے۔“

”تم دو منٹ میں نیچے نہیں آئیں تو بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ غصے سے بیچ و تاب کھاتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

”حنین! ضد نہیں کرتے، ابھی نیچے چل کر کھانا کھا لو، تم جو چاہتی ہو وہ قبل از وقت ہے، جب وقت آئے گا۔!“

”مجھے کچھ نہیں سننا ہے، جس کو دیکھو مجھے وعظ سنانے بیٹھ جاتا ہے، لیکن میں بھی وہی کروں گی جو میں چاہتی ہوں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں، کہہ دیجئے گا اسجد بھائی سے کہ وہ آپ پر اور زور میں آپی پر دھونس بجایا کریں، میں اُن کی آواز سننے والی نہیں ہوں، اور زیادہ ہی شوق ہوا مائدہ اپنا پر دھونس بجائیں، مجھ پر ہرگز نہیں۔“ وہ روتے ہوئے ہتھ میں کہتی واش روم میں چلی گئی تھی اور شازمین حیران سی ڈانگنگ ہال میں آگئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی آگئی تھی کسی کو بھی دیکھے بغیر اپنی مخصوص چیز گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئی تھی، کسی نے بھی اُس سے کچھ نہیں کہا تھا اور سب خاموشی مانا کھانے لگے تھے۔

”حنین! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ اُسے اٹھتے دیکھ کر نوید عالم بولے تھے۔

”میں میں آپ سے کوئی بات۔!“

”حنین! اسجد نے اُس کی بدتمیزی پر بند باندھنا چاہا تھا۔“

”کیسے! میں سن رہی ہوں۔“

”آپ میرے کمرے میں آؤ، میں وہیں آپ سے بات کروں گا۔“ وہ کرسی کھسکا کر اٹھ گئے تھے۔

”میرے اللہ! یہ لڑکی آخر چاہتی کیا ہے؟“ ان دونوں کے وہاں سے بٹتے ہی وہ سر تھام کر رہ گئی تھیں۔

”چچی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں، ابو اس سے بات کر رہے ہیں نا۔“

”یہی تو مجھے ڈر لگ رہا ہے، دوپہر میں اس نے مجھ سے کتنی بدتمیزی کی اور میں نہیں چاہتی کہ وہی سب وہ بھائی صاحب کے ساتھ بھی کرے۔“

”آپ ایسے نہ سوچیں چچی! حنین کبھی بھی ابو سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔“ زرین اُن کو پانی پلاتے ہوئے بولی تھی۔

”حنین! میں نے کبھی آپ کی کوئی بات نہیں مانی، جو چاہا، جو مانگا وہ سب آپ کو دیا اور آفس جوائن کرنے سے بھی میں آپ کو منع نہیں کر رہا، مگر ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے اور آپ کے پاس وقت ہی کتنا ہے، صرف 3 ماہ؟

اس کے بعد آپ کا رزلٹ آجائے گا اور بی کام میں ایڈمیشن، ایڈمیشن کے بعد آپ آفس نہیں جاپاؤ گی، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ گریجویٹیشن کے بعد آپ آفس جوائن کرو۔“

”پھر تو میں گریجویٹیشن کے بعد بھی آفس جوائن نہیں کر سکتی، پھر مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہوگا اور آپ کہیں گے کہ ماسٹرز کے بعد میں آفس آسکتی ہوں، آپ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ میں آفس جوائن کروں اور یہی بات آپ مجھے صاف کہیں، مجھے آسرے میں کیوں رکھ رہے ہیں؟ جھوٹی تسلیاں، جھوٹے آسرے نہیں چاہئیں مجھے۔“ وہ بہت تلخی سے کہہ رہی تھی اور وہ ششدر سے بیٹھے اُسے سن رہے تھے، اس نے لاڈ پیار سے اُن سے کتنی ہی فرمائشیں اور بے جا ضدیں پوری کروائی تھیں مگر آج تو اس کا انداز ہی نیا تھا۔

”میں جھوٹے آسرے نہیں دے رہا، مجھے منع کرنا ہوتا تو صاف کرتا، یہ میری ڈھیل ہی ہے حنین! جو آپ اس طرح بحث کر رہی ہیں۔“

”بحث کے لئے بھی آپ نے ہی مجھے مجبور کیا ہے، آپ میرے تایا ہیں ناں اس لئے مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتے، آپ کی جگہ میرے ابو ہوتے تو وہ ضرور سمجھتے کہ میں کیا چاہتی ہوں، مگر آپ لوگ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ اسجد بھائی نے میری کتنی انسلٹ کی، اتنے بُرے لہجے میں مجھ سے بات کی، مجھے بُری طرح ڈانٹا اور میں کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی، یتیم ہوں ناں، یتیموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے، جیسا میرے ساتھ کیا جا رہا ہے۔“ اس کی باتیں اور اس کا ہچکیوں سے رونا، نوید عالم ششدر سے بیٹھے رہ گئے تھے۔

”حنین! ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ بیٹا! کیا میں آپ کا ابو نہیں ہوں؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر دل گرفتگی سے بولے تھے، جو بھائی انہیں بہت عزیز تھا یہ اسی کا خون تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے اس لئے انہوں نے اسے اپنے بچوں سے زیادہ چاہت و توجہ دی مگر اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ ان کی شفقت و محبت ہی بے معنی سی تھی۔

”نہیں، آپ صرف میرے تایا ابو ہیں، میرے ابو مر گئے ہیں، ممی کہتی ہیں میں آپ سے فرمائشیں نہیں کیا کروں، مجھے آپ سے لاڈ بھی نہیں کرنے چاہئیں، اس لئے میں جاب کرنا چاہتی ہوں، میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔“

”ہم نے کب کہا کہ آپ ہم پر بوجھ ہیں؟“ وہ حیران ہی تو رہ گئے تھے۔

”ممی کہتی ہیں، یہی آپ کا احسان ہے کہ آپ نے ہمیں گھر میں جگہ دی، مجھے پڑھایا لکھایا اور میں اب آپ کے

احسان اتارنا چاہتی ہوں، میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ مجھے آفس ورک آجائے تاکہ مجھے کہیں بہت اچھی جگہ جاب مل جائے، آپ مجھے اپنے آفس میں جاب نہیں دے سکتے تو مجھے کہیں اور جاب کرنے کی اجازت دے دیں، میں جاب کرنا چاہتی ہوں، مگر آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتی اسی لئے آپ کے آفس میں کام کرنے کا سوچا ورنہ میں جانتی ہوں کہ میری ایجوکیشن ان کمپلیٹ ہے اور مجھے جاب نہیں مل سکتی، آپ نے ابو کی موت کے بعد مجھ پر اتنے احسان کیے، ایک احسان اور کر دیں، مجھے جاب کرنے کی اجازت دے دیں۔“ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، انہوں نے کبھی بھی تو اُسے غیر نہیں سمجھا تھا، اُس سے محبت کی تھی، احسان سمجھ کر اس کی پرورش نہیں کی تھی بلکہ اپنا فرض سمجھ کر کی تھی جسے وہ اتنی آسانی سے احسان کا نام دے گئی تھی۔

”آپ جیسا سوچتی ہو یا ساجدہ جیسا سوچتی ہیں ایسا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا، اس لئے فضول باتوں کو ذہن سے نکال دیں حنین! مجھے آپ زرین اور شازمین کی ہی طرح عزیز ہو، اور آپ جاب کرنا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے، آپ کل سے آفس جوائن کرلو۔“ انہوں نے اُس کے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا اور وہ اُن کے سینے سے لگ کر بلک اٹھی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اب اُن میں حوصلہ نہیں تھا اُس کا دل دکھانے والی باتیں سننے کا، اس لئے وہ شازمین کو آوازیں دینے لگے تھے اور کچھ ہی دیر میں وہ وہاں چلی آئی تھی۔

”شازمین! بہن کو کمرے میں لے کر جائیں اور کھانا بھی یاد سے کھلا دیں، ڈائننگ ٹیبل پر حنین نے کھانا نہیں کھایا تھا۔“ لہجے میں سنجیدگی سی تھی۔

”تایا ابو!“

”اوہوں، کچھ مت کہیں بیٹا! آپ جو کہنا چاہتی تھیں وہ سمجھ گیا ہوں، یو ڈونٹ وری۔ کل سے یا جب چاہیں آفس آ سکتی ہیں۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہیں؟“ خیال آنے پر پوچھا تھا۔

”نہیں، میں اپنی بیٹی سے ناراض نہیں ہوں، اور یہی چاہتا ہوں کہ میری بیٹی ہمیشہ خوش رہے۔“ وہ بدقت تمام مسکرائے تھے، شازمین کو کچھ غیر معمولی سا لگا تھا مگر باپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی اس لئے دل میں الجھن لئے وہ حنین کا ہاتھ تھامے اُن کے روم سے نکل گئی تھی۔ اس نے حنین کو اُس کے کمرے میں چھوڑا تھا اور پکن میں آگئی تھی، کھانا گرم کر کے حنین کو کھلایا تھا اور برتن دھو کر وہ پکن سے نکل رہی تھی کہ اسجد کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

”اسجد بھائی! کچھ چائے تھا آپ کو؟“

”مجھے کچھ پوچھنا ہے شازمین!“ اُس نے بہن کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا، اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اسجد کو دیکھنے لگی تھی۔

”میں ابو سے کوئی فائل ڈسکس کرنے گیا تھا، کل پر پریزنٹیشن ہے اور ذرا سی کوتاہی سے لاکھوں کا کنٹریکٹ ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتا ہے، اس کے باوجود ابو نے مجھے اچھا رسپانس نہیں دیا، وہ مجھے بہت پریشان اور دکھی لگ رہے تھے، کیا تم جانتی ہو ابو اور حنین کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ ہونہ ہو حنین ہی ابو کی پریشانی کی وجہ ہے۔“

”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے بھائی! کہ حنین سے اُن کی کیا بات ہوئی؟ جب ابو نے مجھے بلایا تھا حنین اُن کے کندھے سے لگی بری طرح رو رہی تھی، ابو نے کہا میں حنین کو کمرے میں لے جاؤں، حنین کچھ کہنا چاہتی تھی جس کا ابو نے اُسے موقع نہیں دیا اور اس سے کہا کہ وہ جب چاہے آفس جوائن کر سکتی ہے۔“

”واٹ!...! ابو نے حنین کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دی، مگر کیوں؟“

”میں خود نہیں جانتی، ایک دفعہ میں نے بھی ابو سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگر ابو نے سختی سے منع کر دیا تو میں نے یہ چپڑ ہی کلوز کر دیا، مگر اب حنین کو ابو نے اجازت دی ہے تو میں وجہ نہیں سمجھ پا رہی، اور ابو مجھے بھی کافی اپ سیٹ لگ رہے تھے، بھائی! کہیں چچی کا خدشہ صحیح تو نہیں تھا؟“ وہ کچھ خیال آنے پر اُسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟“

”بھائی! چچی کہہ رہی تھیں ناں کہ حنین نے اُن سے بدتمیزی کی تھی، تو کہیں اُس نے ابو سے بھی!...! اسی لئے ابو نے اُسے اجازت دے دی، ورنہ تو میں نے خود امی اور ابو کی باتیں سنی تھیں، ابو کہہ رہے تھے کہ وہ حنین کو کبھی اجازت نہیں دیں گے، جیسے مجھے نہیں دی تھی، کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیاں ورکنگ وومن بنیں، امی نے کہا تھا کہ پھر آپ نے صاف منع کیوں نہیں کیا؟ تو ابو بولے کہ گریجویشن کے بعد وہ حنین کی شادی کر دیں گے، اور اس کی طبیعت میں ضد ہے اس لئے انہوں نے وقتی طور پر حامی بھر لی ہے، تاکہ وہ یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کر لے۔“ شازمین نے اچانک سُن لینے والی باتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”حنین کافی منہ پھٹ اور بدتمیز ہے، یقیناً اس نے ابو سے بدتمیزی کی ہے اور اگر واقعی ایسا ہوا تو حنین کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ اُس کا غصہ عود کر آیا تھا۔

”بھائی! آپ غصہ نہیں کریں، حنین اس طرح آپ سے خائف!...!“

”مجھے کسی کی بھی ناراضی کی فکر نہیں ہے، وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور اُسے باقی بیٹیوں کی طرح ہی زندگی گزارنا ہوگی، من مانوں کی اجازت نہیں دے سکتے، کسی بھی وجہ سے ابو نے اُسے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دی ہو مگر میں خود ابو سے بات کروں گا، وہ آفس نہیں جائے گی۔ تم اٹھو جا کر سوؤ، ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہو، کچھ ذمہ داریاں اُسے بھی دو، گھر سنبھلنا نہیں ہے، محترمہ آفس سنبھالنے چلی ہیں۔“ وہ غصے سے تن فن کرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا اور شازمین پریشانی سے وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آج کل کہاں غائب ہو، دکھائی نہیں دیتے؟“

”مصروفیت ہی ایسی رہی، پاپا کو انجانا نا کا ایک ہوا تھا۔“

”کیا... کب؟ اور کسی نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ ارجم اُسے تیز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

”میں نے تمہیں جان کر ڈسٹرب نہیں کیا ارجم! تم نے حال ہی میں اپنی پوسٹ سنبھالی ہے، میں نے سوچا تم مصروف ہو گے، کچھ دنوں سے تم نے کوئی کال یا میسج بھی تو نہیں کیا تھا اسی لئے میں نے تمہیں پریشان نہیں کیا، مگر تم فکر مند نہ ہو، پاپا اب بالکل ٹھیک ہیں، یاد کر رہے تھے تمہیں، فرصت ہو تو آ جا۔“

”تھف ہے تجھ پر فضیل! اب مجھ سے اتنا فارل ہو کر بات کرے گا، تیرا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟“ ارجم نے غصے سے کہتے ہوئے آدھا بھرا ہوا گلاس اُس کے سر پر ڈال دیا تھا۔

”ٹھنڈ لگنے سے کھلا کچھ دماغ، کہ میں تیرا بچپن کا دوست ارجم احسن ہوں۔“ وہ بہت ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا اور فضیل اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا تھا۔

”میرا نہیں، دماغ تیرا خراب لگ رہا ہے، جناب انپیکٹر ہوتے ہیں اور حرکتیں بالکل بچوں والی۔“

”اوئے گھامڑ! یہ تشدد کا سب سے آسان طریقہ ہے، پانی ڈالنے سے سمجھ نہیں آیا تو بال کھینچ کر بتاؤں؟“ اب کے وہ مسکرا کر بولا تھا۔

”اپنے تشدد کے طریقے اپنے پاس رکھ، اور شرافت سے کچھ آرڈر کر، سخت بھوک لگ رہی ہے، تیرا جب فون آئے گا میں گھر کے لئے ہی نکل رہا تھا اس لئے یہاں آ گیا اور تو ہے کہ مجھ پر ہی اپنی انپکٹری کے جوہر دکھانے لگا۔“

”بتاؤ کیا آرڈر کرنا ہے، بچپن سے ٹونڈیدہ واقع ہوا ہے، کھانے کا شوق ہے مگر بیل بھرنے کا موصوف کو ذرا سا بھی خیال نہیں آتا۔“ ویٹر کو اشارہ کیا تھا جبکہ فضیل ڈھٹائی سے ہنس دیا تھا کیونکہ ارحم نے کہا بالکل ٹھیک تھا کہ بیل ہمیشہ ارحم ہی پے کرتا تھا وہ تو مت نئی ڈشز آرڈر کرتا رہتا تھا کیونکہ وہ کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا۔

”پچھلے دنوں میں ایک کیس کے سلسلے میں دیر تک مصروف رہا، رات گئے گھر آیا تھا ورنہ ماما، ضرور انکل کی طبیعت کا بتا تیں۔“

”آئی راحم کے ساتھ آئی تھیں پاپا کو دیکھنے، تب انہوں نے تمہاری مصروفیت کا بتایا تھا اسی لئے میں نے تم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔“ وہ برگر سے انصاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”فضیل! میری سمجھ میں نہیں آتا، ٹوکھا اور بول ایک ساتھ کیسے لیتا ہے؟ مجھ سے کبھی نہیں ہوتا۔“ وہ اس کی اسپینڈ سے پریشان ہوا تھا۔

”پولیس لائن میں آ گیا ہے نا تو اب ہو جایا کرے گا۔“ اُس نے چھیڑا تھا۔

”تو کون سے جنم میں حوالدار تھا جو ایسے کہہ رہا ہے؟“ وہ تپ گیا تھا۔

”یار! میرے تو پورے خاندان میں کوئی حوالدار نہیں گزرا، ہاں ماما بتاتی ہیں ان کی بیسٹ فرینڈ کا بیٹا ضرور حال میں ہی حوالدار مقرر ہوا ہے۔“ وہ جو بڑے غور سے اُس کی بات سن رہا تھا آخر میں اُس کی بات کا مطلب سمجھ کر اُسے گھورنے لگا تھا اور اُس نے زبردست قہقہہ لگایا تھا، جس کی وجہ سے کتنے ہی لوگ ان کی ٹیبل کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”گدھوں کی طرح ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تیرا بیڈروم نہیں پبلک پلیس ہے۔“

”ہاں یار! تو نے ٹھیک کہا، مگر آج کل مجھے میرا بیڈروم بھی کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“ ارحم نے اُسے احساس دلانا چاہا تھا تب اس نے معصومیت طاری کی تھی جبکہ اس کے تو خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

”میں تیری اس بکواس کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یار! صاف بات ہے، اس کمرے میں اکیلے رہتے ہوئے تو زندگی گزر گئی، اب تو بس یہی خواہش ہے کہ میرے کمرے کے ساتھ میرے وجود کو آباد کرنے والی جلدی سے آ جائے۔“ اس نے ایک ادا سے کہتے ہوئے کولڈر تک کے سب لینا شروع کر دیئے تھے۔

”مجھے تو اُس بے چاری کے حال پر ابھی سے ترس آنے لگا ہے جو تیری بیوی بنے گی، روز ہی رویا کرے گی۔“

”چاری۔“

”اللہ نہ کرے، روئیں اُس کے دشمن، یار! یہ دُعا تو مت دے۔“

”سوری فضیل! میں تو بس مذاق کر رہا تھا، میں بد دُعا نہیں دے رہا تھا، کیا میں تجھے بد دُعا دے سکتا ہوں؟“

”او میرے یار! ایک دم اسٹریس مت ہو جایا کر، میں بھی مذاق کر رہا تھا اور ذرا ویٹر کو بلا کر پو تو آرڈر کروئے۔“

اُس کی فرمائش پر اس نے ویٹر کو ایک بار پھر اشارہ کیا تھا۔

”فضیل! تو نے کبھی بتایا نہیں وہ لڑکی آخر ہے کون جس سے تُو محبت کرتا ہے؟“ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُس نے استفسار کیا تھا۔

”ہے ایک پیاری سی، نازک سی، جو تیرے یار کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی ہے۔“ اس کے لبوں پر بڑی ہی خوبصورت مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

”وہی پوچھ رہا ہوں، وہ کون ہے؟“

”زرین عالم۔“ نام سنتے ہی ارحم کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا اور وہ بڑی ہی حیرانگی اور ناگواری سے فضیل کو دیکھنے لگا تھا۔

”تیری آنکھوں میں لکھی ناگواری کی تحریر سے بچنے کے لئے ہی میں نے کبھی تجھے نام نہیں بتایا، جب کہ میں نے محبت کی ہر شدت تجھ سے شیر کی ہے، میں جانتا ہوں ارحم! کہ زرین تیری کزن ہے اور عزت و غیرت دار بھائیوں کے لئے کسی غیر مرد کے منہ سے اپنی بہن کا نام سننا ممکن ہی نہیں ہوتا اور باخدا میں آج بھی تجھ سے کچھ نہ کہتا مگر اب میرا زرین سے شرعی رشتہ جوڑنے والا ہے اس لئے مجھے کچھ بتانا معیوب نہیں لگا۔“

”تو کیا کہہ رہا ہے، یا کہنا چاہتا ہے؟ میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”کیا مطلب.... کیا تجھے نہیں پتہ کہ زرین کی مجھ سے شادی ہونے والی ہے؟“ اُس کے نفی میں سر ہلا دینے پر اُس کی حیرانگی بڑھ گئی تھی۔

”مجھے واقعی ایسی کسی بات کا علم نہیں ہے۔“ وہ زور دے کر بولا تھا۔

”کل ہی تو تمہارے ماموں جان نے ہمیں مثبت جواب دیا ہے اور انہوں نے کہا کہ منگنی وغیرہ سے بہتر 3 ماہ بعد شادی۔“

”ادھر مری نہیں.... پوری بات تفصیل سے بتاؤ۔“ ارحم نے اُسے ٹوکا تھا اور وہ اُسے تفصیل بتانے لگا تھا۔

”تم تو جانتے ہو ارحم! کہ فیصل کی بات ماموں کی بیٹی سمیرا سے ملے ہے اور ممائی کی ڈیٹھ کو کافی عرصہ ہو گیا ہے اور آج کل ماموں جان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی بس اسی لئے وہ شادی پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کی اکلونی بیٹی کی شادی ان کی زندگی میں ہی ہو جائے بس اسی لئے ممائی میرے سر پر سوار ہو گئیں کہ میں شادی کے لئے حامی بھریوں کیونکہ وہ ہم دونوں بھائیوں کی شادی ساتھ کرنا چاہتی ہیں، ویسے بھی فیصل مجھ سے چھوٹا ہے اور مجھ سے پہلے اس کی شادی وہ کرنا نہیں چاہتیں، اسی لئے ممائی نے کہا مجھے کوئی پسند ہے تو میں بتا دوں ورنہ وہ خود میرے لئے لڑکی پسند کر لیں گی، اور میں نے زرین کا نام لے دیا اور ماما وہ تو فوراً ہی راضی ہو گئیں، اُسی وقت تمہاری ماما کو فون کیا کہ وہ تمہارے ماموں سے میرے رشتے کی بات کریں، 3 دن بعد ہی آنٹی کا فون آ گیا کہ ممابا قاعدہ میرا رشتہ لے کر تمہارے ماموں کے گھر چلی جائیں اور آج سے 2 دن پہلے ہی ماما زرین کا رشتہ لے کر گئیں جو اُسی وقت منظور ہو گیا، تمہارے ماموں جان کی مرضی تھی کہ ابھی منگنی ہو جائے سال بھر بعد شادی، مگر ماموں کی طبیعت کے پیش نظر تمہارے ماموں راضی ہو گئے، کل ہی تو تمہاری ممائی نے فون کر کے کہا تھا کہ 3 ماہ بعد کی ڈیٹھ فکسڈ کر لیتے ہیں، کیونکہ میرا خیال ہے ارحم اور ماما کی شادی بھی ساتھ ہی ہوگی۔“ فضیل نے ساری تفصیل بتا کر آخر میں اپنا خیال بھی ظاہر کر دیا تھا۔

”اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔“

”تیری مصروفیت.....!“

”کہیں کا وزیراعظم نہیں لگ گیا ہوں جو مجھے ذرا سی بھی فرصت نہیں ہے، مجھے ہر بات سے ایسے بے خبر رکھا گیا جیسے میرا کسی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“ ارحم کو حقیقتاً دکھ پہنچا تھا۔

”تُو فضول میں بدگمان ہو رہا ہے ارحم! اور نہ جو کچھ ہوا وہ محض 3 دنوں میں ہی ہوا، اور میں نے تو تجھ سے کبھی کچھ

www.paksociety.com

نہیں چھپایا تو اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی تھی سے کیوں چھپاتا؟ مگر تو ہرٹ ہوا ہے تو آئی ایم سوری ارخم! مجھے تیری ناراضی کی فکر نہ ہوتی تو میں تجھے ضرور بتاتا کہ زمین کے لئے میں کس طرح سے سوچتا ہوں، ریلی ویری سوری!“

فصیل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور وہ ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔
”اُس اوکے، لیکن تجھے کیا لگتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تو زمین کو پسند کرتا ہے، اتنا بے وقوف نہیں ہوں، سب خبر تھی مجھ کو کہ تیرے کیا ارادے ہیں۔“ وہ فصیل کو تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر بولا تھا۔
”تُو نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔“ وہ متحیر ہوا تھا۔

”جب تُو نے مجھے نہیں بتایا تھا تو میں کیوں ظاہر کرتا کہ میں تیرے بتائے بغیر بھی تیرے دل کی بات جان گیا ہوں اور احسان مان میرا کہ میں نے تیرے عشق کی نیا کو ڈوبنے سے بچالیا۔“ فصیل اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔
”مما، زمین کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔“

”واٹ...؟“ اس کے انکشاف پر وہ بڑی طرح چلا یا تھا۔
”زیادہ مت چلا، ایسا نہ ہو پیرے تجھے اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر پھینک دیں۔“ اس کی کیفیت سے وہ حظ اٹھا رہا تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں تیرا گلاباؤں، صاف صاف بول آ خرابات کیا ہے؟“
”بات کچھ نہیں ہے، مما چاہتی تھیں کہ میری شادی زمین سے ہو جائے مگر میں نے زمین کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔“

”سوچنا بھی مت، ورنہ جان لے لوں گا۔“
”ہاں، مار لے جتنے ڈائلاگ مارنا ہے مار لے، ابھی تو بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے ورنہ منہ کو بے بیٹھا تھا، وہ تو میری چھٹی جس نے مجھے سمجھا دیا تھا ورنہ، مجھے تو کوئی لڑکی پسند نہیں تھی میں نے ممّا کی پسند کی لڑکی پر سر جھکا دینا تھا اور تُو نے ناکام عاشق بن جانا تھا، منہ سے پھر بھی کچھ نہ کہتا مجھے رقیب سمجھ کر رات دن کو ستا رہتا، پھر کہاں کا دوست اور کہاں کی یاری؟“ اس نے زبردست طریقے سے فصیل کو تڑا تھا۔

”دوست ہو تو تیرے جیسا، جیو میرے یار! ویسے یہ بتا کہ میری پسند ہے نالا جواب؟“ وہ کہاں زیادہ دیر سنجیدہ رہ سکتا تھا۔
”ہاں، تمہاری پسند واقعی لا جواب ہے، زمین لاکھوں میں ایک لڑکی ہے اور کان کھول کر سن لے تُو نے میری بہن پر ظلم کرنے کی کوشش کی تو حوالات میں بند کر دوں گا۔“ اُس نے اپنی وردی کا رعب جھاڑا تھا۔

”آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر سالے صاحب! میری یہ مجال کہ میں ایک انسپکٹر کی بہن پر ظلم و ستم کروں، معافی دینا سرکار!“ اس نے ہنستے ہوئے مسخرے پن سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے اور اس نے بھی جواباً ہنستے ہوئے ہاتھ مٹا سنا کر اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر مارا تھا۔

”یار! میں بہت خوش ہوں، مگر یہ نہیں جانتا کہ زمین میرے بارے میں کیا سوچتی ہے وہ اس رشتے سے خوش ہے بھی یا نہیں؟“ نئی فکر لاحق ہوئی تھی۔

”تُو زیادہ کیوں سوچتا ہے، جب اتنے برس انتظار کیا ہے تو 3 ماہ اور سہی، بتا دینا اسے اپنی محبت کی داستان، اور ان کی شدت، اور ویسے بھی لڑکیاں تو ہوتی ہی بہت معصوم ہیں، جہاں ان کے پیرئیں شادی کر دیتے ہیں کر لیتی ہیں جس سے شادی ہوئی ہو وہ ناپسند بھی ہو تب بھی خود کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھال کر تن و من سے صرف اسی

ہو جاتی ہیں۔“

”تجھے بڑا ایکسپیرٹنس ہے، کسی کو کہیں تُو دل تو نہیں دے بیٹھا، بتا کون ہے؟“

”میری زندگی میں ابھی تک کوئی لڑکی نہیں ہے، جب کبھی دل سے کسی کا گزر ہوا تو سب سے پہلے تجھے ہی بتاؤں گا۔“ چچی سے کہا تھا۔

”میرا خیال ہے تجھے بھی اب سیریس ہو جانا چاہیے اور میرا نہیں خیال کہ آنٹی تیری شادی سے پہلے راحم کی کریں گی۔“

”یار! میں شادی سے انکار نہیں کرتا، مگر ابھی بالکل نہیں کر سکتا، ابھی تو میرا کیریئر شروع ہوا ہے، مجھے ابھی اپنی پہچان بنانی ہے، کم از کم 4 سال تک تو میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس سلسلے میں میری ممّا سے بات ہو چکی ہے، اس لئے وہ راحم کی شادی کر دیں گی اور جہاں تک میری بات ہے اگر کوئی پسند آگئی تو ممّا کو بتا دوں گا اور نہیں آئی تو ممّا کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی تھی اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے جانے کے لئے اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے ایک بھر پور شام ایک ساتھ گزاری تھی اور یہ بہت دنوں بعد ہوا تھا ورنہ روز ہی اس طرح گھنٹوں کے لئے ملا کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

”اتنی صبح کہاں جانے کی تیاری ہے؟“ اججد نے نک سسک سے تیار خنیں کو دیکھ کر استفسار کیا تھا۔ وہ اپنی معمول کی تیاری سے بہت ڈیفرنٹ تیار ہوئی تھی کیونکہ وہ عموماً ڈارک کلرز پہنتی تھی جبکہ اس وقت اس نے لائٹ آسمانی ٹکڑا کا کٹن کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر فیروز کی ٹکڑی سے ہاتھ کی کڑھائی تھی اور لائٹ نیچرل میک اپ میں اس کے خوبصورت نین نقش ابھر کر اس کو مزید خوبصورت بنا رہے تھے۔

”اججد بھائی! آج آفس میں میرا فرسٹ ڈے ہے، میں آج سے آفس جوائن کر رہی ہوں۔“ اُس نے سلاکس کترتے ہوئے بتایا تھا۔

”تم آفس نہیں آؤ گی۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا۔

”آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں بتا یا ابو سے اجازت لے چکی ہوں۔“

”میں ابو سے بات کر لوں گا مگر تم سن لو کہ تم گھر میں رہو گی، آفس جوائن نہیں کرو گی۔“ وہ ناشتہ کیے بغیر کرسی کھسکا کر اُسے گھورتا ہوا اٹھ گیا تھا اور اُسی وقت ساجدہ بچن سے نکل کر آئی تھیں۔

”اججد بیٹا! تم ناشتہ کر لو، اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

”قطعاً نہیں چچی! ابو نے اس کو اجازت دے کیسے دی؟“

”آپ جا کر خود اُن سے پوچھ لیں اور میں آفس ضرور آؤں گی، آپ مجھے روک نہیں سکتے۔“ وہ آرام سے ناشتہ ختم کر رہی تھی۔

”میں بھی دیکھتا ہوں، تم کیسے آفس آتی ہو۔“ وہ غصے سے کھولتا پلٹا تھا کہ باپ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

”اججد! ناشتہ کر لیا؟“ راشدہ نے پوچھا تھا مگر اس نے جواب دینے کی بجائے باپ سے پوچھا تھا۔

”ابو! آپ نے اسے آفس جوائن کرنے کی اجازت کیوں دی؟“

”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ وہ بیٹے کے غصے کو کسی خاطر میں نہیں لائے تھے۔

”ابو! مجھے اعتراض ہے، خنیں آفس نہیں آئے گی۔“

”میں حنین کو اجازت دے چکا ہوں۔“

”آپ نے شازمین کو تو اجازت نہیں دی تھی، پھر حنین کو کیوں دی؟“

”تمہیں صرف اس لئے اعتراض ہے کہ میں نے شازمین کو اجازت نہیں دی تھی؟“

”یہ بات نہیں ہے ابو! کیونکہ میرے لئے جیسے شازمین ہے ویسی ہی حنین بھی ہے، اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میری بہن نوکری کرے۔“

”میں کہیں اور جاب نہیں کر رہی، اپنے خاندانی بزنس۔۔۔!“

”جاب، جاب ہوتی ہے حنین! اور یہ میں نہیں چاہتا کہ تم آفس آؤ۔“

”مگر میں آؤں گی، کیونکہ اگر بزنس پر آپ کا حق ہے تو میں بھی اس بزنس پر پورا حق رکھتی ہوں، ابو کی تمام پر اپنی کی میں اکیلی وارث ہوں۔“ وہ بے سوچے سمجھے کہتی سب کو حیرانگی کے اتھاہ سمندر میں اتار گئی تھی۔

”حنین! تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی ایسی گری ہوئی بات کرنے کی؟“ ساجدہ نے غصے سے اُسے تھپڑ کھینچ مارا تھا سب جو اس کی بات کے اثر سے ہی نہیں سنبھلے تھے کہ ساجدہ کا اقدام انہیں مزید حیران کر گیا تھا۔

”خبردار، جو ایسا کچھ منہ سے نکالا، بھائی صاحب کے ہم پر احسان کم نہیں ہیں اور تم احسان فراموش!۔۔۔!“ انہوں نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا تھا کہ راشدہ بیچ میں آگئی تھیں۔

”ساجدہ! پاگل ہو گئی ہو؟“

”اس لڑکی نے مجھے پاگل ہی تو کر دیا ہے، اتنی محبتوں کے صلے میں یہ آپ لوگوں کو کیا دے رہی ہے؟“ وہ افسوس اور تاسف بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

”اور میرا فیصلہ بھی نہیں بدلے گا، تم آفس میں قدم بھی نہیں رکھو گی۔“ وہ اُسے حیران نظروں سے دیکھتا اپنا بریف کیس اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔

”دیکھ لیا تم نے، زندگی میں پہلی دفعہ ساجدہ صرف تمہاری وجہ سے بھوکے پیٹ غصے میں نکلا ہے، میں تمہیں۔۔۔“

”ساجدہ! بات کو بڑھانے سے فائدہ نہیں ہے۔“ انہوں نے ساجدہ کو قابو کیا تھا جو بیٹی کو مارنے کے لئے لپکی تھیں۔

”تایا ابو! جب آپ نے خود مجھے اجازت دی ہے تو ساجدہ بھائی مجھے کیسے منع کر سکتے ہیں؟“

”حنین! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جاؤ، میں ساجدہ کو سمجھاؤں گا۔“

”لیکن تایا ابو! آج مجھے آفس جوائن کرنا تھا، آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔“

”حنین! تم سے نوید نے کچھ کہا ہے، تمہیں سنائی نہیں دیتا؟“ راشدہ کے ڈپٹے پر وہ بات روک گئی تھی۔

”آج نہیں تو کل، لیکن مجھے ہر حال میں آفس جوائن کرنا ہے، ساجدہ بھائی نہیں چاہے کہ میں آفس جاؤں تو میں کہیں اور جاب ڈھونڈ لوں گی، مگر یہ تو طے ہے کہ مجھے جاب کرنی ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی جبکہ اس کی اتنی بدتمیزی پر سب ہی حیران رہ گئے تھے۔

”آپ سب لوگوں سے میں بے حد شرمندہ ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ابھی اتنی بدتمیزی جو کر کے گئی وہ میری ہی بیٹی ہے، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری بیٹی بڑی ہو کر اس قدر بد لحاظ و بد تمیز ہو جائے گی۔“ وہ کسی کو بھی دیکھے بغیر کہہ کر روٹی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھیں، آج صبح معنوں میں انہیں شوہر کی کمی محسوس ہوئی تھی، مگر اسے میں بھی آ کر دیکھتی ہی دیر روٹی رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”آپ میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے؟“ ساجدہ کا آج دماغ گھوما ہوا تھا وہ درگزر کے ساتھ اونچی آواز اور سختی کا قائل ہی نہیں تھا مگر آج جو کچھ ناشتے کی ٹیبل پر ہوا اُس کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا، وہ اپنے اسٹنٹ اور پرنٹل سیکریٹری کو بھی ڈانٹ چکا تھا، وہ پہلے ہی غصے میں تھا اور مستقل آتی کال اُس کے غصے میں اضافے کا باعث بن رہی تھی، اُس نے طیش کے عالم میں موبائل دیوار پر مارنا چاہا تھا کہ میسج ٹون بجی تھی اور نجانے کیا سوچ کر اس نے میسج اوپن کیا تھا۔

”آپ نے اب میری کال ریسیو نہیں کی تو میں آپ سے اتنی دور چلی جاؤں گی کہ آپ میری آواز سننے اور شکل دیکھنے کو بھی ترس جائیں گے۔“ میسج پڑھنے کے بعد خود بہ خود اُس کی انگلیاں کال ملانے لگی تھیں۔

”ہیلو!“ بڑی بے قراری سے کہا گیا تھا۔

”فارغ نہیں بیٹھا تھا کہ تمہاری کال فوراً ریسیو کر لیتا، ہزاروں کام ہوتے ہیں۔“

”آپ مجھ سے اس طرح بات کیوں کر رہے ہیں؟“

”دماغ خراب ہو گیا ہے میرا، اور بس۔۔۔!“ تم کہو ایسی کیا ایمر جنسی تھی کہ اسی وقت بات کرنا تھی، اور میسج میں کیا بکواس لکھی تھی؟“

”وہ بکواس نہیں تھی، خالہ جان میری شادی کر رہی ہیں، اور میں صرف آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں ساجدہ! آپ اپنے پیرنٹس کو میرا رشتہ لے کر بھیجیں۔“

”جہاں تمہارے گھر والے تمہاری شادی کر رہے ہیں وہیں خاموشی سے شادی کر لو۔“ یہ بات اُس نے جس طرح کہی تھی یہ وہی جانتا تھا اور فون کی دوسری جانب موجود سیرٹی کانپ ہی تو گئی تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”سنائی نہیں دیتا تھا تو ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں، میرا خیال دل سے نکال کر جس سے خالہ تمہاری شادی کریں کر لو، میرے پیرنٹس تمہارے گھر نہیں آئیں گے۔“

”لیکن کیوں ساجدہ؟ آپ نے تو کہا تھا آپ اپنے پیرنٹس۔۔۔!“

”وہ سب جھوٹ، بکواس تھا۔“

”آپ مجھ سے فلرٹ کر رہے تھے؟“ اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی۔

”یہی سمجھ لو اور آئندہ اس نمبر پر کال۔۔۔“

”آپ بھلے مجھ سے فلرٹ کر رہے ہوں، مگر میں نے آپ سے سچی محبت کی ہے۔“

”قصے کہانیوں کی روداد مجھے مت سناؤ۔“

”آپ کو میری محبت جھوٹی داستان لگتی ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ ایسا کریں گے۔“

”اب پتہ چل گیا ہے ناں، تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

”مجھ سے پیچھا چھڑانے کی بہت جلدی ہے ناں آپ کو، تو میری بھی سن لیں، میں نے صرف آپ سے محبت کی ہے، اور میں جان تو دے سکتی ہوں مگر کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی، بہت جلد آپ کو میری شادی کی نہیں موت کی خبر سننے کو ملے گی۔“

”سیرٹی!“ آفس کی چھت اُسے اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔

”فلرٹ آپ کر رہے تھے، میں نہیں، اور میں محبت پر جان قربان کر دوں گی۔“ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، مگر آنسو اس کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔

”پاگل ہو گئی ہو سیرٹی!“
 ”ہاں، ہاں! میں پاگل ہو گئی ہوں، آپ کی محبت و چاہت میں۔“
 ”فضول باتیں مت کرو۔“

”آپ کو میری محبت فضول لگتی ہے اور میں ثابت کر دوں گی کہ میری محبت آپ کی محبت کی طرح جھوٹ، فریب نہیں ہے۔“ اس نے موبائل آف کر کے بیڈ کی سائیڈ پر ڈال دیا تھا اور نیچے میں منہ چھپائے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی، اسجد تو اس کی اتنی شدت پر حیران رہ گیا تھا اور بڑی بے قراری سے اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا، بیل تو جا رہی تھی مگر وہ ریسپونڈ نہیں کر رہی تھی۔

”ویم! کال! کال! تو ریسپونڈ کرو پاگل لڑکی!“ آٹھویں کال پر اس نے لیں کیا تھا۔
 ”سیرٹی!“

”مرگئی سیرٹی، آپ نے مار دیا اُسے، اب یہاں کال کیوں کر رہے ہیں؟ فلرٹ کر رہے تھے ناں مجھ سے؟ تو اب کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ میں جیوں یا مروں آپ کو اس سے مطلب؟“
 ”مطلب ہے۔“ اس کی بھرائی ہوئی آواز اُسے پریشان کر رہی تھی۔
 ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی، بہت بنا لیا آپ نے مجھے بے وقوف، مگر اب میں آپ کے ہاتھوں بے وقوف ہرگز نہیں بنوں گی۔“

”میری بات تو سنو سیرٹی!“
 ”نہیں سننی مجھے آپ کی کوئی بات، آپ بہت امیر ہیں نا؟ آپ کو تو کوئی بھی مالدار لڑکی مل سکتی ہے، میری جیسی غریب لڑکیوں سے تو آپ جیسے امیر زادے شخص فلرٹ کرتے ہیں، ہمارے جذبات سے کھیلتے ہیں، ہماری بے بسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔“
 ”بکو اس نہیں کرو۔“

”اب میری ہر بات بکو اس ہی لگے گی نا، مگر میں بکو اس نہیں کر رہی اسجد! آپ نے میرے جذبات کو بری طرح ٹھیس پہنچائی ہے، مجھے زندگی کبھی اچھی نہیں لگی، سسکتی ہوئی زندگی، آپ سے ملنے کے بعد جانا زندگی کتنی حسین ہے، جینے کی تمنا کرنے لگی تھی میں، اور آج آپ نے ساری تمناؤں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا، میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی، میری موت کے بعد تو آپ بھی سکون سے نہیں جی سکیں گے۔“

”شٹ اپ، اب ایک لفظ اور کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا، اسٹاپ پر آؤ، میں تمہیں پک کر لوں گا۔“ وہ اٹھنے ہوئے غصے سے کہہ رہا تھا۔

”مگر میں.....!“
 ”کہاناں..... کچھ مت بولو۔“ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے اُسے ڈپٹا تھا۔

”میں نہیں آؤں گی۔“ وہ چیختی تھی۔
 ”میں پہنچ کر تمہیں میسج کر دوں گا، اور تم 5 منٹ میں نہیں آئیں تو میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔“ پارکنگ کی طرف

جاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

”آپ اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ وہ دھیمی پڑ گئی تھی۔
 ”آؤ تو بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا، اس کے آفس سے سیرٹی کے گھر تک کا راستہ تقریباً 45 منٹ کا تھا مگر وہ محض 25 منٹ میں ریش ڈرائیونگ کرتا وہاں پہنچا تھا، میسج کرنے کے 10 منٹ بعد وہ ایک تنگ، پتلی سی گلی سے آتی دکھائی دی تھی، اور اُس نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

”آپ کو جو بات کرنی ہے یہیں.....“
 ”خاموشی سے بیٹھتی ہو یا چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ زبردستی کروں؟“ اسجد نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا، ملگجے کاشن کے پرنڈ سوٹ میں بڑی سی سیاہ چادر میں وہ خود کو لپیٹے اور اُسی کا حصار چہرے پر کیے بھیگی آنکھوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور اُس نے فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی وہاں سے بڑی تیزی سے نکالی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھابی بیگم! آپ بات کر لیں بھائی صاحب سے، پھر وہ جیسا کہیں گے میں مہوش سے کہہ دوں گی۔“
 ”وہ سب تو ٹھیک ہے فریدہ! مگر مجھے نہیں لگتا کہ نوید راضی ہوں گے، 15، 20 دن میں شادی کرنا آسان نہیں ہے۔“ وہ گوگولی کیفیت میں بولی تھیں۔
 ”بھابی بیگم! تیاریاں تو 20 دن میں بھی ہو سکتی ہیں، اور فضیل دیکھا بھالا لڑکا ہے، فیملی کو ہم اچھے سے جانتے ہیں اور مہوش کو جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔“

”لیکن فریدہ! ہم بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت تو نہیں کر سکتے۔“
 ”لیکن جہیز لینے سے مہوش اور فیاض بھائی دونوں نے ہی سختی سے منع کر دیا ہے، وہ کہہ رہے تھے شادی 20 دن میں ہو یا 20 ماہ بعد، وہ جہیز نہیں لیں گے، خدا کا دیا اُن کے پاس سب کچھ ہے وہ صرف زمین کو رخصت کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔“

”یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہیں، گھر آؤ گی تو بات کریں گے، ہم اپنی لڑکی کو خالی ہاتھ تو کبھی رخصت نہیں کریں گے، یہ بات مہوش کے کان میں ڈال دینا۔“
 ”مہوش سے میری تفصیل سے بات ہو چکی ہے، وہ جہیز لینے سے منع کر رہی ہے مگر اُس نے کہا ہے کہ آپ زمین کو جو دینا چاہیں دے سکتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“
 ”ارے بھابی بیگم! صاف بات تو ہے، گھر کے ساز و سامان یعنی فریج، ٹی وی، فرنیچر وغیرہ جیسی چیزوں سے ہٹ کر آپ زمین کو زور پور، کپڑے جو چاہیں دیں، وہ لوگ زمین کو کچھ دینے سے منع نہیں کر رہے اور جب ان کے گھر میں یہ سارا سامان پہلے سے موجود ہے تو وہ نہیں لینا چاہ رہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے، آپ یہ سب بھائی صاحب کو بتا کر کوئی فیصلہ کر لیں، میں رات کو یا پھر کل فون کروں گی۔“ ارحم کو تو آتے دیکھ انہوں نے کہا تھا اور فون رکھ کر اس تک بھی آئی تھیں۔

”السلام وعلیکم! مم!“

☆.....☆.....☆

(جاری ہے)

انعم نذیر

مکمل ناول

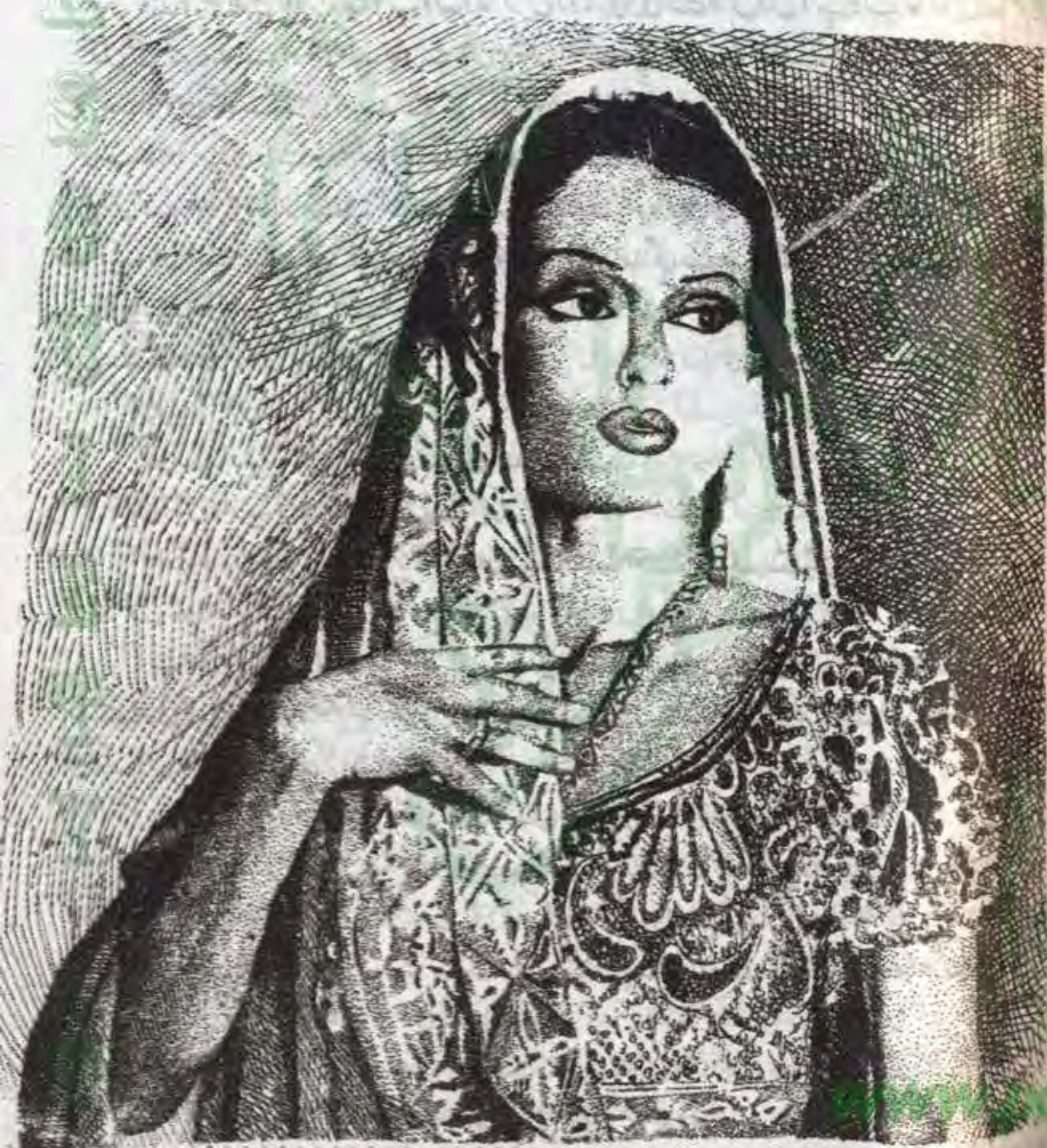
میری عید تھی ہو

آخری حصہ

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اچھی طرح چیک کرنا تھا آپ اچھی طرح دوبارہ دیکھیے“ میں زید بھائی کو فون کرتی ہوں۔“



”کیا ہوا زاریہ! صائم کہاں ہے؟“ بھابی نے بے قراری سے پوچھا۔
 ”بھابی! صائم اسکول میں نہیں ہے نہ ہی اسکول کے باہر ہے۔“ زاریہ نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا بھابی دھواں دھار روئے لگیں۔
 ”پلیز بھابی! حوصلہ کریں میں زید بھائی کو فون کرتی ہوں۔“
 ”زید بھائی! وہ صائم اسکول سے غائب ہے۔“ زید کے ہیلو کہتے ہی اس نے بے قراری سے کہا۔
 ”کیا کہہ رہی ہو؟ زاریہ!“ وہ گھبرایا۔
 ”اوکے میں آتا ہوں۔“ زید نے غلت میں کہا اور فون بند کر دیا۔
 ”بھابی! پلیز.... رویئے نہیں دعا کریں زید بھائی آ رہے ہیں۔“ پچھو بھی بازار سے آئیں تو ان دونوں کو روتا دیکھ کر گھبرا گئیں۔
 ”نمرہ زاری! کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو تم دونوں؟“



”وہ پھپھو! صائم اسکول سے غائب ہو گیا ہے۔“ زاریہ نے روتے ہوئے کہا، پھپھو ان دونوں کو حوصلہ دے رہی تھیں اور خود بھی رو رہی تھیں، شام کو زید بھائی اور ڈرائیور لوٹے خالی ہاتھ۔

”زید! میرا بچہ کہاں ہے؟“ بھابی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں، پھپھو کی حالت بھی کچھ کم نہ تھی، زید بھائی خود بہ حد نہ حال لگ رہے تھے اس نے فوراً ذوالنون شاہ کو فون کیا۔

”زاریہ! میں تم سے گھر آ کر بات کرتا ہوں، میں ابھی ایئر پورٹ سے باہر نکلنے لگا ہوں، آفس میں کچھ کام ہے اس لئے یہاں سے سیدھا آفس جا رہا ہوں، رات کو بات ہوگی۔“

”ذوالنون! میں نے ضروری بات کرنی ہے، صائم کو کسی نے کڈ نیپ کر لیا ہے، اس نے بڑی طرح روتے ہوئے کہا۔

”پلیز.... ذوالنون! گھر آ جاؤ، ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔“ اس نے ملتی ہو کر کہا۔

”اوکے.... زار! میں آ رہا ہوں، تم پریشان مت ہو۔“ پندرہ منٹ بعد وہ ان کے گھر تھا۔

”پلیز پھپھو، بھابی اور زاریہ! آپ لوگ دعا کریں، روٹا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں، آپ لوگ دعا کریں، صائم جہاں

کہیں بھی خیریت سے ہو، ہم لوگ جا رہے ہیں پولیس اسٹیشن رپورٹ درج کرواتے ہیں، انشاء اللہ صائم مل جائے گا۔“

ذوالنون شاہ نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ رپورٹ درج کروادی گئی، لیکن ان لوگوں کو ایک پل بھی سکون کا

نصیب نہ ہوا، ساری رات صائم کو یاد کرتے اور روتے ہوئے گزار دی، ذوالنون شاہ مسلسل ان لوگوں کے ساتھ تھا

صبح اس نے بہلا پھسلا کر سب کو ناشتہ کروایا، جو برائے نام تھا، نمرہ بھابی کی حالت دیکھ کر اس کا دل بہت دکھی ہو رہا

تھا، ایک ماں اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی تھی، ذوالنون شاہ خود بھی بے حد پریشان تھا، ابھی تک تو کڈ نیپ کا فون

آ جانا چاہئے تھا، زاریہ کسی کام سے اپنے کمرے میں گئی، اس کا فون مسلسل بج رہا تھا، کال انجان نمبر سے آرہی تھی

اس نے کچھ سوچ کر کال پک کر لی۔

”ہیلو....!“ اس نے بمشکل کہا۔

”کون.... زاریہ؟“ فون کرنے والے نے تصدیق کی۔

”جی! میں زاریہ! آپ کون؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”انوار شاہ.... کیسا لگا میرا سر پرانز؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، ایک لمحے میں وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی

فیصلہ منٹوں میں ہو گیا تھا، وہ دنگ رہ گئی تھی۔

”آپ صائم کو چھوڑ دیں، آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“ اس نے بڑی طرح روتے ہوئے کہا، اس کے

سامنے بھابی کا روتا ہوا چہرہ گھوم گیا، پھپھو کی سسکیاں زید بھائی کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ، کل سے اب تک سب

ہی لوگ اس اذیت سے گزر رہے تھے۔

”آپ ابھی صائم کو گھر پہنچا دیں، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی، صائم کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے، پندرہ منٹ میں صائم گھر پہنچ جائے گا۔“ انوار شاہ نے کہا، فون بند ہو چکا تھا۔ وہ وہیں کارپٹ پر

گر گئی، اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی، کس گناہ کی سزا اسے مل رہی تھی، کیسا امتحان تھا جو اس سے لیا

جا رہا تھا؟ ذوالنون شاہ کو چھوڑنا اس کے بس میں نہ تھا، کیسے رہ پائے گی وہ اُس کے بغیر؟ جانے وہ کتنی دیر اس طرح

روتی رہی، جیسی ذوالنون شاہ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”زار.... زاریہ! صائم گھر آ گیا ہے۔“ اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ وہ حسرت سے اس شخص کو دیکھنے لگی، جس کا

ساتھ بس یہیں تک تھا۔

”زاریہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ ذوالنون شاہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا شانہ ہلایا، وہ بے ساختہ اس

کے کندھے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیسے وہ اس پیارے انسان کا دل توڑ دے؟ آنسو روانی سے بہہ

رہے تھے، پھر وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی نیچے آ گئی، صائم کو خود میں سمجھتے ہوئے پھر سے رونے لگی، بے ساختہ اس کی

پیشانی بار بار چوم رہی تھی، پھپھو نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو الگ کیا۔

”زاریہ! میری جان! چپ ہو جاؤ۔“ پھپھو نے اسے اپنے ساتھ لگالیا، لیکن وہ اسی شدت سے روتی رہی، وہ

انہیں کیسے بتاتی کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئی، جو شخص اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا، اس کی

محبت تھا، وہی اس سے چھینا جا رہا تھا۔

”زاریہ! اچپ کرو، صائم ماشاء اللہ سے بالکل ٹھیک ہے۔“ ذوالنون شاہ نے کہا، وہ تو اس کے آنسو دیکھ کر بے

چین ہو گیا تھا، ابھی اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی، جس میں وہ بڑی طرح ناکام

ہو گئی، سر جھکا کر آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔



اس حادثے کو پانچ دن بیت گئے تھے، وہ سب حیران تھے، اغوا کرنے والوں نے بغیر کسی ڈیمانڈ کے صائم کو چھوڑ

دیا، اگر ایسا کرنا تھا تو اغوا کیوں کیا؟ سوائے زاریہ کے اور کسی کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔

”دفعہ کرو اب اس معاملے کو، ہمیں ہمارا بیٹا مل گیا۔“ پھپھو نے محبت سے صائم کی پیشانی چوم کر کہا۔

”زاریہ بی بی! آپ کا فون کب سے بج رہا ہے۔“ ملازمہ نے کہا تو وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”السلام وعلیکم! مام....! کیسی ہیں آپ؟“

”علیکم السلام! مائی ڈیئر! میں بالکل ٹھیک ہوں، میری بیٹی کیسی ہے؟“ علیناہ شاہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔“ زاریہ نے آہستگی سے کہا۔

”زاریہ! یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟“ علیناہ شاہ نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں مام! بس گلا خراب ہے، اس لئے آواز کچھ بھاری سی ہے۔“ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا، میڈیسن لی؟“ علیناہ شاہ نے فکر مندی سے کہا۔

”جی مام! لی ہے۔“ زندگی میں پہلی دفعہ اپنی ماں سے جھوٹ بولا تھا۔

”مام! عمان اور ڈیڈ کیسے ہیں، اور تیا مام کیسا ہے؟“

”عمان اور نیل بھی ٹھیک ہیں، اور تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔“ علیناہ شاہ نے اداسی سے کہا۔

”مام! میں بھی آپ سب کو بہت مس کرتی ہوں۔“ وہ رونے لگی، علیناہ شاہ بوکھلا گئی۔

”زاریہ....! میری جان! تم رو کیوں رہی ہو؟“ علیناہ شاہ بے چین ہو گئیں۔

”مام! آئی مس یو! میں لندن آنا چاہتی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”زاریہ! نیکسٹ ماہ تمہاری منگنی ہے، ہم سب آرہے ہیں پاکستان، اس طرح اچانک تمہارا لندن آنا مناسب

نہیں ہے۔“ علیناہ شاہ نے رسان سے کہا۔

”منگنی....! کیسی منگنی مام! سب کچھ تو ختم ہو گیا۔“ اس نے دل میں کہا، وہ سسک اٹھی تھی۔

”زاریہ! کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟“ علیناہ شاہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”نہیں مام! آپ سب سے ملے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں، کبھی اتنا لمبا عرصہ آپ سے دور نہیں رہی اس دل بھر آیا تھا۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”ہم سب بھی تم سے ملنے کے لئے بے چین ہیں، ان شاء اللہ اگلے ماہ ہم آ رہے ہیں اور اپنی بیٹی کی منگنی بہر شاندار طریقے سے کریں گے۔“ علینا شاہ نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”او کے مام! میں پھر آپ سے بات کروں گی، بھابی مجھے ۱ رہی ہیں۔“ اسے اب خود پر کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا، تبھی فون بند کر دیا۔ وہ ونڈو میں آکھڑی ہوئی، سامنے ”وائٹ محل“ پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑا تھا، کتنی یادیں اس محل کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں، ذوالنون شاہ کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ اسے یاد آئے لگا۔

”انوار شاہ! مجھے بلیک میل کر رہے ہیں، میں کسی بھی قیمت پر ذوالنون شاہ کو نہیں چھوڑوں گی۔“ اس نے اٹل لہجے میں سوچا۔

”تم نہیں جانتیں زاریہ! یہاں لوگ معمولی معمولی بات پر ایک دوسرے کی جان لے لیتے ہیں، دشمنی کی آگ میں سالوں جلتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کو قبروں میں اتار کر بھی انہیں ٹھنڈک نہیں ملتی۔“ دور سے کہیں ذوالنون شاہ کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکرانی تو وہ گھبرا گئی۔ صائم والا واقعہ تو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

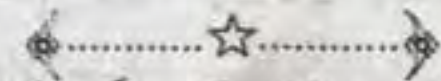
”اور اگر انوار شاہ نے زید بھائی یا مانو کو کچھ کر دیا، نہیں نہیں، میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ اپنی سوچوں میں گھری تھی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل ایک بار پھر بجنے لگا۔ انوار شاہ کا نمبر دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا، اسے ضبط کرنا تھا، اپنے لئے نہیں اپنے پیاروں کے لئے۔

”ہیلو....!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”زاریہ شاہ! میں نے اپنا کہا بچ کر دکھایا، صائم کو چھوڑ دیا، اب تمہاری باری ہے، جلد از جلد اس ایشو کو ختم کرو، منگنی میں تھوڑے دن رو گئے ہیں۔“ وہ ساکت کھڑی انوار شاہ کو سن رہی تھی۔

”ذوالنون شاہ کو خود سے بدگمان کرنا ہے، اتنا کہ وہ تم سے نفرت کرنے لگے، کیسے کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے، یہ تم جانتی ہو۔“ انوار شاہ نے فتح سے پورے لہجے میں کہا۔ لائن کٹ چکی تھی، وہ خالی خالی نظروں سے موبائل کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی، اس نے گہری سانس لی اور ونڈو سے دور آسمان کی طرف دیکھا، آنسو بھری آنکھوں نے جیسے آسمان سے آگے تک کا سفر کیا، اس کے ہونٹوں نے سسکاری بھری۔

”اے رب العزت! اے مالک کائنات! تُو رحیم ہے، کریم ہے، تُو سب جانتا ہے، کون غلط ہے اور کون صحیح، اگر آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں، میری آزمائش لینا چاہتے ہیں تو میں ثابت قدمی سے اس آزمائش پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی، اے اللہ! میرے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دے، میں ثابت قدم رہوں، تیری ہر آزمائش پر پورا اتروں، اللہ پاک! انصاف کرنے کی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، میں اپنا فیصلہ آپ کو سونپ رہی ہوں، آپ میرے ساتھ ضرور انصاف کریں گے۔“ آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر اس کے رخساروں پر گر رہے تھے اور آنکھیں آسمان پر مچی تھیں، دل اللہ سے ہمکلام تھا۔



دو دن اسی کشمکش میں گزر گئے کہ وہ ذوالنون شاہ کو کیا کہے اور کیسے کہے، کئی بار وہ اس کا نمبر ڈائل کر چکی تھی، بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج تیسرا دن اور کل آخری دن۔ وقت بہت کم تھا اس کے پاس، وہ لان میں بیٹھی اس

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

”زاریہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ رہے، میں سوچ رہی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف چلا آیا۔

ہوئے کہا بے اختیار ہی زاریہ کی نظریں انوار شاہ سے ٹکرائیں وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے وہ ایسے دیکھ رہے تھے جیسے
اسے نظروں سے سالم نگل جائیں گے وہ بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی۔

”مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“ زاریہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”کرو بیٹا! کیا بات کرنی ہے؟“ آمنہ شاہ نے مسکرا کر کہا۔

”وہ ذوالنون سے کرنی ہے۔“ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ اس کا دل بہت زوروں سے دھڑک رہا تھا آخری
بار وہ اس شخص سے ہمکلام ہونے والی تھی۔

”ہاں کرو!“ ذوالنون نے کہا۔

”اگر بیٹا! اکیلے میں کرنی ہے تو بے شک لان میں چلے جاؤ۔“ آمنہ شاہ نے کہا۔

”نہیں سب کے سامنے کرنی ہے۔“

”تو کرو... زاریہ! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟“ ذوالنون شاہ نے کہا۔

”مٹگنی سے پہلے میری دو شرطیں ہیں اگر آپ کو منظور ہوں تو میں مٹگنی کروں گی اور اگر نہیں منظور تو نہیں کروں
گی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ذوالنون شاہ کے ساتھ ساتھ حمزہ شاہ اور آمنہ شاہ بھی ٹھٹھک گئیں۔

”زاریہ! مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ ذوالنون شاہ نے جلدی سے کہا۔

”یہ سُنے بغیر ہی کہ میں نے کیا شرط رکھی ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا چند پل ذوالنون شاہ کچھ بول
ہی نہ سکا۔

”بتاؤ بیٹا! کیا شرطیں ہیں؟“ حمزہ شاہ نے لب کشائی کی۔ زاریہ نے ایک نظر ٹی وی لائونج میں موجود چاروں
نفوس کو دیکھا اور پھر بولی۔

”میری پہلی شرط یہ ہے کہ یہ وائٹ محل یعنی ذوالنون شاہ پیلس میرے نام کر دیا جائے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو زاریہ! یہ پیلس میرے نام ہے شادی کے بعد ہم دونوں کا ہے اگر پھر بھی تم چاہتی ہو کہ
تمہارے نام کر دیا جائے تو ٹھیک ہے مٹگنی سے پہلے یہ تمہارے نام ہو جائے گا۔“ ذوالنون شاہ نے بے یقینی سے

اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ تو حیران تھا زاریہ کب سے اتنی مادہ پرست ہو گئی۔

”زاریہ! اتنی سٹی سوچ رکھتی ہے۔“ آمنہ شاہ نے بھی ناگواری سے سوچا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔“ حمزہ شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ انوار شاہ نے بے چینی سے پہلو
بدلا جانے وہ دوسری کیا شرط بتانے والی تھی اور کیا پتہ وہ بھی پہلی شرط کی طرح منظور کر لی جائے۔

”بابا جان! کیا آپ کو زاریہ کی یہ شرط منظور ہے؟“ حمزہ شاہ نے انوار شاہ سے پوچھا۔

”ہوں...!“ انہوں نے ہنکارا بھرا تو وہ مطمئن ہو گئے جبکہ ذوالنون شاہ نے شکوہ کرتی نظروں سے اسے دیکھ
جیسے کہہ رہا ہو۔

”کیا مجھ پر یقین نہیں تھا؟“

”دوسری شرط بتاؤ!“ حمزہ شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”میری دوسری شرط یہ ہے...!“ اس نے نظریں ذوالنون شاہ کے چہرے پر نکا دیں۔

”شادی کے بعد ذوالنون شاہ کو میرے ساتھ لندن میں رہنا ہوگا۔“ سب نفوس کے ساتھ ساتھ انوار شاہ کو
سانپ سونگھ گیا وہ حیرت سے زاریہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ذوالنون شاہ حیرت و بے یقینی کے ساتھ زاریہ کو دیکھ

تھا۔

”زاریہ! تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟“ ذوالنون شاہ نے غصے سے کہا جبکہ اس کے ماں باپ خاموش کھڑے تھے۔

”میں پاگل نہیں ہوں ایک ایک لفظ اپنے ہوش و حواس میں کہا ہے۔“ اس نے بے مروتی سے کہا۔

”زاریہ! میں اپنے پیرنس کا اکلوتا بیٹا ہوں میں انہیں اکیلا چھوڑ کر تمہارے ساتھ لندن کیسے جاسکتا ہوں؟“

ذوالنون شاہ نے بے بسی سے کہا۔

”میرا پر اہل نہیں تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میری شرط منظور ہے یا نہیں؟“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”لیکن کیوں زاریہ! پہلے تو کبھی تمہاری کوئی ایسی خواہشیں نہ تھیں۔“ ذوالنون نے بے چینی سے کہا ایک طرف
اس کی محبت اور دوسری طرف اس کی فیملی وہ کسی صورت دونوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”پہلے کی بات اور تھی صائم والے حادثے نے مجھے بہت کچھ باور کروا دیا ہے آئے دن یہاں کچھ نہ کچھ ہوتا
رہتا ہے میں کسی بھی صورت اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی اور نہ ہی یہاں رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سنجیدگی
سے کہا۔

”دیکھو... زاریہ! لازمی تو نہیں کہ جو حادثہ دوسروں کے ساتھ پیش آیا ہو وہ ہمارے ساتھ بھی پیش آئے؟“
ذوالنون نے اسے سمجھایا۔

”مجھے کچھ نہیں پتہ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم میرے ساتھ لندن جاؤ گے یا نہیں؟“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”نہیں۔“ ذوالنون شاہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے مجھے یہ مٹگنی نہیں کرنی اور میں کل لندن واپس جا رہی ہوں۔“

”زاریہ! کیا بکواس ہے یہ۔“ ذوالنون شاہ نے ناگواری سے کہا۔

”یہ بکواس نہیں ہے۔“ اس نے چلا کر کہا۔ حمزہ شاہ اور آمنہ شاہ خاموش تماشا شائی بنے ہوئے تھے جبکہ انوار شاہ
کی بے تابی عروج پر تھی۔

”زاریہ پلینز! تم کیوں ایسا کر رہی ہو؟“ ذوالنون شاہ کے لہجے کی تڑپ زاریہ شاہ کا دل چیر گئی تھی لیکن وہ کیا
کرتی، مجبور تھی اس لئے سختی سے اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔

”بس اتنی سی محبت کرتے تھے مجھ سے؟ میری معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں
ہنسی۔

”زاریہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں یہ معمولی سی بات نہیں ہے میں کیسے اپنے ماں باپ اور دادا کو اکیلا چھوڑ
دوں؟“ ذوالنون شاہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی مجھے ہاں یا ناں میں جواب چاہئے۔“ اس نے اٹل لہجے میں کہا۔

”ایک ٹام ہے جو میری بے رخی کے باوجود اپنا سب کچھ میرے لئے چھوڑنے کے لئے تیار ہے اور ایک تم ہو جو
میریاں گنوار ہے ہو۔“ زاریہ نے اس کا صاف مسخرہ اڑایا۔ ذوالنون شاہ کی برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں
آگے بڑھ کر اس نے زوردار تھپڑ زاریہ کے منہ پر دے مارا آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

”اگر اب تم نے کوئی بکواس کی تو تمہاری جان لے لوں گا۔“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

زاریہ! اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ذوالنون شاہ کو دیکھ رہی تھی کہ ذوالنون شاہ نے اسے تھپڑ مارا۔

”تم نے بھی اسے لفظوں کی مار سے اندر تک چھلنی کر دیا ہے۔“ اس کے اندر سے آواز آئی وہ برستی آنکھوں سے

ذوالنون شاہ کو دیکھ رہی تھی پہلی دفعہ کسی نے اسے تھپڑ مارا تھا۔

”صاف کہو زاریہ شاہ! تمہارا ذوالنون شاہ سے دل بھر گیا ہے اس لئے کوئی نام تلاش کر لیا اب فرار کے واسطے ڈھونڈنے کے لئے فضول قسم کی شریٹیں رکھ رہی ہو۔“ ذوالنون شاہ کے لہجے کی کاٹ نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا اس نے تڑپ کر ذوالنون شاہ کی طرف دیکھا۔

”مجھے نہیں پتہ تھا زاریہ شاہ! تم بھی عام لڑکیوں کی طرح عام سی نکلو گی تم نے میرے اعتبار کا خون کیا ہے میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے میری محبت کا جنازہ نکالا ہے میں تمہیں کیا سمجھتا رہا زاریہ شاہ اور تم کیا نظائیں ذوالنون شاہ نے ٹوٹے لہجے میں کہا اور آنکھیں بے اختیار ہی پانیوں سے بھر گئیں۔

”زاریہ! تمہیں مجھ سے نہیں اس محل سے پیار تھا تمہیں فلرٹ کرنے کے لئے صرف ذوالنون شاہ ہی ملا تھا کیوں کی تم نے میرے ساتھ بے وفائی؟ زاریہ شاہ! تم بے وفا ہو۔“ ذوالنون شاہ کی آنکھیں چٹک چٹکیں تیزی سے آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

”تم نے مار دیا ہے ذوالنون کو۔“ میں بے وفائیں ہوں۔“ اس نے تڑپ کر کہنا چاہا لیکن الفاظ لبوں پر ہی دم توڑ گئے وہ ہارے ہوئے جوار کی طرح صوفے پر ڈھے گیا آمنہ شاہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

”زاریہ! تم اس وقت جاؤ پھر سکون سے محل سے بات کریں گے جذبات میں آ کر فیصلہ کرنا سراسر بیوقوفی ہے تم جاؤ ابھی۔“ آمنہ شاہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اس نے بے دردی سے اپنے آنسو گڑے ایک نظر بھر کر ذوالنون شاہ کو دیکھا جو چند لمحوں میں شکستہ ہو گیا تھا پھر وہ بھاگتی ہوئی وائٹ محل سے ہمیشہ کے لئے نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

”زاریہ! کیا ہوا زاری! زکو تو۔“ بھابی نے حیرت سے کہا وہ بنا کسی کی طرف دیکھے بڑی طرح روتے ہوئے لاؤنج سے گزرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ پھپھو اس کی حالت دیکھ کر بدحواس ہو گئیں نمرہ بھابی اور پھپھو اس کے پیچھے لپکیں لیکن تب تک وہ دروازہ بند کر چکی تھی۔

”زاری! ہوا کیا ہے؟ پلیز دروازہ کھولو۔“ نمرہ بھابی نے پریشانی سے کہا نمرہ بھابی اور پھپھو آوازیں دے دے کر تھک گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد زید گھر آ گیا اس عجیب سی پوچھنیشن کو سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”گڑیا! دروازہ کھولو کیا اپنے بھائی کی بات بھی نہیں مانو گی؟“ انہوں نے مان بھرے لہجے میں کہا چند خاموشی سے سرک گئے اور پھر دروازہ کھل گیا پھپھو بے تابی سے آگے بڑھیں اس کے پیچھے زید اور نمرہ بھی تھے۔

”زاریہ! مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے تم ذوالنون شاہ پیس گئی تھیں۔“ زید کے استفسار پر انہوں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ایک بار زید بھائی کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے نظریں پڑا گئی۔

”میں کل صبح 9 بجے کی فلائٹ سے لندن واپس جا رہی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا وہ سارے حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو زاریہ؟“ پھپھو نے بے یقینی سے پوچھا۔

”پلیز پھپھو! کوئی سوال مت پوچھیے گا میرے پاس آپ لوگوں کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں ہے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن زاریہ! اگلے ماہ تمہاری منگنی ہونے والی ہے اس طرح تم اجانف کیسے لندن جا سکتی ہو۔“ نمرہ بھابی نے

جراغی سے کہا۔

”اب کوئی منگنی نہیں ہو رہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لندن واپس جا رہی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو سب اسے دیکھتے رہ گئے۔

”زاریہ! یہ سب کیا ہے؟ ذوالنون شاہ نے کچھ کہا ہے؟“ زید بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟ اچانک اتنا بڑا فیصلہ تم نے اکیلے میں کر لیا؟“ زید بھائی نے تاسف سے کہا۔

”یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اب کسی بھی صورت میں اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”صائم والے واقع نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے یہاں کے حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں میں نے ذوالنون شاہ کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ شادی کے بعد پاکستان نہیں لندن رہوں گی اور اسے بھی میرے ساتھ لندن میں رہنا ہوگا اس نے میری شرط ماننے سے انکار کر دیا اس لئے میں لندن جا رہی ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا وہ سب دنگ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

☆.....☆.....☆

اچانک ہی آسمان کا لے سیاہ بادلوں سے بھر گیا دیکھتے ہی دیکھتے زور و شور سے بارش شروع ہو چکی تھی وہ ابھی تک بے یقینی کے عالم میں تھا زاریہ ایسا بھی کر سکتی ہے؟ اس وقت تو آمنہ شاہ نے اسے دلا سے دیئے۔

”میں اُسے سمجھاؤں گی بچی ہے نا سمجھ ہے شاید کسی نے اس کے دماغ میں یہ سب باتیں بھری ہیں تم فکر نہ کرو میں اس سے بات کروں گی۔“ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو عجیب سے وسوسوں کا شکار ہو گیا تھا وہ اندر سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اب صرف ایک امید تھی شاید جو اس نے کہا وہ سب غلط ہو سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

”زاریہ! تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟“ اس نے بے بسی سے سوچا۔

☆.....☆.....☆

باہر بارش بہت تیز رفتاری سے ہو رہی تھی وہ وینڈو میں کھڑی ذوالنون شاہ کے بازے میں سوچ رہی تھی پل صراط سے گزرتے ہوئے تھے دونوں آسمان بھی ان کے غم میں رو رہا تھا کچھ سوچ کر اس نے قلم اٹھایا اور ایک پیپر پر کچھ لکھنے لگی لکھ کر اس نے ایک نظر پڑھا آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس پیپر کو بھگور رہے تھے باقی کی ساری رات اس نے جاگتے ہوئے گزاردی رات بارش اس قدر ٹوٹ کے برسی تھی ہر چیز نکھر گئی تھی لیکن اس کا دل ویران ہو گیا تھا۔ اس نے فجر کی نماز ادا کی اور لان میں آگئی ہلکا ہلکا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا لان میں بارش کا پانی تھا وہ ننگے پاؤں لان میں چلنے لگی اس کے پاؤں بارش کے پانی میں ڈوب چکے تھے بارش کا ٹھنڈا پانی اس کے پاؤں کو راحت بخش رہا تھا وہ بے مقصد ہی ادھر سے ادھر چکر کاٹی رہی پھر اس سے اکتا کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی وہاں بڑا سا تالا دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی واج مین بھی سو رہا تھا پہلے تو اس کا دل چاہا واج مین کو اٹھا کر اس سے گیٹ کھلوائے لیکن اس کی نیند ڈسٹرب ہونے کے خیال سے واپس کمرے میں آگئی ابھی سب سو رہے تھے چند گھنٹے بعد اسے ہمیشہ کے لئے یہاں سے فلائی کر جانا تھا وہ میسر پر آ کھڑی ہوئی خالی خالی نظروں سے ذوالنون شاہ پیس کو دیکھنے لگی بچپن کی یادیں پھر سے تازہ ہونے لگیں عجیب سی بے قراری اس کے وجود میں بھر گئی سورج کی شفاف کرنیں اس کے سگووار چہرے سے

نکرا نہیں تو وہ چونک گئی، نجانے کتنی دیر ہو گئی تھی وہ وائٹ محل کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھی۔
 ”ذوالنون شاہ!“ اس کے دل سے بے ساختہ آواز نکلی وہ بے قرار ہو گئی اور گھبرا کر جلدی سے اندر پلٹ آئی۔
 ”زار یہ! رُک جاؤ!“ اس کے اندر سے آواز آئی، اس نے سب باتوں کو نظر انداز کر دیا اور جانے کی تیاری کرنے لگی۔

”زار یہ بی بی! آپ کو بڑی بیگم صاحبہ بلواری ہیں۔“ ملازمہ نے کہا، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی خود کو فراموش سے دیکھنے لگی، سرخ آنکھیں رتجگہ کی گواہ تھیں۔ اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا اور نیچے آ گئی۔
 ”بھابی! جلدی سے ناشتہ لگوا دیں، میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ اس نے بتائش لہجے میں کہا، وہ کسی پریشانی کا ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے فیصلے پر ملال ہے۔

”زار یہ! تم....“
 ”پلیز بھابی!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ پُچھ ہو گئیں۔ پھپھو اس کی کھوکھلی مسکراہٹ دیکھتی رہ گئیں۔
 بھابی پُچھ چاپ ناشتے سے انصاف کرتے رہے۔ اس نے برائے نام ہی ناشتہ کیا، بھوک تو اس کی ویسے ہی مزیدار تھی۔

”زید بھائی! ناراض ہیں مجھ سے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”کس حق سے؟“ انہوں نے اُلٹا اس سے پوچھ ڈالا۔

”آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”کاش زار یہ! تم نے بڑے بھائیوں والا مان دیا ہوتا۔“ انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”زار یہ! مجھے تم سے کوئی خفگی یا ناراضی نہیں ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بتانا تو دور کی بات اتنا بڑا فیصلہ اکیلے میں کر ڈالا، ذوالنون شاہ جیسے مخلص شخص کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا زار یہ! اگر نہ مجھے کہے کہ میں اپنی ماں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ اس کے گھر رہوں، کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ کبھی نہیں زار یہ! کبھی نہیں، کوئی بھی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا، پھر ذوالنون شاہ وہ کیسے اپنے والدین کو چھوڑ کر سات سمندر پار جا کر رہ سکتا ہے؟“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا، وہ کچھ نہ بولی، سر جھکائے کھڑی رہی۔

”زار یہ! ابھی بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل لو۔“ زید بھائی نے ایک اُمید سے کہا۔

”نہیں زید بھائی! اب میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی، کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو کرنے پڑتے ہیں۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا۔
 ”پھپھو! مجھے معاف کر دیں۔“

”زار یہ! خوش رہو بیٹی!“ انہوں نے اپنے آنسو صاف کیے اور اسے دعا دی، پھر وہ نمرہ بھابی کے گلے لگ گئی۔

”بھابی! میں آپ کو بہت مس کروں گی۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ہم سب بھی تمہیں بہت مس کریں گے۔“ نمرہ بھابی نے غم لہجے میں کہا، اس نے صائم کو خوب پیار کیا اور سب پورچ میں آ گئے، ڈرائیور گاڑی اشارت کیے ہوئے تھا۔

”چلو بیٹا! ہم تمہیں ایئر پورٹ تک چھوڑ آئیں۔“

”پھپھو! آگے بھی اکیلے ہی جانا ہے، پھر یہاں سے کیوں نہیں؟ آپ پریشان نہ ہوں، میں چلی جاؤں گی۔“

اس نے نرمی سے کہا، سب نے غم آنکھوں سے اسے الوداع کیا، گاڑی فرار لے بھرتی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

”ڈرائیور انکل! ایک منٹ گاڑی روکیے۔“ اس نے کچھ یاد آنے پر کہا، ڈرائیور نے گاڑی روک دی، وہ گاڑی سے باہر نکل آئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وائٹ محل کے گیٹ کے پاس آڑکی، واج مین نے اسے دیکھتے ہوئے فوراً گیٹ وا کر دیا، وہ کھلے گیٹ کو انکور کرتی واج مین کے پاس آڑکی۔ واج مین نے حیرت سے اسے دیکھا۔
 ”زار یہ بیٹی! اندر چلی جاؤ۔“

”نہیں واج مین انکل! میں واپس جا رہی ہوں، آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟“ اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

”کہو بیٹی! کیا کام ہے؟“

”انکل! آپ یہ ذوالنون شاہ کو دے دیں گے؟“ اس نے ایک کاغذ واج مین کو پکڑ لیا۔

”ٹھیک ہے بیٹی! دے دوں گا۔“ اس نے ممنون نظروں سے واج مین کو دیکھا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی، ٹیرس پر کھڑے انوار شاہ نے چونک کر زار یہ کی گاڑی کو دیکھا جو نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور واج مین سے پوچھا، ”زار یہ کہاں گئی ہے؟“

”جی وہ شاید ایئر پورٹ کی طرف گئی ہے، کہہ رہی تھی واپس جا رہی ہوں۔“ واج مین نے مؤدب لہجے میں کہا۔

انوار شاہ نے فوراً ڈرائیور کو ایئر پورٹ چلنے کو کہا، وہ گاڑی سے اتری تو سامنے ایئر پورٹ کی عمارت تھی، ڈرائیور نے سامان نکالا، وہ ایئر پورٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

”زار یہ!....“ اس کے عقب سے آواز ابھری تو اس کے قدم تھم گئے، اس شخص نے تو اس کی زندگی مشکل بنادی تھی، اس آواز کو وہ کیسے بھول سکتی تھی، انوار شاہ اس کے قریب آ چکے تھے۔

”سنا تھا تم بہت ذہین ہو، اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو یقین آ گیا ہے، ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھدار بھی ہو۔“ انوار شاہ نے حقیقت میں اسے سراہا۔

”میں نے پلان کیا تھا، اگر تم صائم والے واقعہ کو دیکھ کر پیچھے نہ ہٹیں تو میں نے زید کا چھوٹا سا ایکسڈنٹ کروا دینا تھا، لیکن تم تو کافی سمجھدار نکلیں۔“ انوار شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا، وہ لب بھینچے زخمی نظروں سے انوار شاہ کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ رہا تمہارا انعام،“ انوار شاہ نے ایک چیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے فتح کے نشے میں پور لہجے میں کہا۔

”ایک بات میری یاد رکھیے گا، ذوالنون شاہ کی خوشیاں زار یہ شاہ کے ساتھ مشروط ہیں، آپ کی جتنی دولت جائیداد ہے، بینک میں جتنے نوٹ ہیں، فیکٹریوں کی جتنی قیمت ہے، ہر وہ چیز جو آپ کے پاس ہے، اُن سب کی قیمت کو کاؤنٹ کر کے اس کو اس چیک پر بھرد بھیجئے گا، اس کے بدلے میں اگر تھوڑی سی خوشیاں اپنے لاڈلے پوتے کو خرید کر دے سکتے ہیں تو ضرور بتائیے گا، زار یہ شاہ آپ کو مبارک باد دینے ضرور آئے گی۔“ اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گئی، انوار شاہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ بخار کی شدت سے تپ رہا تھا، اور سردی سے پھٹا جا رہا تھا، اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر پاس پڑے ٹیبل سے پانی اٹھا کر پی لے، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

”بس!“ اس نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا تو گلزار اندر آ گیا، کمر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، سائینڈ ٹیبل پر رکھے لیپ کی ہلکی پیلی روشنی تھی۔

”چھوٹے صاحب! میں ہوں گلزار۔“

”چھوٹے صاحب! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، میں بڑے صاحب کو بلواتا ہوں اور ڈاکٹر کو فون ہوں۔“ گلزار نے فکر مندی سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں، کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہ بتاؤ تم کیوں آئے تھے؟“ اس نے بمشکل اٹھ کر بیٹھ کر اون سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”وہ چھوٹے صاحب! یہ آپ کو دیتا تھا زاریہ بی بی نے کہا تھا یہ آپ کو دے دوں۔“ گلزار نے ایک کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے یہ؟“ ذوالنون نے استفسار کیا۔

”جی نہیں۔“ گلزار نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس نے گلزار سے کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا وہ کاغذ ہاتھ میں پکڑے آنکھیں مہر گیا پھر جانے کس احساس کے تحت اس نے آنکھیں کھول کر اس کاغذ کو کھولا اور اس کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھنے لگا جیسے جیسے وہ اس تحریر کو پڑھ رہا تھا اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔

”السلام علیکم! ذوالنون شاہ! میں واپس لندن جا رہی ہوں آج صبح نو بجے کی فلائٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اب میں شاید کبھی پاکستان نہ آؤں کل میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے ہونا میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں شاید لیکن ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا بد قسمت زاریہ!“ اس مختصر سی تحریر پر جگہ جگہ آنسوؤں کے نشان تھے۔

”وہ چلی گئی؟ ذوالنون! وہ چلی گئی۔“ اس کا دل گر لایا جو ہلکی سی امید تھی وہ بھی ٹوٹ گئی سب خواہشیں آرزوئیں اعتبار سب کچھ بل بھر میں ٹوٹ گیا بکھر گیا وہ بے یقینی سے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا پہلے ہی وہ بخار شدت سے غمگین تھا یک دم ہی اس کے دماغ میں درد کی شدید ٹیسس اٹھیں وہ درد کی شدت سے گر لایا اور پچھلے لمحوں میں خود سے غافل ہو گیا۔



انوار شاہ ایئر پورٹ سے سیدھے ذوالنون شاہ کے روم میں آ گئے ذوالنون شاہ کو ایک طرف لٹکھڑاتے ہوئے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئے۔

”ذوالنون!...!“ انوار شاہ نے اس کا شانہ ہلایا۔

”ذوالنون! آنکھیں کھولو۔“ وہ ہوش میں ہوتا تو آنکھیں کھولتا انوار شاہ نے گھبرا کر حمزہ شاہ کو آواز دی وہ اسے جلدی سے ہسپتال لے گئے جب ڈاکٹر نے بتایا کہ ذوالنون شاہ کا رومس بریک ڈاؤن ہوا ہے تو آتے کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب وہ ہوش میں آیا تو بالکل بدلا ہوا ذوالنون شاہ تھا کم گو تو وہ پہلے ہی تھا بالکل گم سم ہو کر رہ گیا جب وہ ڈسچارج ہوا تو اس نے ذوالنون شاہ پھیل جانے سے انکار کر دیا اور سب کے ساتھ کراچی آ گیا۔ انوار شاہ نے بالا ہی بالا نہ صرف اس کا ہانیہ کے ساتھ رشتہ پکا کر دیا بلکہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر کے آمنہ شاہ نے سنا تو وہ تڑپ اٹھیں۔

”بابا جان! ابھی وہ مکمل طور پر نہیں سنبھل پایا اچانک شادی...؟“ وہ متذبذب ہوئیں۔

”ہانیہ! اچھا! کی ہے وہ اسے سنبھال لے گی میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے تم پریشان نہ ہو ذوالنون شاہ!“

”میں منالوں گا۔“ انوار شاہ نے آمنہ شاہ کو تسلی دی یوں وہ شادی کی تیاریاں کرنے لگیں۔ ذوالنون شاہ نے جب سنا تو وہ بھڑک ہی اٹھا۔

”میں شادی نہیں کروں گا۔“ اس نے سختی سے آمنہ شاہ کو منع کیا انوار شاہ نے جب اس کا انکار سنا تو انہوں نے خود اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

”ذوالنون! تم نے انکار کیوں کیا؟“ انوار شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”دادا جان! میں شادی نہیں کرنا چاہتا پلیز...! اس سارے معاملے کو ختم کر دیں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”کوئی معقول وجہ انکار کی؟“ انوار شاہ نے پوچھا۔

”دادا! آپ سب جانتے ہیں پھر بھی؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے وہ لڑکی تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہے اور اس لڑکی کی خاطر ہم تمہیں عمر بھر کا روگ لگانے نہیں دیں گے۔“ انوار شاہ نے بے رحمی سے کہا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”دادا جان! میں زاریہ سے محبت کرتا ہوں کوئی بھی لڑکی زاریہ شاہ کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ میں لینے دوں گا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے ذوالنون شاہ! جیسے تمہاری مرضی ایک دفعہ پہلے بھی میں اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہوا تھا اب بھی تمہاری خاطر سب کی نظروں میں اپنی تذلیل برداشت کر لوں گا صرف تمہاری خاطر لیکن ذوالنون! اس لڑکی کے بارے میں سوچو جب کسی لڑکی کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی جاتی ہے تو کسی کا اچانک انکار اس کی زندگی تباہ کر دیتا ہے تمہاری کوئی بہن نہیں ہے ناں ذوالنون! اس لئے تمہیں اس چیز کا اندازہ نہیں۔“

پھر ایک شام ہانیہ ذوالنون شاہ کی دلہن بن کر ”شاہ ولا“ میں آ گئی۔ ذوالنون شاہ کی ہانیہ میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی آہستہ آہستہ ہانیہ پر سارے راز کھلتے چلے گئے ہانیہ کو زاریہ نامی لڑکی سے چوسی ہو گئی روزانہ دونوں کا جھگڑا ہوتا اب تو گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے آمنہ شاہ نے ذوالنون شاہ کو بہت سمجھایا لیکن وہ کیا کرتا کسی بھی طرح وہ زاریہ کو بھول نہ پایا پھر روز کے جھگڑے سے تنگ آ کر ذوالنون شاہ نے ہانیہ سے بات کرنے کا سوچا۔

”ہانیہ! مجھے کچھ وقت دو دادا جان نے شادی اتنی اچانک کروادی کہ میں چنی طور پر قطعی تیار نہیں تھا روز روز کے لڑائی جھگڑے سے گھر کا ماحول ڈسٹر ب ہو کر رہ گیا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے التجائیہ انداز میں کہا کچھ روز سکون سے گزر جاتے پھر وہی ہنگامہ شروع ہو جاتا ہانیہ جب بھی اسے کھویا ہوا دیکھتی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اس کے علاوہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو وہ اپنے شوہر کو بیٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی گھر کا سکون مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہانیہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی انوار شاہ بھی اس سے کچھ خفا خفا سے رہتے آمنہ شاہ اور حمزہ شاہ بھی خاموش رہتے اس نے خود کو مصروف کر لیا سارا سارا دن کام میں مصروف رہتا اور جب گھر ہوتا تو زاریہ کی یادیں اور اس کا دیا تم پھر سے تازہ ہونے لگتا کبھی کبھی تو اسے ہانیہ پر بہت ترس آتا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو ہر وقت زاریہ کو پکارتا رہتا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا ہانیہ امید سے تھی آمنہ شاہ اسے منا کر لے آئی تھیں ہانیہ کے رویے میں بھی سنجیدگی آ گیا تھا لیکن ذوالنون شاہ وہی پتھر کی صورت تھا۔

پھر ایک شام ہانیہ دو جڑواں بچوں کو پیدا کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے ذوالنون شاہ کی زندگی سے دور چلی گئی ذوالنون شاہ کو ہانیہ کی موت کا بے حد افسوس ہوا فطرتی طور پر وہ بے حد حساس تھا۔ شاہ ولا میں ہانیہ کی موت بہت بڑا ہچکچاہٹ ثابت ہوئی تھی آمنہ شاہ نے دونوں ننھے فرشتوں کو اپنی آغوش میں لے لیا وقت اپنی ڈگر سے چل رہا تھا بچے

بڑے ہو رہے تھے ذوالنون شاہ نے دن اور رات کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا اس نے اپنی ساری محنت اور توجہ بزنس پر دی اسے اپنی بیٹی اور بیٹے سے بے حد پیار تھا ان پانچ سالوں میں وہ زاریہ شاہ کو ایک بار بھی بھولا نہ تھا اور بچوں کی نئی فرمائش پر وہ بے قرار ہو گیا تھا اور آمنہ شاہ بھی اسے دبے دبے لفظوں میں کہہ چکی تھیں لیکن اب وہ کسی بھی صورت شادی کرنا نہیں چاہتا تھا پہلے ہی وہ خود کو ہانیہ کا گنہگار سمجھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے انوار شاہ کو غصے سے کہہ کر تو دیا تھا لیکن سارے راستے وہ روتی ہوئی ذوالنون شاہ کی خوشیوں کی دعا کرتی آئی تھی ایئر پورٹ سے وہ ٹیکسی لے کر گھر آئی تو سب اسے دیکھ کر شاکر رہ گئے علیناہ شاہ کے گلے لگ کر وہ خوب روئی۔ علیناہ شاہ کے ساتھ ساتھ نیل شاہ بھی اس کی اچانک واپسی پر پریشان ہو گئے انہوں نے زاریہ سے بہت پوچھا لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ علیناہ شاہ نے پاکستان فون کر کے اپنی نند امبرین سے پوچھا تو انہوں نے مختصر اسرار واقعہ بتا دیا علیناہ شاہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے انہوں نے زاریہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنی فضول ضد چھوڑ دے۔ وہ بہت چپ چاپ اور کم صدم رہنے لگی اس کی دن بدن بگڑتی حالت نے علیناہ شاہ کے ساتھ ساتھ نیل شاہ کو بھی پریشان کر دیا پھر وہ سب اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے کوئی بھی ایسی بات نہ کرتے جس سے اس کا موڈ خراب ہو۔

ایک دن لائبہ کا فون آیا مجبوراً اسے بات کرنا پڑی وہ تو اس پر برس پڑی تھی۔

”حد ہوئی ہے زاری! تم نے واپس آتے ہوئے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کیا اور لندن آ کر ایک بھی دفعہ فون نہیں کیا۔“ لائبہ نے شکوہ کیا وہ تجل سی ہو گئی۔

”زاریہ! مجھے نہیں پتہ تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا اور نہ ہی میں تم سے پوچھوں گی لیکن ایک بات کا ضرور افسوس ہے کہ ذوالنون جیسے شاندار انسان کو ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو میں نے سنا ہے ذوالنون شاہ نے شادی کر لی ہے۔“ لائبہ نے افسردگی سے کہا لائبہ آپ کی طویل بات کے بعد وہ آخری فقرے پر ٹھٹھک گئی بے ساختہ ہی اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا آنکھیں نم سی ہو گئیں لائبہ آپ سے بات کرنے کے بعد وہ کافی دیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی درد کی لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ وقت آگے بڑھتا گیا لیکن اس کی زندگی وہیں ٹھہر گئی عمان PH.D کر رہا تھا جب بھی فارغ ہوتا اس سے خوب باتیں کرتا وہ خاموشی سے سنتی رہتی وہ اس کی خاموشی سے چو جاتا وہ ہر وقت اسے خوش کرنے کے جتن کرتا لیکن اسے مایوس ہوتا پڑتا۔ ان پانچ سالوں میں اس کے لئے کافی پر پوزر آئے لیکن اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر دوبارہ کبھی کسی نے اس ٹاپک پر بات نہ کی عمان کا ایک دوست تھا سیف... وہ اکثر اس کے ساتھ گھر آ جاتا عمان کی طرح اسے بھی اپنا ہی کہتا تھا وہ بھی اسے عمان کی طرح ٹریٹ کرتی تھی لیکن کچھ ماہ سے سیف کے بڑے بھائی عقیف نے اس کی زندگی کو اور بھی مشکل کر دیا تھا پتہ نہیں اس نے کہاں اسے دیکھا تھا جب اسے پتہ چلا تھا کہ وہ عمان کی بہن ہے تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ عقیف نے سیف سے بات کی تو اس نے جھک کر عمان کو بتا دیا۔

اس نے جب زاریہ سے بات کی تو وہ بری طرح اس پر بگڑنے لگی۔

”اپنا! عقیف بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔“ عمان اسے ہر طریقے سے قائل کرنا چاہتا تھا۔

”عمان! میں نے کہا تھا مجھے ابھی شادی نہیں کرنی سونہیں کرنی اس لئے اپنے دوست کو صاف انکار کر دو۔“ اس نے جھڑک کر کہا تو وہ خائف سا ہو گیا۔ عقیف اس کے انکار سے بہت دل برداشتہ ہوا لیکن ہمت نہ ہاری اس نے

خود زاریہ سے بات کرنے کی ٹھان لی سو وہ اس کے آفس چلا آیا۔ زاریہ کو اسے اپنے آفس میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔

”سوری! میں بغیر اجازت آپ کے آفس میں چلا آیا۔“ وہ اس کی حیرت بھانپ چکا تھا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ عقیف نے سنجیدگی سے کہا۔

”اگر آپ نے وہی بات کرنی ہے جو عمان نے کی تھی تو سوری! مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا وہ عقیف کے آنے کا پس منظر جان چکی تھی۔

”لیکن زاریہ! کوئی ریزن بھی ہو۔“ عقیف نے بے چینی سے کہا۔

”میری اپنی زندگی ہے جو مرضی فیصلہ کروں اور میں کسی کوریزن دینے کی پابند نہیں ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو عقیف فوراً اس کے آفس سے نکل آیا۔

اس کے بعد مام اور ڈیڈ بھی عقیف کی وکالت کرنے لگ گئے اور عمان... (وہ تو اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا وہ کیسے ذوالنون شاہ کی جگہ کسی اور کو دے دیتی؟

☆.....☆.....☆

وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا ملازمہ ٹیبل پر ناشتہ لگانے لگی۔

”السلام وعلیکم!“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”علیکم السلام!“ حمزہ شاہ نے شفقت سے کہا۔

”بیٹا! آپ لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے اسکول نہیں جانا ہے کیا؟“ ذوالنون شاہ نے نرمی سے پوچھا۔

”پاپا! آج ہم اسکول نہیں جائیں گے۔“ شارم نے منہ بنا کر کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

”کیوں... اسکول کیوں نہیں جانا؟“ ذوالنون نے چونک کر پوچھا تو شارم کچھ نہیں بولا۔

”کائنات! آپ بتاؤ اسکول کیوں نہیں جانا؟“ ذوالنون نے نرمی سے پوچھا کائنات بھی چپ چاپ بیٹھی

رہی ذوالنون شاہ نے ٹھٹھک کر دونوں کو دیکھا جو سر جھکائے سنجیدگی سے بیٹھے تھے اس نے الجھ کر حمزہ شاہ کی طرف دیکھا تو وہ نظریں پجرا گئے۔

”ذوالنون بیٹا! آپ ناشتہ کرو بچوں نے ویسے ہی اسکول سے چھٹی کی ہے۔“ آمنہ شاہ نے جلدی سے

کہا۔ شارم اور کائنات اٹھے اور بغیر ناشتہ کیے لاؤنج میں آ گئے تو ذوالنون شاہ فوراً ان کے پیچھے لپکا۔

”ناراض ہو پاپا سے؟“ ذوالنون نے دونوں کو اپنی گود میں بٹھا کر پوچھا۔

”پاپا ہم آپ سے نہیں بولتے۔“ کائنات نے کہا۔

”کیوں پاپا سے ایسی کیا غلطی ہو گئی؟“ ذوالنون جانتا تھا کہ وہ کیوں ناراض ہیں۔

”پاپا! آپ نے پرامس کیا تھا کہ آپ ماما لائیں گے۔“ تو وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”دیکھو بیٹا! جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں پھر وہ کبھی واپس نہیں آتے۔“ اس نے رساں سے کہا

بچے رونا بھول کر ٹکڑ ٹکڑ اس کی شکل دیکھنے لگے۔

”اور اس دفعہ چھٹیوں میں پاپا آپ کو آپ کی فیورٹ جگہ پر گھمانے لے کر جائیں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ریلی پاپا!“ شارم نے اشتیاق سے پوچھا۔

”یس پاپا کی جان! لیکن ایک شرط پر آپ اسکول سے چھٹی نہیں کرو گے نالٹاں جان کو تنگ کر دو گے اور نہ ہی

روؤ گے ٹھیک ہے؟“ ذوالنون شاہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے پاپا جان!“ دونوں نے خوشی سے کہا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ آمنہ شاہ نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔

”ذوالنون! آ جاؤ بیٹا! تم بھی ناشتہ کرلو۔“

”نہیں! لتاں جان! ابھی مجھے جانا ہے آفس جا کر کرلوں گا۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے انوار شاہ نے حسرت سے اپنے لاڈلے پوتے کو دیکھا ان کی ایک غلطی نے زندگی کی ساری خوشیاں اس سے چھین لی تھیں ان کا ضمیر ان کو چین نہ لینے دیتا وہ اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے اور نہ ہی ان میں پہلے جیسا دم خم رہا تھا۔

”دادا جان! آپ نے بلوایا، خیریت تو ہے ناں۔“

”ذوالنون! مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔“ انوار شاہ نے آہستگی سے کہا۔

”دادا جان! پوچھنے کی کیا بات ہے؟ آپ کریں کیا بات کرنی ہے؟“ اس نے مودب لہجے میں کہا۔

”ذوالنون! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ انوار شاہ نے آہستگی سے کہا۔

”دادا جان! میں جانتا ہوں آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اس میں تو شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

ذوالنون نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ذوالنون! مجھے معاف کرو۔“ انوار شاہ کی آواز بھیگ گئی تھی۔

”رمضان جیسا بابرکت مہینہ آ رہا ہے میں چاہتا ہوں سب گناہوں سے پاک ہو کر اس رب کی عبادت کروں تاکہ وہ بھی مجھے معاف کر دے۔“

”دادا جان! آپ مجھ سے کیوں معافی مانگ رہے ہیں؟ آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“ ذوالنون نے تڑپ کر انوار شاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”ذوالنون! میں گنہگار ہوں شاید اس وجہ سے خوشیاں اس گھر سے روٹھ کر بہت دور چلی گئی ہیں۔“ انوار شاہ نے اداسی سے کہا۔

”دادا جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ ذوالنون نے بے چینی سے کہا۔

”وہ زاریہ.....!“ انوار شاہ ہچکچائے۔

”وہ زاریہ.....! کیا دادا جان؟“ ذوالنون نے بے تابی سے پوچھا۔ انوار شاہ سر جھکے دھیرے دھیرے ہر راز سے پردہ فاش کرتے چلے گئے وہ ساکت نظروں سے انوار شاہ کے ہلنے لپٹے دیکھ رہا تھا بہت دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوا وہ حیرت و بے یقینی سے انوار شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

”ذوالنون! مجھے معاف کر دو مجھے یہ ڈرتا تھا کہ شادی کے بعد زاریہ تمہیں لے کر لندن شفٹ نہ ہو جائے اور میں اپنے دوست سے پہلے سے بات کر چکا تھا اگر بعد میں اسے انکار کرتا تو خود کو دوسروں کی نظروں میں تماشہ بناتا۔“ انوار شاہ نے شرمندگی سے کہا۔

”دادا جان! صائم کو آپ نے کذیب کروایا مجھے یقین نہیں آ رہا میں زاریہ کو بے وفا سمجھتا رہا دادا جان وہ تو عظیم لڑکی نکلی جس نے اپنوں کی خاطر قربانی دے دی اور آپ دادا جان! آپ تو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے پھر آپ نے کیوں میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھ سے چھین لی؟ دادا جان! آپ نے صرف میری زاریہ کی زندگی خراب نہیں کی آپ نے تو ہانیہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا آپ جانتے تھے دادا جان! کہ میں زاریہ سے

کتنی محبت کرتا ہوں آپ نے زبردستی میری شادی ہانیہ سے کروادی اور میں اسے ایک بھی خوشی نہ دے سکا کیوں کیا آپ نے ایسا؟“ وہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا ساری زندگی کالاوا آج پھٹ پڑا تھا ذوالنون شاہ تڑپ رہا تھا وحشتیں اس کے اندر بھر گئی تھیں وہ تو زاریہ کو قصور وار سمجھتا تھا اور قصور وار کون نکلا؟ پانچ برس اس نے کتنی اذیت میں گزارے تھے۔

”کاش دادا جان! میں آپ کا پوتا نہ ہوتا۔“ ذوالنون نے روتے ہوئے بے بسی سے کہا پھر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا اور باہر کھڑے حمزہ شاہ نے بھی غم آنکھوں سے اپنے لخت جگر کو دیکھا جو لڑکھڑاتے قدموں سے بیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ حمزہ شاہ کسی کام سے انوار شاہ کے کمرے میں آئے تھے لیکن اندر سے آنے والی آوازوں نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے حمزہ شاہ نے تاسف سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔



”اپنا! اپنی پینلنگ کر لیں ہم پاکستان جا رہے ہیں۔“ اس نے کن آنکھوں سے زاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا وہ لپٹاپ پر کوئی کام کر رہی تھی اس کی انگلیاں وہیں تھم گئیں۔ اس نے سر اسیکمی نگاہ سے عمان کی طرف دیکھا جواب مکمل طور پر پیزا کھانے میں مگن تھا۔

”پاکستان کیوں جانا ہے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”ویسے ہی میرے ایگزیم ہو گئے ہیں اب تو بوریت ہی بوریت ہے اس لئے سوچا تھوڑا گھوم لیا جائے اس لئے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”تم نے جانا ہے تو جاؤ میں نے نہیں جانا۔“ اس نے لب بھینچ کر کہا۔

”جانا تو آپ کو پڑے گا چاہے آپ سو بار انکار کر لیں۔“ عمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”مانو! تم چلے جاؤ میں نے تو کئی بار پاکستان دیکھا ہے۔“ اس نے نظریں پجرا کر کہا۔

”اپنا! امام اور ڈیڈ بھی جا رہے ہیں اور ہم وہاں سے عید کے بعد ہی واپس آئیں گے آپ بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہیں کیوں کہ میں نے ٹکٹ کنفرم کروا لئے ہیں۔“ عمان نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”کیا..... اتنی جلدی؟ میں نے کوئی تیاری نہیں کی میں کیسے جا سکتی ہوں؟“

”پلیز اپنا! اب انکار مت کیجئے گا میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے کیا میری خاطر آپ میرے ساتھ

پاکستان نہیں جا سکتیں؟“ اس نے لجاجت سے کہا تو اس کا سر بے اختیار ہی اثبات میں ہل گیا۔

”یا..... ہو!“ عمان نے خوشی سے نعرہ لگایا تو وہ جی ہلکا سا مسکرائی پھر عمان نے اس کے ساتھ مل کر پینلنگ مکمل کی

سب پاکستان جانے کے لئے بے حد خوش تھے سوائے زاریہ کے وہ بے حد پریشان تھی وہاں ذوالنون شاہ سے اگر

سامنا ہو گیا تو.....؟ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان تھی پھر جمعہ کے دن صبح سات بجے وہ سب لاہور ایئر پورٹ پر تھے

پچھو زید بھائی، نمرہ بھابی اور لائبہ بچوں سمیت انہیں ریسو کرنے آئے تھے اسے دیکھ کر تو لائبہ آپی چلا اٹھی تھیں

کتنے شکوے تھے جو لائبہ اور نمرہ بھابی نے ایئر پورٹ پر کھڑے ہی کر ڈالے وہ سر جھکائے سستی رہی پھر یہ ہنسا مسکراتا

قافلہ گھر لوٹ آیا۔ جب گاڑی ان کے بنگلے کے قریب رکی تو اس نے بے تابی سے وائٹ ٹل کو دیکھا آج بھی وہ

باہر سے اتنا ہی شاندار تھا اور وہی واج مین باہر کھڑا تھا اس کی آنکھیں بے اختیار ہی نم ہونے لگیں اس نے جلدی سے خود پر کنٹرول کیا۔

وہ فریش ہو کر نیچے آئی تب تک ٹیبل پر ناشتہ لگ چکا تھا سب نے ناشتہ کیا پھر سب بیٹھے کافی دیر باتیں کرتے

رہے وہ بھی لائیبہ آپ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب دیتی رہی بعد میں ریٹ کرنے کے لئے کمرے میں آ گئی۔

☆.....☆

وہ ٹیرس پر کھڑی وائٹ محل کو دیکھ رہی تھی آج انہیں آئے ہوئے ساتواں دن تھا اور اس کا زیادہ تر وقت ٹیرس پر گزرتا، لیکن وہ حیران تھی ان دنوں میں ایک بھی دفعہ اس گھر میں رہنے والے افراد کو دیکھا اور نہ ذوالنون شاہ کو اور نہ ہی اس کی بیوی کو شاید وہ لوگ کچھ دنوں کے لئے کراچی گئے ہوں وہ خود ہی کہتی لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو ایک بار ذوالنون شاہ سے ملنے کو چل رہا تھا؟ اس نے حسرت سے وائٹ محل کو دیکھا کسی وقت پوری آزادی کے ساتھ وہ اس محل میں گھوما کرتی تھی وہ انہی سوچوں میں گھری ہوئی تھی جب عمان اسے پکارتا ہوا اوپر آ گیا۔

”ایسا! آپ یہاں ہیں میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ رہا تھا۔“ عمان نے خفگی سے کہا۔

”کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ لائیبہ آپ صبح اسلام آباد جا رہی ہیں تو ہم سب نے پروگرام بنایا ہے اسلام آباد اور دوسری جگہوں کی سیر کی جائے اس لئے ہم سب اسلام آباد لائیبہ آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔“ عمان نے پرجوش انداز میں کہا۔ سب ہی جا رہے تھے اس لئے چارونا چار اُسے بھی جانا پڑا۔

پہلے دن تو وہ جی بھر کے بور ہوئی اسلام آباد میں وہ سب لائیبہ آپ کے گھر تھے۔

”کیا ضرورت تھی ابھی آنے کی؟ کچھ دن بعد پلان بنالیتے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”ایسا! صرف ایک ہفتہ ہے ہمارے پاس اس کے بعد رمضان شروع ہو جائے گا روزوں میں تو ہم گھوم نہیں سکتے اور پھر عید کے بعد تو ہمیں واپس جانا ہے۔“ عمان نے چوکر کہا پہلے تو انہوں نے اسلام آباد گھوما پھر مری ایوبیہ کاغان، تنھیا گلی، سارے علاقوں کی سیر کی۔ سب نے بے حد انجوائے کیا جبکہ وہ بے حد اُداس تھی بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں ہر چیز میں اس کی دلچسپی صفر تھی۔ وہ سب واپس اسلام آباد آ گئے۔

”زاری! تم رُک جاؤ میرے پاس چند دنوں کے لئے۔“ لائیبہ نے کہا صبح ان لوگوں نے واپس لاہور چلے جانا تھا پرسوں پہلا روزہ تھا۔ لائیبہ چاہتی تھی کہ زاری یہاں رُک جائے۔

”نہیں آپ! اتنے دن تو یہاں رہ لیا ہے میں بھی سب کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”بیٹا! بہن اتنے پیار سے اصرار کر رہی ہے تو رُک جاؤ۔“ نیل شاہ نے نرمی سے کہا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆.....☆

”ذوالنون بیٹا! اب کیسی طبیعت ہے؟“ آمنہ شاہ نے نرمی سے پوچھا۔

”پہلے سے بہتر ہے۔“ اس نے مختصر کہا وہ اس وقت لان میں بیٹھا نجانے کس سوچ میں گم تھا۔

”ذوالنون! تمہارے دادا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں تمہاری بے اعتنائی انہیں مار دے گی انہیں معاف کرو۔“ آمنہ شاہ نے نرمی سے کہا۔

”لتناں! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا دادا جان میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں کتنا مان تھا مجھے اُن پر۔“ اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

”بیٹا! غلطی سب سے ہو جاتی ہے انسان تو خطا کا پتلا ہے پھر جو ہوا وہ تمہاری قسمت میں لکھا تھا کتنے دن ہو گئے ہیں تم اُن کے کمرے میں نہیں گئے بیٹا! وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں ابھی جاؤ ان سے مل کر آؤ۔“ آمنہ شاہ

نے رسان سے کہا۔

”جی لتناں! جانتا ہوں۔“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا وہ ابھی اٹھائی تھا اس کا سیل فون بجنے لگا، حمزہ شاہ کا

فون تھا۔

”السلام وعلیکم! بابا جان!“

”علیکم السلام! ذوالنون بیٹا! آپ کراچی میں ہو؟“ حمزہ شاہ نے پوچھا۔

”جی بابا جان! خیریت تو ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ذوالنون! اسلام آباد کی فرم میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے اس لئے تم صبح ارجنٹ وہاں پہنچو۔“ حمزہ نے پریشانی سے

کہا۔

”اوکے بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں میں سنبھال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! مجھے وہاں جا کر ساری اپ ڈیٹ دیتے رہنا۔“ حمزہ شاہ نے کہا۔

”اللہ حافظ!“ اس نے سیل جیب میں رکھا آمنہ شاہ کو اسلام آباد جانے کا بتا کر وہ دادا جان کے کمرے میں

آ گیا۔ انور شاہ اسے دیکھ کر کھل اُٹھے تھے۔

”ذوالنون! اپنے دادا کو معاف کر دے۔“ انور شاہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”دادا جان! معافی مانگ کر مجھے گنہگار مت کریں۔“ اس نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ پُوم لئے۔

”ذوالنون! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں تمہاری بے اعتنائی مجھے مار دے گی۔“ انور شاہ نے بھیکے لہجے میں

کہا۔

”دادا جان! میں بھی آپ سے بہت پیار کرتا ہوں ناراض نہیں ہوں اُس دن جو بھی کہا وہ غصے میں کہہ دیا، لیکن

مجھے سُن کر بہت دکھ ہوا تھا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”اب آپ آرام کریں مجھے کچھ کام کرنا ہے صبح اسلام آباد کے لئے نکلتا ہے۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

”اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے اس آنے والے بابرکت مہینے کے صدقے اللہ تمہاری جھولی

خوشیوں سے بھر دے آمین!“ انور شاہ نے اس کی پیشانی پُوم کر صدقہ دل سے دعا دی۔

☆.....☆

”زاری! چلو مارکیٹ چلیں۔“ لائیبہ نے غلٹ میں کہا۔

”کیوں...؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”یار! صبح پہلا روزہ ہے روزہ رکھ کے شاپنگ کرنا میرے بس میں نہیں ہے اور رات کو اتنا ہجوم ہوتا ہے مجھے

گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ زاری نے جھرجھری لے کر کہا۔

”آپی! اس وقت...؟“ اس نے ہچکچا کر کہا اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا باہر جانے کے لئے۔

”ارے! ابھی تو شام کے چار بجے ہیں کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ لائیبہ نے نرمی سے کہا۔

”لو کے چلیں۔“ وہ فوراً کھڑی ہوئی وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ آ گئیں لائیبہ جانے کس کس دکان میں

شاپنگ کرتی ساتھ میں اسے بھی گھسیٹ رہی تھی وہ جی بھر کے بے مزہ ہوئی جانے اس کا دل کیوں گھبرا رہا تھا؟ اس

کی چٹھی جس الرٹ کر رہی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

”آپی! بس کریں گھر چلیں۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”زاری! آؤ آنکریم کھالیں۔“ لائپہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے باہر آیا، گاڑی کو لاک کیا، دفعتاً لائبرے کی نظر اس پر پڑی تو حیرت زدہ اسے دیکھتی رہ گئی، اچانک اس کی نظر لائبرے پر پڑی، جو اسے دیکھ رہی تھی، وہ چونک گیا، فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

”السلام وعلیکم! لایبہ آپی! کیسی ہیں آپ؟“ وہ چلتا ہوا لایبہ کے قریب آ گیا۔

”زار یہ.....!“ ذوالنون شاہ کے لب نیم وا ہوئے وہ بے یقینی سے زاریہ کی طرف دیکھ رہا تھا وہ تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا۔ ذوالنون شاہ نے بے قراری سے پکارا ”آنسو زاریہ کا چہرہ تیزی سے بھگور ہے تھے اس نے برستی آنکھوں سے ذوالنون شاہ کی طرف دیکھا پھر تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی سائیڈ کا ڈور بند کر لیا۔

وہ سارے راستے آنسو ضبط کرتی رہی، دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھیں، گھر آ کر وہ کمرے میں چلی گئی، لایبہ اس کے پیچھے نہ گئی، کیونکہ وہ جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رات کو وہ کھانے کے ٹیبل پر بھی نہ آئی، تو لایبہ تشویش سے گھر گئی، وہ اس کا کھانا کمرے میں لے آئیں، وہ تکیے میں منہ دیئے رونے میں مصروف تھی، بھیگی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

پی! مجھے صبح لاہور جانا ہے۔“ زاریہ نے کہا۔

زاری! فرار کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“ لائبہ نے رساں سے کہا۔

آپ! میری زندگی جیسے گزر رہی ہے، سو گزر رہی ہے، لیکن اب میں یہ نہیں چاہتی کہ ذوالنون دوبارہ میری

انجسٹ 136 ستمبر 2012ء

”انوار شاہ....! کیا مطلب؟“ لائبہ چو اسے غور سے سن رہی تھی، انوار شاہ کے ذکر پر چونک گئی۔

”کچھ نہیں.... میرا مطلب تھا اس کی فیملی بھی ڈسٹرب ہو جائے گی۔“ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”زاری! تم بہت اعلیٰ ظرف کی مالک ہو۔“ لاجپت نے بے ساختہ اسے سراہا۔

”لیکن یوں اچانک ذوالنون شاہ کو راستے میں انگور کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔“ لایبہ نے افسوس سے کہا تو زاریہ کا دل ڈوب سا گیا، جب سے وہ پاکستان آئی تھی اس وقت سے یہی خواہش کر رہی تھی ذوالنون کو دیکھنے کی، جب وہ سامنے آیا تو وہ بوکھلا کے بھاگ آئی، وہ کبھی بھی صورت اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آپ! مجھے اس ٹاپک پر مزید بات نہیں کرنی۔“ اس نے پلٹی ہو کر کہا۔

”او جسے فائن! تم کھانا کھاؤ اور سو جاؤ“ صبح سحری کے وقت اٹھنا بھی ہے۔ لائبر نے محبت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، لائبر نے کمرے سے اپنا سیل فون اور کارڈ لیا، جو ذوالنون شاہ نے اسے دیا تھا اور وہ ٹیبل پر آ کر اس کا نمبر ملانے لگی، تیسری ٹیبل پر فون اٹھایا گیا۔

”ہیلو.....!“ ذوالنون کی بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ تو اتفاق سے بچوں کے لئے شاپنگ کرنے چلا گیا تھا، اس کے تصور میں بھی نہیں تھا، زاریہ سے سامنا ہو جائے گا، جس طرح زاریہ نے اسے انکور کیا تھا، وہ بہت ہرٹ ہوا تھا، فوراً ہی واپس گھر آ گیا، بے تابی سے وہ لائبرے کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔

”جی لائے آپی! میں بھی آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا“۔ ذوالنون نے بے چینی سے کہا۔

”ذوالنون! مجھے تم سے بات کرنی ہے، فون پر نہیں، فیس ٹوفیس۔“ لائبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”جی کیا بات کرنی ہے؟“ ذوالنون کی بے قراری عروج پر تھی۔

”وہ تو کل ہی بتاؤں گی“ کیا کل افطاری پر تم میرے گھر آ سکتے ہو؟“ لائبہ نے پوچھا۔

”لائیہ آپی! افطاری پر تو نہیں آ سکتا، دن کے ٹائم آ سکتا ہوں۔“ ذوالنون نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، کل میں انتظار کروں گی۔“ پھر اس نے ذوالنون کو ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔

—————★—————

آج پہلا روزہ تھا ہر طرف عجیب سا نور پھیلا تھا بچے بڑے سب ہی روزہ رکھنے کے لئے پرجوش تھے وہ سحری کر کے کمرے میں آ گئی فجر کی نماز ادا کی جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو لب خاموش تھے آنکھوں سے آنسو جاری تھے کتنی ہی دیر ہاتھ اٹھائے وہ روتی رہی پھر قرآن پاک پڑھ کر وہ لیٹ گئی۔

”بیگم صاحبہ! باہر کوئی ذوالنون شاہ آئے ہیں، کہہ رہے ہیں آپ سے ملنا ہے۔“ وہ لاؤنج میں بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھی، جب ملازم نے آ کر کہا۔

”آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ“ میں آتی ہوں۔ لائبہ نے قرآن پاک کو احتیاط سے بند کرتے ہوئے کہا۔ سحری کرنے کے بعد سب سو گئے تھے صبح بچوں کو اسکول اور شوہر کو آفس بھیجنے کے بعد وہ پھر سو گئی ساڑھے دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اٹھ کر قرآن پاک پڑھنے لگی ابھی اسے پڑھتے ہوئے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا جب ملازم نے سے ذوالنون شاہ کی آمد کا بتایا۔

”السلام علیکم!“ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”علیکم السلام!“ ذوالنون احترام سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ ذوالنون!“ لائبہ نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اسلام آباد کیسے آنا ہوا؟“ لائبہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”یہاں کی فرم میں کچھ پرابلم ہو گیا تھا اس سلسلے میں کل اسلام آباد آیا تھا۔“ ذوالنون نے کہا۔

”لائبہ آپ! آپ کیا بات کرنا چاہتی تھیں؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”ذوالنون! چند سال پہلے کیا ہوا تھا؟ تم مجھے ساری سچائی بتاؤ!“ لائبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا آپ کو زاریہ نے کچھ نہیں بتایا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بتایا ہے صرف یہ کہ اس نے ممکن سے پہلے شرط رکھی تھی کہ شادی کے بعد تم اس کے ساتھ لندن رہو گے، تم نے انکار کر دیا تو وہ لندن چلی آئی۔“ لائبہ نے کہا۔

”یہ حقیقت نہیں ہے۔“ ذوالنون نے مدھم لہجے میں کہا۔

”کیا حقیقت ہے؟“ لائبہ نے بے چینی سے پوچھا تو ذوالنون نے الف سے لے کر ی تک ساری بات بتادی اور لائبہ حیرت زدہ سی رہ گئی چند بل تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”اتنا کچھ ہو گیا اس بے وقوف لڑکی نے کسی کو بتایا ہی نہیں۔“ لائبہ نے افسردگی سے کہا۔

”انوار شاہ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا انہوں نے تم دونوں کی زندگی خراب کر دی۔“ لائبہ نے افسوس سے کہا۔

”دادا جان اب خود اپنے کیے پر افسوس کرتے ہیں لیکن اب ان کے افسوس کرنے سے گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا۔“ ذوالنون نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ہانیہ کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔“ اس نے دکھی لہجے میں کہا تو وہ چند بل کچھ بول ہی نہ سکا۔

”زاریہ پاکستان کب آئی؟“ اس نے پوچھا۔

”دو ہفتے ہو گئے ہیں پانچ سال بعد آئی ہے عید کے بعد چلی جائے گی۔“ لائبہ نے کہا۔

”کیسی ہے زاریہ.... اپنے گھر خوش تو ہے؟ میرا مطلب ہے اپنے شوہر کے ساتھ؟“ اس نے پچکا کر پوچھا۔

”زاریہ نے شادی نہیں کی۔“ لائبہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

”کیا....؟“ وہ ششدر رہ گیا۔

”ہاں.... بالکل.... اس نے شادی نہیں کی کیونکہ وہ آج بھی تم سے محبت کرتی ہے۔“ لائبہ نے مدھم لہجے میں کہا۔

”زاریہ تو بہت معصوم ہے ذوالنون! آج بھی اُسے اپنی نہیں تمہاری زندگی کی خوشیوں کا خیال ہے ذوالنون تم زاریہ سے شادی کر لو۔“ لائبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں لائبہ آپ! یہ زاریہ کے ساتھ نا انصافی ہے۔“ اس نے بے قراری سے کہا۔

”کیوں؟ اس میں نا انصافی کیا ہے؟“ لائبہ نے الجھ کر پوچھا۔

”لائبہ آپ! پہلے کی بات اور تھی اب میں دو بچوں کا باپ ہوں کیا یہ زاریہ کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی؟“

”ذوالنون! تم مجھے ایک بات بتاؤ کیا اب بھی تم زاریہ سے محبت کرتے ہو؟“

”لائبہ آپ! میں اس سے آج بھی بہت محبت کرتا ہوں ایک بل اُسے نہیں بھول پایا۔“ اس نے بے بسی سے

رداؤ انجسٹ [138] ستمبر 2012ء

کہا۔

”ذوالنون! مجھے پتہ ہے زاریہ کسی سے شادی نہیں کرے گی ابھی بھی وقت ہے تم دونوں کے پاس سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو زاریہ سے میں بات کروں گی۔“ لائبہ نے سمجھداری سے کہا۔

”کیا ایسا ممکن ہے لائبہ آپ!؟“ وہ متحیر ہوا اُمید کی ایک کرن نے اس کے اندر توانائی سی بھری تھی۔

”ہونے کو تو سب کچھ ممکن ہے اور زاریہ کا ظرف بہت بڑا ہے وہ تمہارے بچوں کو قبول کر لے گی۔“ لائبہ آپ نے یقین سے کہا۔

”تم اپنے پیرئس سے بات کرؤ باقی میں ہینڈل کر لوں گی اس دفعہ میں تم دونوں کو کوئی بے وقوفی نہیں کرنے دوں گی۔“ لائبہ نے بتاش لہجے میں کہا تو وہ کھل اٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆.....

اگلے دن زاریہ کے ساتھ وہ بھی لاہور آ گئی اس نے سب کو ساری بات بتادی سب حیرت زدہ رہ گئے انوار شاہ کی سنگدلی پر سب کو بہت دکھ ہوا پھر اس نے اپنے اور ذوالنون شاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بھی بتایا۔

”اب آپ لوگ سوچ لیں میرے خیال سے جب ساری غلط فہمی دور ہو گئی ہے تو زاریہ اور ذوالنون شاہ کی شادی کر دینی چاہیے۔“ لائبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن زاریہ! وہ کیا کہتی ہے؟“ نیل شاہ متذبذب تھے۔

”ماموں! زاریہ مان جائے گی ابھی وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہے پہلے میں نے سوچا آپ لوگوں سے پوچھ لوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں تو میں زاریہ سے بات کرتی ہوں۔“ لائبہ نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے لائبہ! تم زاریہ سے پوچھ لو اگر وہ راضی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ علیناہ شاہ نے مسکرا کر کہا کیونکہ وہ جانتی تھیں زاریہ ذوالنون سے بہت محبت کرتی ہے۔

”کیا.... یہ کیا کہہ رہی ہیں لائبہ آپ!؟“ وہ ساری بات سن کر حیرت سے چلا اٹھی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں زاری! ساری بات میں نے تمہارے سامنے بیان کر دی ہے اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے لیکن پہلے والی بے وقوفی مت دکھانا۔“ انہوں نے شرارت سے کہا تو وہ درط حیرت میں ڈوب گئی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا قسمت یوں بھی مہربان ہوتی ہے اسے آج پتہ چلا تھا ذوالنون شاہ اس کا ہور ہا تھا اس کی محبت جیت گئی تھی خوشی اور سرشاری اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”زاری! کہاں کھو گئیں؟“ لائبہ نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ خوشی سے لائبہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

”تھینک یو سوچ لائبہ آپ! اس نے کھکتے لہجے میں کہا لائبہ نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

☆.....☆.....☆.....

پھر دونوں گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی انوار شاہ بھی بہت خوش تھے ایک بوجھ تھا جوان کے دل سے سرک گیا تھا وہ خود زاریہ سے ملنے آئے تھے اس سے معافی بھی مانگی تو اس نے تڑپ کر دونوں ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ آمنہ شاہ اور حمزہ شاہ بھی بہت خوش تھے اور بچوں کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا وہ سب لوگ ذوالنون شاہ پیلس آئے ہوئے تھے سوائے ذوالنون کے وہ ابھی تک کراچی تھا اس دن کے بعد کبھی اس کا ذوالنون شاہ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ عمان اسے خوش دیکھ کر بے حد خوش تھا اسے اکثر چھیڑتا رہتا ذوالنون شاہ کے دونوں بچوں سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی زندگی ایک دم بہت خوبصورت سی ہو گئی تھی رمضان کا دوسرا عشرہ چل رہا تھا اس نے خوب

دل لگا کر عبادت کی شکرانے کے نوافل ادا کرتی رہی۔ ان دونوں کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی، اٹھائیسویں روزے کو ان کی شادی تھی، عید کے تیسرے دن اس کی فیملی نے لندن چلے جانا تھا، دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں زور و شور جاری تھیں، آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا، وہ پوری لگن سے اور عقیدت سے عبادت کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا نواز دیا تھا وہ اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا، ذوالنون شاہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ گھر سے نہ نکلتی، ذوالنون شاہ کا کٹی بار اس کے سیل پر فون آیا، اس نے یک ہی نہ کیا، اسے لائبہ آپی بتا چکی تھیں، وہ اس سے تھوڑی خفا ہے، اس لئے وہ فون پک نہیں کر رہی، کیونکہ وہ جانتی تھی وہ اس سے باز پرس ضرور کرے گا، اس لئے وہ گھبرا جاتی کہ وہ کیسے فیس کرے گی۔ آخر کار اس کی شادی کا دن بھی آن پہنچا، عجیب سی گھبراہٹ اس پر سوار تھی، جانے کتنی بار رو چکی تھی وہ ساری رات منٹ لان میں کی گئی تھی، ویسے بھی شادی سادگی سے کی گئی تھی۔

بچے اپنی نئی ماما کو پا کر بہت خوش تھے، مختلف رسموں کے بعد اسے ذوالنون کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، کمرہ بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، ذوالنون شاہ سے سامنا کرنے سے اس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا، تھوڑی دیر بعد ذوالنون شاہ کمرے میں آ گیا تو اس کی دھڑکنیں اور بھی تیزی سے چلنے لگی تھیں، وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

”السلام وعلیکم!“ ذوالنون نے فریش لہجے میں کہا، آج وہ بہت خوش تھا، اتنا کہ اس کا کوئی شمار نہیں، اسے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ زاریہ اس کی ہو چکی ہے۔

”علیکم السلام!“ اس کے صرف لب ہلے تھے، ذوالنون شاہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا، اس کی نظروں کی پیش سے وہ گنار ہو گئی تھی، شرم سے اس کا چہرہ جھک گیا تھا۔

”زاریہ! تمہارا نام کروڑ کہاں ہے؟“ اس کی آنکھوں سے شرارت صاف نظر آ رہی تھی، وہ مسکراہٹ ضبط کرتا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نام مر گیا۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”بہت افسوس ہوا، ورنہ آج تم مسز نام ہوتیں۔“ ذوالنون شاہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”میں جلتے سے کیسے شادی کر سکتی تھی؟“ اس نے برامان کر کہا تو ذوالنون شاہ کا قبہبہ بے ساختہ تھا، وہ خفت سے دوچار ہو گئی۔

”زاریہ!...!“ ذوالنون شاہ نے سنجیدگی سے پکارا۔

”زاریہ! تمہارا ظرف بہت اعلیٰ ہے، دوسروں کی خاطر تم نے اپنی خوشیوں کی قربانی دے دی، لیکن زاریہ! تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟ ایک بار... صرف ایک بار مجھ پر اعتبار کر کے تو دیکھتیں، زاریہ! ہم نے محبت کی تھی، کوئی گناہ نہیں جو دوسروں سے ڈرتے دادا جان نے جو کیا سو کیا، تمہیں تو مجھے بتانا چاہئے تھا۔“ ذوالنون شاہ نے دھکی لہجے میں کہا۔

”سوری ذوالنون! دادا جان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا اور صائم والے واقع نے مجھے اندر تک خوف زدہ کر دیا تھا۔“ اس نے آہستگی سے صفائی پیش کی۔

”زاریہ! آج ہماری زندگی کی نئی شروعات ہے، جس کو چلانے کے لئے اعتبار بہت ضروری ہے، ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا ہے، کچھ بھی ہو جائے ہم ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہیں چھپائیں گے، ٹھیک کہا ناں میں

نے؟“ ذوالنون نے اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا، پھر وہ اٹھا اور الماری سے ایک فائل نکال کر لے آیا۔

”زاریہ! یہ تمہاری رونمائی کا گفٹ ہے۔“ ذوالنون نے وہ فائل اس کے ہاتھ میں پکڑادی، اس نے حیرت سے پہلے فائل کو پھر ذوالنون شاہ کو دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”زاریہ! یہ وائٹ محل کے کاغذات ہیں آج سے یہ محل تمہارا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔

”لیکن ذوالنون!...!“

”پلیز... زاریہ! کچھ مت کہنا، میں جانتا ہوں اس وقت تم نے جان بوجھ کر کہا تھا، لیکن اب میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں، اگر تم نے انکار کیا تو مجھے تکلیف ہوگی۔“ زاریہ نے کچھ کہنا چاہا تو ذوالنون نے اسے ٹوک کر نرمی سے کہا، بے اختیار محبت کے اس مظاہرے پر اس کی آنکھیں جھلک پڑی تھیں، وہ اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

”زاریہ! آج تو خوشی کا دن ہے، پھر یہ آنسو...؟“ ذوالنون نے بے قراری سے کہا۔

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں، اس مالک کائنات نے اتنا نواز دیا کہ میں اس کا شکر کس طرح ادا کروں؟“ اس نے بھیکے لہجے میں کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا زاریہ! لقاں جان کہتی ہیں جو ہوا وہ ہماری قسمت میں لکھا تھا، صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا، وہ غم آنکھوں سے مسکرا دی۔

”یہ آنے والی عید ہمارے لئے بہت خوشیاں لے کر آئی ہے، اب ہمیں رونا نہیں مسکرانا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے چور لہجے میں کہا، تو وہ بھگی آنکھوں سے مسکرا کر اس دیوانے کو دیکھنے لگی۔

”زاریہ! یہ آنے والی عید میرے لئے بہت اسپیشل ہے، ویسے تو عید دو دن بعد آئے گی، لیکن میری عید تو آج ہے، کیونکہ ”میری عید تم ہو۔“ ذوالنون شاہ نے خوشی سے سرشار ہو کر محبت بھرے لہجے میں کہا، اور نرمی سے اسے اپنے حصار میں لے کر خمار بھرے لہجے میں شعر پڑھنے لگا۔

ہر دکھ، ہر غم کو بھول جائیں ہم
تم جو آؤ تو عید منا میں ہم
سنجال رکھے ہیں لفظوں کے موتی
دامن دل پھیلاؤ تو برسائیں ہم

زاریہ کے رخسار تھما اٹھے تھے، اس نے بڑی محبت سے ذوالنون شاہ کے خوشی سے دکتے چہرے کو دیکھا اور دل میں اللہ پاک کا شکر ادا کرنے لگی، اس نے اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کیا تھا اور اس کی رضا میں راضی ہو گئی تھی، اور آج اللہ پاک نے اسے اتنا نواز دیا تھا کہ وہ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

ختم شد

رداؤ انجسٹ [141] ستمبر 2012ء

www.paksociety.org

رداؤ انجسٹ [140] ستمبر 2012ء

سیدہ طوبی

افسانہ

میر و وطن کے اولیٰ لوگو

”السلام علیکم ویورز سچ نیوز کے ساتھ میں ہوں دعا سب سے پہلے سچ ہیڈ لائنز پنجاب کے شہر ملتان کی رہائشی عامر میں ہوں عالیان خان بولیشن میں شامل کرتے ہیں ایک خاتون نے مہنگائی سے تنگ آ کر اپنی تین بیٹیوں اور



ایک بیٹے کو زہر کھلا کر خودکشی کر لی اور ہر سال کی طرح اس سال بھی رحمتوں اور برکتوں والے مہینے کی آمد آمد اور اشیاء خرد و نوش کی قیمتوں میں چوتھائی فیصد اضافہ غریب عوام کے لئے ایک ایٹم بم سے کم نہیں آج پھر روشنیوں کا شہر کراچی اندھیرے میں ڈوبا رہا شہر کے مختلف علاقوں میں 12 سے 16 گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ جبکہ کراچی ہی میں آج لقمہ اجل بن جانے والوں کی تعداد 12 رہی ان میں سے 9 افراد کا تعلق کسی گروہ سے نہیں تھا جبکہ لی مارکیٹ کا رہنے والا اشرف جو اپنے کنبے کا واحد کفیل تھا دہشت گردوں کی اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنا بولیشن

میں مزید خبروں اور ہیڈ لائنز کے ساتھ حاضر ہوں گے لیتے ہیں ایک کمرشل بریک دیکھتے رہنے سچ نیوز۔
”اللہ جانے کیسے ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنے ہی بچوں کو مار دیتے ہیں۔“ دائم صاحب کے ساتھ صوفی پریٹھی ان کی شریک حیات طائلہ خاتون نے کچھ دیر پہلے سنی جانے والی خبر پر جھرجھری لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔
”بس بیگم! جس کے پاس رہنے کو گھر بھوک مٹانے کو کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ہو وہ ایک اکیلا آدمی ہی عاجز ہے پھر وہ تو چار بچوں کی ماں تھی یہ سوچو کہ کس دل گردے اور مجبوری کے عالم میں اس نے یہ



انتہائی قدم اٹھایا ہے ہمارا دین ایک مکمل دین ہے اگر اس پر عمل کرتے رہیں تو پیسہ روٹنگ میں رہے اور کوئی غریب بھوکا نہ سوئے کوئی آدمی اپنے گھر کو آگ نہ لگائے اور کوئی بھی شخص خود کش دھماکے کے لئے تیار نہ ہو۔

”ٹھیک کہتے ہیں آپ جب ہم روٹی، کپڑا اور مکان کی آس لوگوں سے لگا میں گے تو ایسا ہی ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ صاف کہتا ہے کہ تمہارے ہی اعمال کی صورت تم پر حکمران بھیجے جائیں گے تو یہ ہمارے ہی اعمال ہیں جو ہم پر بھوک و افلاس کا حملہ ہے۔ ان کی پاں میں ہاں ملاتے ہوئے وہ خبروں کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں جہاں اب تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔

”اف اس لائٹ کو بھی انہی جانا تھا۔“ طائلہ خاتون جھنجھلا کر بولیں۔

”زامہ، زمامہ بیٹا گیس لائٹ تو جلاؤ۔“ صوفے پر بیٹھتے ہی انہوں نے بیٹی کو آواز لگائی۔

”کیا بات ہے بیٹا جی آج کیا کھانا نہیں ملے گا۔۔۔۔۔؟“ لاؤنج میں موجود گیس لائٹ جلا کر وہ واپس کچن میں جا رہی تھی جب دائم صاحب نے کھانے کے بارے میں استفسار کیا، عموما وہ لوگ نوبے تک کھانا کھا لیتے تھے مگر اب ساڑھے نو بجنے کو تھے اور کھانا ندارد۔

”بس ابو! تھوڑی دیر ہے اصل میں آج سارا دن گیس نہیں تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہے اسی لئے دیر ہوگئی۔“ کہتے ساتھ ہی وہ کچن میں بھاگی تھی کہ جانتی تھی والد صاحب بھوک کے کچے ہیں۔

”لو ایک تو اس حکومت سے لائٹ کی لوڈ شیڈنگ کم ہوتی نہیں اور گیس کی لوڈ شیڈنگ بھی شروع کر دی۔“ ائم صاحب جھنجھلائے۔

”یہ صمیمس نہیں آیا ابھی تک نوبے تک تو آ جاتا ہے۔“

ب وہ طائلہ خاتون سے بیٹے کے بارے میں استفسار کر رہے تھے جو نائٹ شفٹ میں کوچنگ پڑھاتا تھا۔

”لو آگیا۔“ دروازے کی مخصوص دستک پر وہ اٹھ

کر کھولنے چل دیں۔

”السلام علیکم!“ اندر آ کر با آواز بلند سلام کرتا وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔

”یہ لیں بھائی جان! میں نے آپ کے لئے شربت بنا کر پہلے ہی فریج میں رکھ دیا تھا۔“ صندل فوراً بھائی کے لئے شربت اٹھالائی تھی۔

”کیا ہوا بیٹا جی! آج کچھ زیادہ ہی تھک گئے ہو کیا۔۔۔۔۔؟“ دائم صاحب نے اس کے تھکے ماندے وجود کو غور سے دیکھا۔

”بس ابو! صبح کالج اور پھر شام کو کوچنگ کے بچے ساری انرجی چوس لیتے ہیں اور پھر گرمی بھی تو غضب کی ہے، میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔“ باپ کو مطمئن کرتا وہ کمرے میں فریش ہونے چل دیا اور دائم صاحب اپنے ہونہار اور فرہنگ دار بیٹے کی پشت دیکھتے رہ گئے جو پچھلے دو سال سے اپنا ایم بی اے مکمل کر کے جاب کی تلاش میں تھا اور آخر تھک ہار کر اس نے صبح کالج اور شام کو کوچنگ میں پڑھانا شروع کر دیا تھا کہ کچھ تو مل ہی جاتا تھا ورنہ دائم صاحب کی پنشن اور زمامہ کی ٹیوشن سے گھر کا خرچ کیا چلنا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مس! پاکستان کا قومی پھل کون سا ہے۔۔۔۔۔؟“ زمامہ کے ایک شاگرد نے سوال کیا تو اس سے پہلے صندل بول پڑی۔

”صبر کا پھل۔“

”اور قومی لباس۔۔۔۔۔؟“

”کفن۔“ صندل کے بولنے پر زمامہ نے ابرو چڑھا کر دیکھا۔

”قومی کھیل۔“ بچہ صندل کے جوابات نوٹ بک پر لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور وہ مزے سے بتا رہی تھی۔

”خود کش حملہ نہیں وہ بھی پرانا ہو گیا کوئٹرا

اسٹرائیک۔“ صندل زمامہ کی گھوریوں سے بے پرواہ بولے جا رہی تھی، دراصل وہ رات کے لئے آٹا گوندھ

رہی تھی اس لئے صندل کو یقین تھا کہ وہ اسے اس وقت مار نہیں سکتی۔

”لیکن صندل باجی! کوئٹرا اسٹرائیک تو گیم ہے، میں نے بھی کھیلا ہے۔“ چوتھی جماعت کا فرید حیرت سے صندل کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”اف۔۔۔۔۔ بے وقوف وہی تو ہمارا قومی کھیل ہے ابھی پچھلے سال کئی پہاڑی پر کھیلا گیا، اس سال لیاری میں اور اگلے سال کہیں اور کھیلا جائے گا۔“ مزے سے بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا گیا۔

”مگر میری مس نے تو قومی کھیل ہاکی لکھوایا تھا“ جب میں دن کلاس میں تھا۔“ صندل کی بات فرید کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ہاں تو اب تم کون سی کلاس میں ہو۔۔۔۔۔؟“ بگڑ کر پوچھا گیا۔

”فور۔“

”تو بس پھر ان تین سالوں میں قومی کھیل بھی تبدیل ہو گیا۔“ سبزی کاٹتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا گیا۔

”چلیں میں اپنی مس سے پوچھوں گا۔“ فرید اس کی باتوں پر ذرا کم ہی یقین کرتا تھا کہ پہلے ایک دوبارہ صندل کے مذاق کی وجہ سے اپنی مس سے پٹ چکا تھا۔

”تمہاری تو۔۔۔۔۔“

”صندل! جاؤ کچن میں سارا کام سمیٹو میرے بچے ہیں میں دیکھ لوں گی تمہیں تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ فرید کی طرف غصے سے بڑھتی ہوئی صندل کو زمامہ نے کچن کے اندر دھکیلا۔

”بچے آپ کے نہیں اپنے ماں باپ کے ہیں آپ کے پاس تو صرف بڑھنے آتے ہیں۔“ کچن کی کھڑکی سے گردن نکال کر تھیک کی گئی جس پر سارے ہی بچوں کے دانت باہر نکل گئے۔

”بس۔۔۔۔۔ کام کرو اپنا اپنا اور شامیر دکھاؤ اپنی نوٹ بک۔“

”مس! 14 اگست آنے والی ہے تو مجھے اس پر لکھنا ہے اس اسائنمنٹ کے مارکس فائنل میں ملیں گے۔“

”ہاں تو لکھو اپنے ملک کے بارے میں کہ کتنی قربانیاں دے کر اور کتنی مشکلات جھیل کر حاصل کیا ہے ہم نے یہ ملک جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔“ ٹائٹل دیکھ کر اس نے رد کو چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔

”مس آپ جو باتیں کر رہی ہیں وہ تو ہسٹری ہے ہمیں تو کرنٹ افیئر ز پر لکھنا ہے تو میرا خیال ہے کہ میں دہشت گردی، بوری بند لاشوں اور بقول صندل باجی کوئٹرا اسٹرائیک کے بارے میں ہی لکھ لیتی ہوں میرا اسائنمنٹ سب سے زیادہ اچھا ہے گا مس اب یہ ملک رہنے کے لئے نہیں چھوڑ جانے کے قابل ہے ہمیں کہا گیا ہے کہ اپنے ملک کی تعریف میں لکھو تو ملک میں کچھ اچھا ہوگا تو تعریف کی جائے گی ناں۔“ ردانے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نوٹ بک اس سے لے لی۔

”نہیں رد! یہ ملک یہ سرزمین آج بھی اتنی ہی انمول ہے جتنی ہسٹری میں رہی ہے ہمارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے کہ ہم نے تاریخ کو لکھنے کی کوشش کی ہے اس سے سبق حاصل نہیں کیا جیسی آج ہسٹری اپنا آپ دہرا رہی ہے ہمارا ملک اگر دہشت گردی اور دوسری آفات میں جکڑا ہوا ہے تو کیا ہم اس کو چھوڑ دیں اگر تمہارے گھر کی عمارت خراب ہو جائے تو کیا تم اس کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی، نہیں ناں اس کی مرمت کرواؤ گی کہ جب تمہیں سائے کی ضرورت تھی تو اس گھر نے تمہیں سایہ فراہم کیا پھر پاکستان کو چھوڑ جانے کی بات ہم اتنے آرام سے کیسے کر جاتے ہیں کہ جب مسلمانوں پر برا وقت پڑا تو اس سرزمین نے بھی تو سایہ فراہم کیا تھا اور اب اگر یہ سرزمین مشکل میں ہے تو کیا ہمارا فرض نہیں اس کو ان مشکلات سے نکالنے کا اور پھر تم سب تو پاکستان کا آنے والا کل ہو اور کسی مفکر نے کہا ہے کہ۔ ماضی کی یاد

اور مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے بہتر اپنے حال کو تعمیر کرو۔ اسی لئے تمہارے ذہن اور نیت صاف ہونی چاہئے مقصد نیک ہونے چاہئے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور دیکھنا وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک بھی تمام تر آفات اور مشکلات سے آزاد ہوگا اور ہم اس میں سکون و اطمینان سے رہیں گے۔ زمامہ نے سنجیدگی اور ررسان سے سمجھانا چاہا تھا۔

”مس! اس بات پر ایک نعرہ ہو جائے۔ سب سے چھوٹا شامیر جوش سے بولا تھا۔

”پاکستان زندہ باؤ۔ اور سب نے اس کا ساتھ دیا تھا۔
”او میرے بھولے بچو! صبح کر لو پاکستان سے زندہ بھاگ۔“ عندل پھر بولی تھی اور اب چوں کہ زمامہ کے ہاتھ صاف تھے اس لئے اس کی ہونے والی عزت افزائی پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

☆.....☆.....☆
”اللہ خیر کرے پتا نہیں کس حال میں ہوگا میرا صمیمس۔“ طائلہ خاتون چلے پیر کی بلی کی طرح پورے لاؤنج میں چکر لگا رہی تھیں صمیمس نوبے تک آ جاتا تھا مگر اب گیارہ بجنے کو تھے اور وہ ندارد۔

”امی! ابو پتا کرنے گئے ہیں ناں کچھ نہیں ہوگا بھائی کو۔“ زمامہ نے انہیں صوفے پر بٹھا کر آرام سے سمجھایا۔
”کہاں سے پریشان ناں ہوں فون اس کا آف ہے اور شہر کے حالات تم جانتی ہو پھر اس کا کوچنگ تو دور بھی اتنا ہے۔“ طائلہ خاتون کو طرح طرح کے خیالات ستائے جارہے تھے۔

”لیس آگئے ابو بھی یقیناً بھائی کے ساتھ ہوں گے۔“ دروازے پر کھٹکے کی آواز سن کر عندل بھاگی تھی۔
”کیا ہوا صمیمس کہاں ہے.....؟“ داکم صاحب کو اکیلا دیکھ کر طائلہ خاتون کا رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔

”کیا ہو گیا ہے طائلہ! قابو رکھو خود پر آ جائے گا حالات کی وجہ سے ٹریفک بھی تو جام ہو جاتا ہے۔ اپنی پریشانی چھپائے وہ بیوی کو حوصلہ دے رہے تھے اور پھر

پورے دو گھنٹے بعد دروازے پر ہونے والی بیل نے ان سب کو چونکا دیا تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں طائلہ خاتون کو حوصلہ دیتے داکم صاحب دروازہ کھولنے چل دیئے۔
”صمیمس یہ کیا..... کیا ہوا ہے.....؟“ ماتھے اور ہاتھ پر بندھی پٹی اور خون آلود شرٹ کے ساتھ داکم صاحب کے سہارے چل کر اندر آتے صمیمس کو دیکھ کر طائلہ خاتون فوراً اس کی طرف لپکی تھیں۔

”طائلہ! آرام سے کچھ نہیں ہوا اسے بیٹھنے تو دو زمامہ بھائی کے لئے پین کمر اور ہلدی ملا دودھ لے کر آئیں فائٹ۔“ صمیمس کو اس کے بیڈ پر لٹاتے ہوئے انہوں نے طائلہ خاتون کو سکون سے رہنے کی ہدایت دی۔

”میں ٹھیک ہوں ابو! آپ امی کو ادھر میرے پاس ہی رہنے دیں۔“ پین کمر کے ساتھ دودھ پلا کر داکم صاحب اسے آرام کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے طائلہ خاتون کو باہر لے جانا ہی چاہتے تھے صمیمس نے ماں کی فکر مندی دیکھتے ہوئے انہیں اپنے پاس رکھنے کو کہا تھا۔

”کہاں سے ٹھیک ہو خون دیکھو کتنا بہہ گیا ہے تمہارا یہ سب ہوا کیسے آخر.....؟“ اپنی روکھی آواز پر قابو پاتے ہوئے پیار سے استفسار کیا۔

”کچھ نہیں امی! حالات تو بعد میں خراب ہوئے تھے اصل میں ہمارے کوچنگ میں پڑھنے والے کچھ اوباش لڑکوں کو سر عارف نے ڈانٹا تھا وہی لڑکے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر عارف کو اسٹاف روم میں ہی مارنے لگے وہاں موجود باقی اسٹاف اور میں نے بچ بچاؤ کرانا چاہا تو انہوں نے ہمیں بھی نہیں چھوڑا بات زیادہ بڑھی تو کوچنگ کے ہی لڑکوں نے ان سے مقابلہ کیا کچھ لڑکوں کو بھی چوٹیں آئیں اور کوچنگ کو بھی نقصان پہنچا سر عارف اور سر عدیل تو اچھے خاصے زخمی ہو گئے تھے کوچنگ کے لڑکے ہی ان کو اپنی گاڑیوں میں ہاسپٹل لے کر گئے اور پھر تمام زخمیوں کو حالات کے پیش نظر ان کے گھر تک چھوڑا مجھے بھی ایک اسٹوڈنٹ ہی چھوڑ کر گیا ہے۔“ اس کی ہمت تو نہیں تھی مگر ماں اور باقی گھر والوں

پر دھنسنے کرنے کے لئے ساری بات بتانا پڑی۔
”اچھا بیٹا! زمامہ تمہارے لئے یہ جوس لائی ہے یہ لیو اور آرام کرو۔“ طائلہ خاتون نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا اسے بہت زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں اور آرام کی ہدایت دیتی ہوئی باہر چل دیں۔

”بیٹاؤ بھلا جب استاد جو روحانی باپ ہوتا ہے اس کا یہ حال کریں گے تو ایسی تعلیم یا ڈگری کس کام کی جو تمیز ادب و احترام ہی نہ سکھا سکے۔“ طائلہ خاتون نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔

”بس بیگم! بعض اوقات وہ کام جو ہمارا دشمن انجام دے سکے اس کو ہم خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر باپ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں پاکستان کو بگاڑنے والے پہلے کیا کم تھے جو ہماری نوجوان نسل بھی اس مشن پر ان کے ہم قدم ہو گئی ہے اللہ ہی بھلا کرے پاکستان کا بتاؤ ذرا کس بری طرح پیٹا ہے اپنے استادوں کو ارے استاد نہ ہوں تو رہیں نہ رے جاہل کے جاہل۔“ داکم صاحب نے بھی اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”ابو! ٹھیک ہے ہمارے ملک میں کچھ اچھا نہیں ہو رہا مگر ہم سب ہی کیوں برائی ڈھونڈتے ہیں اچھائی ہمیں نظر کیوں نہیں آتی بھائی کو اگر مارنے والے ان کے شاگرد تھے تو بچانے والے بھی تو شاگرد ہی تھے ناں۔“ زمامہ نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے باپ کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”اچھا چلو اب چل کر سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے کل ویسے بھی جمعہ ہے۔“ بات سمیٹتے اور ان دونوں کو سونے کی تلقین کرتے ہوئے طائلہ خاتون خود بھی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”آپی! یہ آپ ہر بات کا اچھا پہلو ہی کیوں کھوجتی ہیں.....؟“ بیڈ پر اس کے برابر لیٹتے ہوئے عندل نے اس سے پوچھا تھا۔

”اور مشکلات کیا کم ہیں جو ہم ہر بات کا برا پہلو کھوج کر خود کو ہی ہلکان کریں۔“ اس کی بات کا

جواب دیتے ہوئے اس نے لیمپ آف کیا تھا۔
اور پھر عندل کے سو جانے کے بعد وہ چپکے سے اٹھ کر وضو کرنے کی نیت سے ہاتھ روم گئی تھی اور دو رکعت نفل پڑھ کر اس نے رورو کر اپنے ملک و قوم کی سلامتی کے لئے دعا مانگی تھی کہ چاہے یہ ملک جیسا بھی تھا اس کا اپنا تھا اسے اس ملک سے محبت تھی۔

☆.....☆.....☆
”عندل! ولیم تو کم کروٹی وی کی آواز پورے گھر میں گونج رہی ہے۔“ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی زمامہ نے عندل کو تنبیہ کی۔

”افوہ آپی! 14 اگست آنے والی ہے تو یہ ملی نغمے سننے کو مل رہے ہیں ورنہ اب تو پاکستان کے بھی ہر چینل پر مٹی اور شیلہ اچھلتی کودتی نظر آتی ہیں۔“ ولیم تھوڑا اور بڑھادیا گیا۔

”اف اللہ پوچھے تمہیں عندل! دیکھو دروازے پر شاید امی ابو ہیں جا کر کھولو دروازہ۔“ زمامہ نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر آواز دھیمی کی۔

”اف اللہ کی پناہ آج تو تھکا مارا ایک گرمی نے دوسرا مہنگائی نے ہر چیز کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے بیچاری غریب عوام کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔“ طائلہ خاتون آج اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں داکم صاحب کے ساتھ اتوار بازار گئی تھیں۔

”آج تو غضب کی گرمی تھی آپ نے آج جانا ہی نہیں تھا۔“ دونوں کو لیمن جوس دیتے ہوئے عندل نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”بیٹا جی! اب جولائی میں تو گرمی ہوگی ہی آج کا دن ہو یا بعد کا اور پھر آج کل میں رمضان بھی شروع ہو جانے ہیں تو میں نے اور تمہاری امی نے سوچا آج ہی لے آئیں تمام چیزیں۔“

”ٹھیک کیا ابو! آپ نے میں ذرا یہ سارا سامان رکھ کر تھوڑی دیر میں کھانا لگا رہی ہوں جب تک بھائی بھی آ جائیں گے آپ دونوں بھی منہ ہاتھ دھو کر فریش

ہو جائیں۔“ لاؤنج میں بھر اسارا سامان اٹھا کر زمامہ کچن کی طرف چل دی تھی۔

”یہ صمیس کہاں گیا ہوا ہے ابھی اس کے زخم ٹھیک کہاں ہوئے ہیں اوپر سے گرمی بھی آج غضب کی ہے۔“ زمامہ کے پیچھے پیچھے بھی طائلہ خاتون بھی کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

”آپ جا کر باہر بیٹھیں آرام سے بھائی کو ان کے گلی کے ہی دوست لے گئے ہیں ہر سال کی طرح اس سال بھی شاید یہ لوگ 14 اگست کا فکشن رکھیں گے۔“ دیکھو! اس سال کیا کرتے ہیں یہ لوگ۔

بڑبڑاتے ہوئے وہ دائم صاحب کے پاس جاتی تھیں جو پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ تھے جس پر مہنگائی کے بارے میں عوام کی رائے لی جا رہی تھی۔

”بس صاحب دودھ پھل فروٹ تو غریب عوام پر حرام کر دی گئی ہے یہ لوگ اب دالوں پر سے بھی ان کی اجارہ داری چھیننا چاہتے ہیں صاحب آپ خود پڑھے لکھے ہو آپ جانتے ہو کہ پوری دنیا میں رمضان کے لیے خصوصی رعایت ہوتی ہے یہاں تو ایک روپے کی چیز چار روپے کی کر دی جاتی ہے کہ کل کے مرتے آج مرو۔“ کمرے پر بولنے والا شاید کچھ زیادہ ہی دگمی تھا اسی لئے رو پڑا۔

”آپ پلیز اپنے جذبات پر قابو رکھیں مگر آپ کو نہیں لگتا حکومت کے ساتھ ساتھ یہاں عوام بھی بے حس ہے لوگ اگر صحیح طرح اپنی زکوٰۃ اور خیرات نکالیں تو غریب کو کبھی اتفاق ہو۔“ سکر نے اسے دوسری طرف لگایا۔

”بس صاحب! یہاں زخمی روڈ پر تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے مگر کوئی اٹھا کر اسپتال لے کر نہیں جاتا کہ نہیں سارا کس مجھ پر آ جاتے تو غریب کی مدد تو بہت دور کی بات ہے مجھے تو۔“

”نہیں یہ بات غلط ہے۔“ ابھی وہ سکر سے شاید کچھ اور کہتا مگر پیچھے سے آنے والی آواز نے اسے روک دیا کوئی شخص جھوم کو جیرے تاروا آگے بڑھا تھا۔

”میں آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں ٹھیک ہے یہاں بہت سے لوگ بے حس ہیں ہماری حکومت کی طرح مگر سرپانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس سر زمین پر برے لوگ بھی رہتے ہیں مگر ہم ان کے ساتھ اچھوں کو بھی نہیں برا کہہ سکتے۔“

”میں آپ کی بات سے ایگری کرتا ہوں۔“ سکر نے فوراً پینٹر ابدلا۔

”بالکل سرور نہ سیلانی، چھپا، ایدھی، ویلفیر کے ادارے نہیں ہوتے۔“

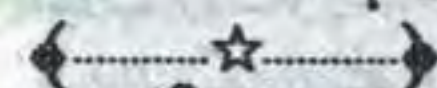
”آپ کی بات اپنی جگہ مگر یہاں حکومت کے ساتھ ساتھ عوام بھی عوام کی دشمن ہے کوئی بھی بحیثیت قوم نہیں سوچتا ہر کوئی صرف بحیثیت فرد سوچتا ہے پہلے اپنا مفاد پھر چاہے عوام و ملک کی جڑیں کھوٹی ہو جائیں آپ دیکھیں کہیں بھی احتجاج ہو رہا ہو عوام کو نقصان پہنچانے والی بھی عوام ہی ہوتی ہے روڈ بلاک کر کے اور گاڑیاں جلا کر عوام کو ہی تو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اب تیسرے بندے نے بحث میں حصہ لیا تھا۔

”اف تو بہ ہے کیا یہ آپ ہر وقت یہ لڑائی جھگڑا دیکھتے رہتے ہیں۔“ طائلہ خاتون جھنجھلائی۔

”نہیں بات وہ بالکل ٹھیک کر رہا تھا حکومت تو اپنی جگہ مگر عوام بھی کچھ کم نہیں ہے اور اگر یہاں دیکھوں تو کیا آپ کی طرح گھر گھر جا کر ایک دوسرے کی برائی کیا کروں۔“ دائم صاحب نے اپنی مسکراہٹ روکی۔

”لو میں کب کسی کے گھر جا کر ایک دوسرے کی برائی کرتی ہوں۔“

”اب یہاں بھی ٹاک شو شروع۔“ عندل بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی جاتی تھی کہ یہ شو جلدی ختم ہونے والا نہیں ہے۔



”پاکستان 2050 تک تقسیم ہو جائے گا اور میں نہیں کوئی ماہر تجزیہ کار کہہ رہا ہے۔“ ثاقب نے اخبار کی سرخی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اے چل ہٹ تو 2050ء کی بات کرتا ہے بس تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے سرحد کو حکومت نے ہی جاہ کر دیا آپریشن کر کر کے بلوچستان کی اپنی الگ کہانیاں چل رہی ہیں پنجاب میں سرائیکی اور اللہ جانے کون کون سی تحریکیں چل رہی ہیں رہ گیا ہے چارہ سندھ تو بھائی یہ حکمران پورا اسے بھی رہنے نہیں دیں گے تو بس ہو گیا ناں پاکستان الگ اس پر عمل بھی آہستہ آہستہ ہو رہا ہے نتیجہ 2025ء تک آئی جائے گا دیکھ لیتا۔“

”کیا دیکھ لیتا.....؟“ نعمان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی جب صمیس اور ارم چلے آئے۔

”ہاں تو کیا دیکھنے کی بات ہو رہی تھی.....؟“ نعمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ارم نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنا چاہا۔

”پاکستان کو تقسیم دیکھنے کی بات ہو رہی تھی۔“ بڑے سکون سے جواب دیا گیا۔

”کیا مطلب.....؟“ چونکے والا صمیس تھا۔

”مطلب یہ کہ یہ ثاقب کہہ رہا تھا کہ کسی نے تجزیہ کیا ہے کہ پاکستان 2050ء میں ٹوٹے گا میں نے کہا بھائی کہاں اتنی دور بھاگ رہا ہے پاکستان تو سمجھو ٹوٹ ہی گیا کیوں صحیح کہاناں میں نے.....؟“ استہزایہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا گیا۔

”جن لوگوں کا خواب ہے کہ وہ پاکستان کو ٹوٹا ہوا دیکھیں ان کی نسلیں ختم ہو جائیں گی، حکمران کا خواب انشاء اللہ پورا نہیں ہوگا۔“ صمیس نے پر یقین لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ارم اور ثاقب نے بھی انشاء اللہ کہا تھا۔

”اے چل کن ہوشوں میں ہے صرف سرحدیں ایک ہونے سے ملک ایک نہیں ہوتا لوگوں کو ایک ہونا پڑتا ہے اور یہاں بلوچ اور پنجاب کی نہیں بنتی تو سندھی اور پنجتون ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں بات کرتا ہے ایک ملک کی ہونہ.....“ نعمان جذباتی ہوا۔

”ہاں کچھ لوگ ہیں۔“ کچھ لوگ اسے یہ پورا ملک ہی اب رہنے کے

قابل نہیں ہے مجھے کوئی دو پیسے دے میں فوراً یہاں سے نکلوں رہنے کے لئے یہاں ہے ہی کیا اب بھوک افلاک یہ ملک اب صرف مرنے کے لئے رہ گیا ہے یا پھر بڑھاپے کے لئے جوانی یہاں پر رہ سکتی ہے پل نہیں سکتی۔“ نعمان زہر خند ہوا۔

”مگر پاکستان کو ہماری قبروں اور تابوتوں کی ضرورت نہیں ہے پاکستان کو ہماری جوانی اور وہ گرم خون چاہئے جو ہماری رگوں میں خواب اور آئیڈیلم بن کے دوڑتا ہے ہم پاکستان کو اپنی جوانی نہیں دے سکتے تو پاکستان کو اپنا بڑھاپا بھی مت دینا جس ملک میں تم جینا نہیں وہاں مرنا بھی مت کہ پاکستان کی سر زمین کو ان کا وجود زیب دینا ہے جو اس سر زمین کے لئے مریں۔“ صمیس بولا۔

”اچھا چل چھوڑ ہم یہاں جھگڑا کرنے نہیں 14 اگست کے بارے میں بات کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔“ ثاقب نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

”14 اگست مناؤ گے تم لوگ جاؤ جا کر دیکھو ان لوگوں کے گھروں میں کیا کہرام مچا ہوگا جن کے باپ اور بھائی بے وجہ مارے گئے صرف ہلے گلے اور لمبی لمبی تقریروں سے حب الوطنی کا حق ادا نہیں ہوتا کچھ کرنا ہے ناں تو سب کے لیے نہیں تو کچھ لوگوں کے ہی مسائل حل کرنے کا سبب بنو حق ادا ہو جائے گا 14 اگست کا۔“ غصے میں ارم کا ہاتھ جھک کر نعمان بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”بات اس نے غصے میں کی ہے مگر صحیح کی۔“ صمیس نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں واقعی چلو سوچتے ہیں کچھ اس بارے میں مگر یار یہ کب نکلے گا اس غصے سے۔“ ارم نے تاسف سے اسے ہلایا۔

”جان سے پیارا بھائی کھویا ہے اس نے کوئی معمولی بات نہیں۔“ ثاقب بھی افسردہ ہوا نعمان کا بھائی پچھلے سال ان کی جامع مسجد میں ہونے والے دھماکے

میں شہید ہوا تھا۔ اور اس واقعے کے بعد سے ہی نعمان اس ملک اور یہاں کے رہنے والوں سے خائف تھا۔
 ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ.....“ ان دونوں کو بھی افسردہ دیکھ کر صمیم نے بات پلٹی تھی اور اب وہ تینوں سر جوڑے ڈسکشن میں مصروف تھے۔

☆.....☆.....☆

”بھائی 14 اگست میں کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں اور آپ لوگوں نے ناں تو گلی کو سجایا اور ناں ہی مجھے کسی فنکشن کے آثار لگتے ہیں تو پھر پچھلے سال سے بھی زیادہ پیسے کس خوشی میں لئے ہیں آپ کی چندہ کمیٹی نے؟“ صمیم کے دوستوں کو عندل چندہ کمیٹی ہی کہتی تھی کہ ہر ایونٹ پر وہ لوگ چندہ جو جمع کرتے تھے۔

”بس اس دفعہ 14 اگست پر کچھ نہیں ہوگا اور پھر رمضان میں فنکشن کچھ مناسب نہیں لگتا۔“ صمیم نے پلان بناتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر پیسے کس خوشی میں لئے آپ کی کمیٹی نے.....؟“ عندل بگڑی کے اسے ہلے گلے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

”تمہارے تو نہیں ہیں ناں تو چلو بھاگو یہاں سے۔“ اس کی مسلسل اگواڑی پر وہاں سے اسے بھگایا۔
 ”زامہ.....“ کمرے کی طرف جاتی زامہ کو آواز دے کر اسے بلایا۔

”جی بھائی!“

”تمہاری پاکٹ منی بلکہ بچوں کی فیس جو تمہارے پاس آتی ہے اس میں سے تمہارے پاس کتنی رقم ہے.....؟“ بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو چاہئے کیا.....؟“ تعجب سے استفسار کیا کہ اس سے پہلے صمیم نے اسے پیسے دیئے ضرور تھے مگر مطالبہ کبھی نہیں کیا تھا۔

”ہاں اگر دل سے دو تو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ ان کا استعمال اچھی جگہ ہوگا اور پلیز یہ مت پوچھنا کہ کہاں ہوگا عید پر سب پتا چل جائے گا۔“

”مجھے آپ پر یقین ہے بھائی۔“ اور پھر اس نے اپنی ساری جمع پونجی جو امی نے اس کو اپنے خرچ کے لئے دیئے تھے صمیم کو دے دیئے۔
 ”شکریہ۔“ اس کو جاتا ہوا دیکھ کر صمیم مسکرا دیا اسے پتہ تھا کہ جب اسے ان پیسوں کے مصرف کا پتہ چلے گا تو بہت خوش ہوگی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر گزرتے دنوں کے ساتھ رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ اپنی تمام تر شان و شوکت سے اختتام پذیر ہوا تھا۔
 ”چاند مبارک ہو ابو!“ تمام مساجد میں چاند کا اعلان ہو چکا تھا اور سب ہی ایک دوسرے کو چاند کی مبارکباد دے رہے تھے۔

”آپ کو بھی مبارک ہو۔“ دائم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔
 ”آپی! یہ آج گلی میں کچھ زیادہ ہی ہنگامہ نہیں لگ رہا۔“

”کیوں بھی چاند رات ہے تو ہنگامہ تو ہوگا ہی۔“ صبح کے لئے سب کے کپڑے استری کرتے ہوئے زامہ نے جواب دیا۔

”نہیں ناں آج بات کچھ اور لگتی ہے ابھی دو تین ٹرک وہاں میدان کی طرف گئے ہیں۔“ عندل پر ہنسن ہوئی۔
 ”چھوڑو بھی ہمیں کیا اور تم جا کر ذرا امی کا ہاتھ بٹاؤ پھر تمہارے مہندی لگا دیتی ہوں۔“ اور پھر تمام کاموں سے فارغ ہو کر عشاء پڑھنے کے بعد بے اختیار ہی زامہ نے سب کی عید کی خوشیوں کے لئے دعا مانگی تھی۔

لونا دے ہمیں وہ عید کی خوشیاں

جو ہم سے روٹھ گئی ہیں

اے میرے مولا

تو ایسا معجزہ کر دکھا

میری سر زمین پر محبت کا وہ اہتمام کر دے

☆.....☆.....☆

”آپ سب کو عید مبارک۔“ نماز پڑھ کر آتے ہی

صمیم نے سب کو مشترکہ مبارکباد دی۔
 ”بھائی خالی مبارکباد۔“ عندل ٹھٹکی۔

”نہیں ایک خوشخبری بھی ہے۔“ صمیم شرارتی ہوا۔
 ”ناں بھی پہلے عیدی بعد میں خوشخبری کہیں اب خالی اسی پر ناں ٹر خادیں۔“ عندل کے کہنے پر سب ہی ہنس پڑے۔

”اچھا بھی تم پہلے عیدی لے لو۔“ صمیم نے اس کی مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ پر رکھی۔
 ”ہونہہ..... یعنی آپ بھولے نہیں چلیں اب خوشخبری سنا دیں۔“ نوٹ گنتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا گیا۔

”محلے کے میدان میں میلہ لگا ہے وہ بھی بالکل فری۔“ اس نے دھماکہ کیا کہاں ان کا چھوٹا سا محلہ کہاں میلہ۔
 ”کس نے لگوایا ہے؟“ زامہ نے بھائی کو بغور دیکھا۔

”ہم نے یار! اور کس نے دراصل اس سال ہم نے جو 14 اگست کے لئے گھروں سے پیسے لئے تھے تو اس سے ہم نے محلے کے تمام غریب گھروں میں راشن ڈلوایا اور چونکہ اضافی رقم لی تھی اسی لئے اس فری میلے کا انتظام کیا تاکہ محلے کے تمام غریب بچے صحیح طرح انجوائے کر سکیں رقم جو بھی کم پڑی وہ ہم نے علاقے کے باطمینان سے درخواست جمع کروا کر لے لی اس سال ہم نے فنکشن اسی لئے نہیں کیا کہ فنکشن کا کیا ہے ایک دن کا ہلہ گلہ اور پھر ختم اب بہت ساروں کی نہیں تو کچھ تو اپنے ہم وطنوں اور محلے داروں کی مدد کر ہی دی ہم لوگوں نے۔“ صمیم خوش خوشی اپنا کارنامہ بتا رہا تھا۔

”بہت اچھا کیا بیٹا! تم لوگوں نے اپنے محلے داروں کے بارے میں سوچ کر پاکستان کو تمہاری اسی سوچ کی ضرورت ہے۔“ دائم صاحب نے سیرا ہا۔
 ”نہیں پتا ہے زامہ تم سے جو اضافی رقم لی تھی اس طرح ارقم نعمان اور ثاقب وغیرہ نے بھی رقم جمع کی تھی اس رقم سے ہم لوگوں نے محلے کے کچھ بہت ہی سفید

پوش گھروں میں رہنے والے بچوں کے عید کے کپڑے خریدے اور ان سب بچوں میں اس طرح بانٹے کہ گھر والوں اور بچوں کو شک نہیں ہوا ہوگا۔“
 ”واہ جی واہ گھر والوں کو کیسے پتہ نہیں چلا ہوگا۔“ عندل نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

”اف دادی اماں وہی بتا رہا تھا ہم لوگوں نے ایک کوڑر رکھا اور پھر بچوں سے نہایت ہی آسان سوالات پوچھے ہر جیتنے والے بچے کو ایک گفٹ ملا جس میں ایک نیا سوٹ تھا اور زامہ مجھے نہایت ہی شرمندگی ہوئی جب میں نے شامیر سے پوچھا کہ ہمارا قومی کھیل کون سا ہے جانتی ہو اس نے کیا کہا.....؟“ وہ کچھ توقف کر کا۔

”کونٹرا اسٹرائیک جو پہلے کٹی پہاڑی پر کھیلا گیا پھر لیاری میں اور اگلے سال کہیں اور کھیلا جائے گا۔“ اس کے بتانے پر سب ہنس پڑے اور زامہ عندل کو گھور کر رہ گئی۔
 ”یہ ہنسنے کی بات ہے یہ سکھاتی ہو تم بچوں کو۔“ صمیم نے ڈپٹا۔

”بھائی! یہ عندل ہی اوٹ پٹانگ بولتی رہتی ہے۔“ وہ منمنائی۔

”ناں عندل بیٹا! بچوں کو ہمیشہ اپنے ملک کے بارے میں اچھی بات بتانا چاہئے تاکہ وہ ملک کے بارے میں اچھا سوچیں اس کو ریٹرن اچھا دیں۔“ طائلہ خاتون نے تنبیہ کی۔

”جی بالکل۔“ صمیم نے ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 ”اچھا چھوڑیں میلے میں کب تک چلیں گے۔“ عندل نے فوراً بات بدلی۔

”شام میں ابھی دھوپ دیکھی ہے تم نے۔“ زامہ نے گیلری سے ہو کر آتی دھوپ کی طرف متوجہ کیا۔ اور پھر شام کو میلے میں ہنسنے کھلکھلاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ شاید کل اس نے جو دعا مانگی تھی وہ پوری ہو گئی تھی اور اس نے دل سے ایک اور دعا کی تھی کہ اس سال جو ان کی چندہ کمیٹی نے کیا تھا اگلے سال کوئی اور بھی کرے۔

☆.....☆.....☆

سرور و ریح

”اک بار آ جاؤ پلیز حنان اس سے پہلے کہ بندھن طوٹ جائیں سانس چھوٹ جائے“ اک بار آ کے مجھے معاف کر دو پلیز تمہارے بنا شب و روز یہ زندگی اک دشت سی لگتی ہے میں کب تک سب سے چھپاؤں



گی کہ تم میری وجہ سے اتنی دور ہو گئے ہو اور کتنی سزا سہوں میں اب مجھ میں صمت نہیں ہے اک بار آ جاؤ پلیز.....“ روتے روتے وریشہ نے حنان کی تصویر پر اپنے لب رکھ دیئے اور پچھلے ایک سال سے اس کی یہی حالت تھی روز کمرے کی تنہائی میں حنان کی تصویر سے باتیں کرنا اور روتے روتے وادی خیند میں کھوجانا غلطی بھی تو اسی سے سرزد ہوئی تھی جس کا کفارہ اسے ہجر کی صورت ادا کرنا پڑ رہا تھا حنان نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی کس قدر دلبرداشتہ اور خفا ہو کے گیا تھا وہ یہی احساس وریشہ کے پچھتاوے کو بہت بڑھا دیتا تھا۔

☆.....☆

”وریشہ! کدھر عائب ہو یا ر! میں پورے گھر میں تمہیں آوازیں دے رہا ہوں اور تم یہاں وارڈ روب میں کپڑے نکالنے میں مگن ہو۔“ حنان نے اپنا بیگ اور فائلز بیڈ پر اچھالتے ہوئے وریشہ کے قریب جا کے کہا جو کافی دیر سے کپڑے سیلیکٹ کرنے میں مصروف تھی۔

”کیا ہوا! آج آپ اتنی جلدی آگئے خیریت تو ہے نا سب.....؟“ وریشہ نے حنان کی جانب پلٹتے ہوئے مسکرا کر کہا تو حنان نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

”ہاں ہاں سب خیریت ہے جناب ہم تو بس آپ کی ایک مسکراہٹ دیکھنے کے لئے جلدی آ جاتے ہیں بس۔“ حنان نے شرارت کرتے ہوئے کہا تو وریشہ اس کے حصار سے نکل کر بھاگ گئی جبکہ حنان کی ہنسی سے پورا کمرہ مہک اٹھا۔

”ارے سنبھل کے بھابی کدھر بھاگی جا رہی ہیں آپ کوئی بھوت تو نہیں دیکھ لیا۔“ تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے وریشہ اپنی اکلوتی نند فرح سے ٹکرا گئی تو اس نے معنی خیزی سے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے نہیں فرح! وہ بس بچن میں کچھ کام تھا اس لئے۔“ وریشہ نے شرمندگی سے کہا تو فرح کی ہنسی نکل گئی۔

”اف..... میری پیاری بھابی جان! صاف صاف کہئے نا کہ آج بھائی جان جلدی آ گئے ہیں اس لئے آپ کو مارے خوشی کے کچھ سوچہ نہیں رہا۔“ فرح نے چھیڑتے ہوئے کہا تو وریشہ اسے مارنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگی جبکہ فرح امی کے کمرے میں جا گئی۔

☆.....☆

”وریشہ! اک بات پوچھوں تم سے.....؟“ حنان نے وریشہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی پوچھیں نا.....؟“ وریشہ نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہیں مجھ پر کتنا بھروسہ ہے اگر میں تم سے کبھی کہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں ہو تو تم کیا کہو گی.....؟“ حنان نے سنجیدگی سے کہا تو وریشہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

”حنان پلیز! اسٹاپ اٹ آج کے بعد مجھ سے مذاق میں بھی ایسی کوئی بات مت کہئے گا مجھے آپ پر اپنے آپ سے بھی زیادہ بھروسہ ہے مگر میں یہ بات کبھی نہیں برداشت کر سکتی نہ مان سکتی ہوں کہ میرے حنان کی زندگی میں میرے علاوہ کبھی کوئی لڑکی بھی ہو سکتی ہے آپ کی زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی صرف میں ہوں اوکے۔“ وریشہ نے غصے میں کہا تو حنان کی ہنسی نکل گئی۔

”اف..... تو بہ ہے تم سے تو مذاق بھی نہیں کرنا چاہئے میری جان! میں تو بس تمہارے منہ سے اظہار سننا چاہ رہا تھا اور تم اتنی سیریس ہو گئیں ذرا شکل دیکھو اس وقت شیشے میں اپنی ایسا لگ رہا ہے جیسے حقیقت میں میری زندگی میں کوئی لڑکی آ گئی ہے۔“ حنان نے اس کی آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہا تو وریشہ کے رونے میں اور شدت آ گئی اور وہ حنان کے سینے میں سر چھپا کے پھوٹ کے رو دی۔

”حنان! آپ بہت برا کرتے ہیں ایسے مت کہئے گا اب۔“ وریشہ نے روتے ہوئے کہا تو حنان نے

اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
”نہیں جان حنان کبھی نہیں“ بس آج معاف کر دو۔ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وریشہ بھی مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

حنان نوید، نوید اقبال اور عائشہ نوید اقبال کا اکلوتا بیٹا تھا اس کے بعد اللہ نے انہیں فرح اور حرا سے نوازہ تھا حنان نے ایم بی اے کے بعد اپنا فیملی بزنس سنبھال لیا تھا جس کے بعد نوید اقبال نے اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی فرید اقبال اور زرش فرید اقبال کی بیٹی وریشہ فرید اقبال سے حنان نوید کی شادی کر دی وریشہ فرید اور زرش کی اکلوتی اولاد تھی جسے انہوں نے منتوں سے شادی کے پانچ سالوں بعد پایا تھا یہی وجہ تھی وہ بہت نازوں میں پلی تھی نہ صرف فرید بلکہ نوید اور عائشہ کو بھی وہ بے حد عزیز تھی ایک ہی گھر میں پلنے بڑھنے کے سبب بچپن سے ہی وریشہ اور حنان میں ذہنی ہم آہنگی تھی جو کب پیار کے رنگ میں بدل گئی پتہ ہی نہ چلا اور وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے مگر ان کی پرسکون زندگی کے سکوت توڑنے والی ہستی زویا رحمن ان کے اس رشتے کی دھجیاں اڑا گئی جسے وریشہ اور حنان کا پیار بھی نہیں بچا پایا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو..... جی کون.....؟“ کافی دیر سے متواتر بجتے حنان کے موبائل فون کو اٹھاتے ہوئے وریشہ نے کہا مگر دوسری جانب چھائی خاموشی سے وریشہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”جب بات کرنی نہیں ہے تو کال کیوں کی ہے حد سے بہت فالتو وقت ہے آج کل لوگوں کے پاس۔“ مسلسل چھائی خاموشی سے تنگ آ کر وریشہ نے جھنجھلا کر کہا تو دوسری جانب کا سکوت ٹوٹا۔

”مجھے حنان سے بات کرنی ہے زویا بول رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے آواز آئی تو نسوانی آواز

سننے ہی وریشہ کو یکدم غصہ آ گیا اور اس نے کال کاٹ دی مگر موبائل تھوڑی دیر بعد پھر بجنے لگا اور اسکرین پر جگمگاتے اسی نمبر کو دیکھ کر وریشہ کا دماغ آؤٹ ہو گیا اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

☆.....☆.....☆

”یہ زویا کون ہے.....؟“ اگلے دن وریشہ نے حنان سے پوچھا جو اس وقت کمپیوٹر میں کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھا وریشہ کے لہجے میں چھپے شک کو حنان نے بہت اذیت سے محسوس کیا۔

”آفس کو لیگ ہے میری اور کون ہوگی اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے پہلے تو آج تک تم نے اس طرح بات نہیں کی۔“ حنان نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”تو اور کس طرح سے بات کروں آج سے پہلے گھر میں اس طرح آپ کو لڑکیوں کے فون بھی تو نہیں آئے اور آفس کو لیگ ہے رات میں فون کرنے کی اجازت اسے کس نے دی وہ بھی آپ کے پرسنل نمبر پر بولیں۔“ وریشہ نے حنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”کب کی کال اور اگر کر بھی لی تو کیا گناہ ہو گیا ہمارے آفس کی بہت قابل در کر ہے وہ کوئی کام ہوگا اسے تم بلاوجہ بات کو مت بڑھاؤ وریشہ حد ہے غلط رویے کی بھی پتا نہیں کیا کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہو۔“ اب کے حنان نے غصے میں کہا تو وریشہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جس کو نظر انداز کرتے ہوئے حنان کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

”کیا بات ہے بیٹا! کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو کوئی پرابلم ہے.....؟ کافی پریشان لگ رہے ہو.....؟“ نوید اقبال نے کھانا کھاتے ہوئے حنان سے پوچھا جو غائب دماغی سے پلیٹ میں جمع ہلا رہا تھا۔

”نہیں پاپا! کچھ نہیں بس ایسے ہی بھوک نہیں

ہے۔“ حنان نے جواب دیتے ہوئے وریشہ کو دیکھا جو اطمینان سے کھانے کے ساتھ انصاف کرنے میں مصروف تھی جبکہ اس کے دل میں اک طوفان بپا تھا۔

”اچھا شکر ہے ورنہ میں سمجھا آفس کی کوئی پرابلم ہوگی ارے ہاں آفس سے یاد آیا وہ اپنے رحمن صاحب کی بیٹی کیا نام ہے اس کا ہاں زویا اس نے آفس جوائن کر لیا نا.....؟“ نوید صاحب نے زویا کے متعلق پوچھا جو ان کے نہایت قریبی دوست رحمن صاحب کی بیٹی تھی۔ کچھ فائنشل پرابلمز کی بنیاد پر اسے جاب کی ضرورت پڑی تو نوید اقبال نے حنان سے کہہ کر اسے رکھ لیا تھا۔

”جی پاپا! کر لیا ہے جوائن اس نے بہت ہی ہارڈ ورکنگ ہے وہ اور کام بھی جلدی سمجھ گئی ہے وہ سب۔“ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو زویا کے ذکر پر وریشہ اٹھ کر چلی گئی حنان نے اس کی اس حرکت کو بہت سنجیدگی سے نوٹ کیا اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”وریشہ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ حنان نے وریشہ کو پلاتے ہوئے کہا جو سونے کی تیاری کرنے میں مصروف تھی۔

”جی کیا کام ہے بولیں.....؟“ وریشہ نے پوچھا۔
”کوئی کام نہیں ہے ادھر بیٹھو بس ذرا۔“ حنان نے وریشہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

”سنو! کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو مجھ سے فقط اس لڑکی کی کال سے کیوں اتنی پریشان ہو گئی ہو مجھے پتا ہے تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو اور میری زندگی میں تمہیں کسی کا بھی اس طرح آنا برا لگا مگر جہاں پیار ہوتا ہے جان! وہاں اعتبار ہوتا ہے وہ لڑکی فقط اک ورکر ہی تو ہے اس نے اگر کسی کام سے رات میں فون کر لیا کل تو اس طرح کیوں بدگمان ہو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں بولو کیا تمہیں ایسا لگتا ہوں میں تمہیں اندازہ بھی ہے تمہارے اس رویے سے میری ذات کے مان کو فخر کو کس

قدر نہیں پہنچی ہے کیوں کیا تم نے ایسا بولو.....؟“ حنان نے وریشہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے رسائی سے کہا تو وریشہ کی آنکھوں میں نمی در آئی اور وہ حنان کے سینے سے جا لگی۔

”بس اب رومت پلیز وریشہ! مجھے تکلیف ہوتی ہے تمہارے آنسوؤں سے ڈر لگتا ہے مجھے کبھی کبھی تمہاری محبت سے جذباتیت سے۔“ حنان نے وریشہ کو چھپ کراتے ہوئے کہا تو اس کے رونے میں اور شدت آ گئی۔

”نہیں حنان پلیز! مجھے معاف کر دیں میں نجانے کیوں ایسا کر دیتی ہوں پلیز آئی لو یو سوچ آپ کو پتا ہے نا میں بچپن سے ہی آپ کے معاملے میں کس قدر پوزیسیو ہوں۔“ وریشہ نے کہا تو حنان نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا دونوں کے من ایک دم پرسکون ہو گئے تھے اور محبت ابر بن کر ان پر برس رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھابی! یہ ڈریس دیکھیں ذرا اچھا لگ رہا ہے ناں لے لوں میں.....؟“ فرح نے وریشہ سے پوچھا جو اس کے ساتھ کافی دیر سے شاپنگ کرنے میں مگن تھی۔

”ہاں لے لو شکر ہے اتنی دیر بعد کچھ تو پسند آیا تمہیں ورنہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خوار کروانے کا ارادہ تھا تمہارا۔“ وریشہ نے شرارت سے کہا تو فرح مسکرا دی وریشہ نے کاؤنٹر پر پے منٹ کی اور دونوں بیگز اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئیں مگر شاپنگ سینٹر سے نکلتے ہی نیچے کیفے ٹیریا میں بیٹھے حنان پر وریشہ کی نظر پڑی اور اس کے ساتھ بیٹھی زویا رحمن کو دیکھ کر وریشہ کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اسے اچھی طرح یاد تھا جب صبح اس نے حنان سے شاپنگ پر جانے کے لئے گھر جلدی آنے کا کہا تھا تو اس نے میٹنگ کا کہہ کر منع کر دیا تھا مگر اب اسے اس طرح زویا کے ساتھ دیکھ کر اسے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا۔

اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آخر کیوں اس کی نظریں ان پر
بڑھ گئیں؟ کاش اس نے نہ دیکھا ہوتا اس کی زرد پڑنی
رنگت دیکھ کر فرح اس کی جانب بڑھی۔

”کیا ہوا بھابی! آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“
فرح نے اس سے شاپنگ بیگ لیتے ہوئے کہا تو وریشہ
نے خود کو سنبھالا۔

”ہاں نہیں کچھ نہیں چلو بس وہ گرمی بھی تو بہت ہے
آج کل اس لئے ذرا چکر سے آرہے ہیں۔“ وریشہ نے
اپنے چہرے کے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا اور کار میں
بیٹھ گئی مگر اس کا دل ابھی بھی حنان میں الجھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆
شاپنگ سے لوٹنے کے بعد بھی وہ مستقل حنان
کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ آخر اس نے جھوٹ
کیوں کہا؟ مگر اس نے حنان پر کچھ بھی ظاہر نہ کرنے کا
تمہیہ کر لیا تھا کہیں پھر اس وجہ سے لڑائی نہ ہو جائے مگر
اس کا دل اس بات کو نظر انداز کرنے پر بھی تیار نہ تھا وہ
اپنی سوچوں میں ہی گم تھی کہ حنان نے اسے پکارا۔

”وریشہ! کہاں گم ہو یا ر! میں کب سے آفس سے
آیا ہوا ہوں اور تمہیں فرصت ہی نہیں کہ ہم غریبوں کو بھی
وقت دو۔“ حنان نے شرارت سے شکوہ کرتے ہوئے
کہا تو وریشہ نے جانچتی نظروں سے حنان کی طرف
دیکھا جو مسکراتا ہوا اسی کو دیکھ رہا تھا وریشہ نے بھی سب
چھپاتے ہوئے خود کو نارمل شو کیا۔

”نہیں وہ بس ذرا تھکن ہو گئی تھی شاپنگ میں آج
بس اس لئے نیچے نہیں آئی آپ فریش ہو جائیں پھر
کھانے کے لئے چلتے ہیں نیچے۔“ وریشہ نے کہا۔

”نہیں کھانا نہیں کھاؤں گا میں آج میٹنگ کے
بعد میں نے ڈنر کر لیا تھا باہر ہی بس چائے پلا دو اچھی
سی۔“ حنان نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”اوکے بنا دیتی ہوں آپ فریش ہو جائیں
جا کے۔“ وریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو حنان فریش
ہونے چلا گیا جبکہ وریشہ کا دماغ ڈنر میں ہی الجھ کے رہ

گیا پہلے زویا کے ساتھ کافی اور اب یہ ڈنر اس کا دل اس
بات کو تسلیم ہی نہیں کر پا رہا تھا اسے ایک عجیب سے ملال
و تاسف نے آگھیرا اور وہ بچن کی جانب چل دی۔

☆.....☆.....☆
”واؤ بھابی! بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ ماشاء
اللہ سے آپ پر پنک کمر بہت سوٹ کرتا ہے۔“ وریشہ کی
چھوٹی نیند حرا نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔
”تھینکس چھوٹی تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو
ماشاء اللہ سے۔“ وریشہ نے پیار سے حرا کے گال
تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”اف..... اگر آپ دونوں کی تعریفوں کا سلسلہ ختم
ہو گیا ہو تو ہم نیچے چلیں سب انتظار کر رہے ہیں جانے
کے لئے۔“ فرح نے انٹری دیتے ہوئے کہا تو دونوں
مسکرا دیں اور نیچے کی جانب چل پڑیں دراصل آج نوید
صاحب کے ایک قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی
جس میں پورے گھر کی شرکت لازمی تھی سو سب ہی
جانے کے لئے تیار تھے ماسوائے حنان کے جو ابھی تک
آفس سے گھر ہی نہیں آیا تھا جبکہ وریشہ کب سے اس کا
انتظار کر رہی تھی۔

”ارے وریشہ بیٹا! حنان کیوں نہیں آیا اب تک
اسے جانا نہیں تھا تو صبح ہی منع کر دیتا کچھ بتایا اس نے
تمہیں.....؟“ نوید صاحب نے وریشہ سے پوچھا۔

”نہیں بابا! صبح تک تو انہوں نے جانے کا کہا تھا
مگر یہ نہیں بتایا کہ کب تک آئیں گے کوئی امپورٹنٹ کام
آگیا ہوگا ورنہ بتا دیتے۔“ وریشہ نے جوابا کہا۔

”اچھا چھوڑو آئے گا تو آجائے گا اس کو تو کام
کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تم لوگ چلو ساتھ۔“ نوید
صاحب نے غصے سے کہا درحقیقت وہ خود حنان کی اس

ہر وقت کام والی عادت سے خائف رہتے تھے اور انہیں
شادی میں بھی وریشہ کا اس طرح اکیلے جانا بالکل اچھا
نہیں لگ رہا تھا مگر جاننا بھی ضروری تھا سو انہوں نے
اس وقت حنان کا انتظار ضروری نہ سمجھا اور چل پڑے

جبکہ وریشہ کا موڈ بھی سخت آف تھا وہ کب سے حنان کا
نمبر ٹرائی کر رہی تھی مگر وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا نجانے کیا
مسئلہ ہو اس کا دل بیٹھے جا رہا تھا۔

شادی میں سب ہی حنان کا پوچھ رہے تھے مگر سب
نے آفس ورک کا بول کر لوگوں کو ٹال دیا مگر وریشہ کا
دھیان کہیں نہیں لگ رہا تھا اسے حنان کی ہی فکر ستائے
جا رہی تھی ابھی ان کی شادی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے
اور اس طرح اکیلے اسے واقعی بہت غصہ آ رہا تھا حرا
فرح عائشہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو اکیلا محسوس
کر رہی تھی اسے اپنے ماما پاپا اس وقت بہت یاد آ رہے
تھے جو اس کی شادی کے بعد عمرے پر چلے گئے تھے ایک
بار اور وریشہ نے حنان کا نمبر ڈائل کیا اب کے کال پہلی
ہی ڈائل پر ریسپونڈ کر لی گئی تھی۔

”ہیلو حنان! کہاں ہو تم ٹھیک تو ہونا سب تمہارا
انتظار کر رہے ہیں بولو نا۔“ وریشہ نے بے تابی سے
سانس لئے بناء سب سوال کر ڈالے۔

”ہیلو میم! وہ سر بڑی ہیں وہ باہر گئے ہیں ذرا۔“
دوسری جانب سے آئی زویا کی آواز نے وریشہ کے
حواس سن کر ڈالے زویا نے کیا کہا اسے کچھ سمجھ نہیں آیا
اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں
زویا کے ساتھ ہے وریشہ نے موبائل بند کر دیا اسے
رونا آ رہا تھا مگر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ
اس وقت رو بھی نہیں سکتی تھی وہاں سے وہ کیسے گھر آئی
کس سے بات ہوئی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا گھر
آ کر اس نے خود کو کمرے میں قید کر لیا اور پھوٹ
پھوٹ کر رو دی اندر واش روم سے پانی گرنے کی آواز
آ رہی تھی اس کا مطلب حنان گھر آ چکا تھا اس کے
رونے میں اور شدت آ گئی۔

”وریشہ! کیا ہو اور کیوں رہی ہو تم اٹھو چلو۔“
حنان جب فریش ہو کر باہر آیا تو وریشہ کو نیچے بیٹھے بری
طرح روتے دیکھ گھبرا گیا اسے اندازہ تو تھا کہ وریشہ
ناراض ہوگی مگر اتنا یہ اس نے نہ سوچا تھا وہ وریشہ کو اٹھا

رہا تھا مگر وریشہ نے بری طرح اس کے ہاتھ جھٹک
دیئے اور چیخ اٹھی۔

”او جسٹ اسٹاپ اٹ اور کتنا ڈرامہ کرنا باقی ہے
تمہارا ہاں بولو مجھے اک بار بتانے کا تادم نہیں ہر وقت کام
کام اور مجھے انتظار کر کے خود کتنے آرام سے اس زویا
کے ساتھ مزے کر رہے تھے بس بہت ہو گیا حنان! بند
کر دیجھے بے وقوف بنانا اس دن اس کے ساتھ کافی اور
ڈنر اور آج یہ سب اب کچھ میں آیا کیوں تمہارا دل آج
کل آفس میں اتنا لگ رہا ہے پہلے تو تم ایسے نہیں تھے مگر
جب سے زویا آئی ہے جب دیکھو آفس آفس کام بھی
اس کے ساتھ کافی بھی اس کے ساتھ کھانا بھی اس کے
ساتھ اتنی پسند ہے وہ تو اسے گھر کیوں نہیں لے
آتے۔“ اس سے پہلے کہ وریشہ کچھ اور بولتی تڑخ
کر کے آواز آئی اور وریشہ اپنا گال سہلاتی رہ گئی۔

”بس ایک لفظ اور نہیں افسوس کہ تم مجھے کبھی سمجھ ہی
نہیں پائیں اور اپنی یہ گھٹیا سوچ اپنے پاس سنبھال کر رکھو
بہت ہی دکھ ہوتا ہے مجھے تمہاری ذہنیت پر اور اپنے
انتخاب پر آج آئندہ مجھ سے بھی بات مت کرنا چلا
جاؤں گا میں یہاں سے کل اور تمہاری زندگی سے بھی
وریشہ کہا تھا ناں اعتبار رکھنا مگر تم نے میرا مان سب ختم
کر دیا اپنا خیال رکھنا۔“ حنان نے غصے سے کہا اور روم
سے باہر نکل گیا جبکہ وریشہ شاک کی سی کیفیت میں بیٹھی
رہ گئی اسے تو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ حنان نے
اس پر ہاتھ اٹھایا اور اس کے الفاظ کیا کہہ گیا تھا وہ وریشہ
پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

☆.....☆.....☆
حنان چلا گیا آخر کیوں یہ وہ سوال تھا جو سب گھر
والوں کے دل و دماغ پر حاوی تھا اور وریشہ وہ تو ابھی
تک شاک کی سی کیفیت میں تھی اس نے اپنا بزنس چھوڑ
کے لیسیا میں جا ب کر لی تھی نوید صاحب کو اس نے کیا
کہا عائشہ کو کیا کہا وریشہ کو کچھ نہیں معلوم تھا خبر تھی تو
صرف اتنی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا آخر صفائی تو دیتا

شازیہ مصطفیٰ عمران

قسط نمبر 15

سلسلے وار ناول

کبھی عین دیکھو دیکھو



”کیا بات ہے میرا بیٹا! کچھ پریشان ہے ادھر آؤ۔“ انہوں نے اسے اپنے قریب بلایا، اریشماء لب کچلتی ہوئی ان کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی، روجیل سکندر نے اس کا سراپے شانے سے لگالیا۔ مسز روجیل بھی اندر آ گئی تھیں، انہیں یہ ڈر ہو رہا تھا اریشماء ان سے انکار کرنے تو نہیں آئی ہے۔

”ہاں اب بولو کیا بات ہے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
اریشماء الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہاں سے وہ بات شروع کرے؟ کس طرح ڈیڈی کو بولے۔

”اریشماء گڑیا! بولو کیا بات ہے؟“ انہوں نے اسے کچھ ریلیکس کیا۔
”ڈیڈی! میں آپ سے کچھ بولوں تو آپ میری اتنی بات تو مانیں گے۔“ وہ قدرے توقف کے بعد رک رک کر گویا ہوئی۔

”ہاں بولو کون سی ایسی بات ہے جو میری اتنی پُر اعتمادی بیٹی کو بولنے میں اتنی جھجک آ رہی ہے۔“ انہوں نے فریش سے لہجے میں اس کے ہاتھوں کو دبایا۔
”ڈیڈی! میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ کوئی ایسی بات ہے جو میں نہیں مانوں گا، گڈیہ تو آپ نے بہت اچھا سوچا آگے اسٹڈی کرنے کا اور یہ تو آپ اپنی شادی کے بعد بھی کر سکتی ہیں۔“ وہ خوش ہو کر گویا ہوئے۔

”نہیں ڈیڈی! میں شادی سے پہلے پوری کروں گی، کیونکہ بعد میں اسٹڈی کرنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدہ سے لہجے میں ان سے مخاطب تھی، روجیل سکندر بھی سمجھتے تھے وہ کیوں ایسا کر رہی ہے، شادی سے بچنے کے لئے اس نے اسٹڈی کا ذکر نکالا ہے۔

”بیٹا! آپ کی شادی میں نے نیکسٹ ایئر رکھی ہے۔“
”ایسا آپ بالکل نہیں سوچتے؟ میں نے آپ کی بات مانی ہے آپ میری اتنی تو مان ہی سکتے ہیں۔“

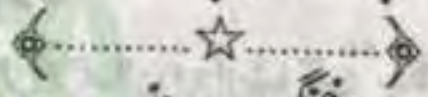
”مجھے کامران سے اور شاہدہ سے بات کرنی پڑے گی۔“ وہ جیسے گہری سوچ میں پڑ گئے تھے اور وہ جانتے تھے اریشماء ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کرنا چاہتی تھی، وہ آفس میں لگ گئی تو اپنی پڑھائی بھی ادھوری چھوڑ دی تھی اور یہ کورس چار سال کا تھا اور اتنے سال رکنار روجیل سکندر کو فلور پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

”ڈیڈی! کیوں ان سے بات کریں؟ ابھی سارے اختیارات آپ رکھتے ہیں چاچو اور چاچی سے تو پوچھنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ وہ سن کے بھنا گئی، غصہ بھی آنے لگا، اس کی زندگی کیا اس کی نہیں رہی، سارے اختیارات چاچو چاچی کو کیوں حاصل ہونے لگے۔

”پھر بھی بات کرنی ہے کل آپ کی منگنی ہے اور میں ابھی ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا کہ رشتے میں فرق آئے۔“ لہجہ ان کا درشت اور سخت ہو گیا۔ مسز روجیل پہلو بدل کر رہ گئیں، روجیل سکندر کی تنقیدی نگاہ ان پر بھی اٹھی تھی، جانے کیوں انہیں ایسا لگ رہا تھا اریشماء کو اس نے والی وہی ہیں۔

”ڈیڈی! میں شادی سے انکار نہیں کروں گی مگر مجھے سنبھلنے کے لئے کچھ تو وقت دیں، ہو سکتا ہے میں کچھ عرصے میں ہی سنبھل جاؤں اور آپ کو پھر اختیار ہے میری شادی فوراً کر دیجیے گا مجھے اعتراض نہیں ہوگا مگر پلیز میں آپ سے صرف یہی تو کہہ رہی ہوں مجھے پڑھنا ہے۔“ لہجہ اتنا بھیگا ہوا تھا وہ اس کی جانب دیکھ کر کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے ان کی وہ کل کائنات تھی اس پر تو وہ اپنی جان تک لٹا سکتے تھے مگر وہ اسے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنے دینا چاہتے تھے جو بعد میں نقصان دہ ہو۔

اگر حمدان کا مستقبل بہتر نظر آتا تو وہ اس سے رشتہ کرنے میں عار نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کی بیٹی آسائشوں میں پروان چڑھی تھی وہ کیسے چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی تھی؟ وہ اسے اس کے شاہانہ مزاج جیسا ہی گھرانہ دینا چاہتے تھے جہاں اسے اپنی ضروریات کے لئے اپنا دل نہیں مارنا پڑے، وہ باپ تھے وہ بھی اس کا برا نہیں سوچ رہے تھے۔



”آپ مجھے بھی نہیں بلائیں گی؟“ عدین نے منگنی اور ناراضی سے اس سے شکوہ کیا۔

حمدان کے کان عدین کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے، وہ سمجھ گیا تھا اریشماء ہے، ضرور اپنی منگنی کا بتا رہی ہوگی جبکہ اس نے گھر میں ابھی تک بھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور پھر وہ کس دل سے بتاتا، جب دل کی بستی میں دیر لگی چھائی ہوئی تھی وہ کل کسی اور کی ہونے جا رہی تھی، کیسے اریشماء اس کے آگے گڑ گڑائی تھی اور وہ دل پر پتھر رکھ کر سرد مہری سے آگے بڑھ گیا تھا، اسے بھی اگر کوئی لڑکی پسند آئی تھی تو ایسی جس سے اس کا ملاپ ہی مشکل تھا۔

”دیکھئے اریشماء باجی! میں آپ کو اپنی سگی بہن ہی سمجھتا ہوں اور آپ اپنے گے بھائی کو ایسے کیسے بھول سکتی ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں غصہ کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے پھر مجھ سے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ عدین نے موبائل آف کر دیا، اس کا چہرہ تپا ہوا تھا۔

حمدان کو اندازہ تھا وہ اسے بھی نہیں بلارہی ہے جب ہی عدین کو اتنا غصہ آ گیا ہے۔

”آپ اپنی اکڑ میں رہے گا، وہ پتہ نہیں کیا کیا کر رہی ہیں۔“ حمدان اس کے سر پر ہینچ کے غصہ نکالنے لگا۔
”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ وہ برہم ہوا، چوتون تیکھے کر کے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی بات خاک بھی پلے نہیں پڑی ہو۔

”بھائی! میں اریشماء باجی کی بات کر رہا ہوں، وہ منگنی کر رہی ہیں وہ بھی زبردستی کی، آپ جانتے ہیں وہ آپ کو لائک کرتی ہیں۔“

”عدین! اگر تمہاری یہ بکواس بند نہیں ہوئی تو میں رکھ کر چھاپڑ لگاؤں گا۔“ اس نے وارننگ دی، وہ تو شکر تھا اس وقت امی اور مصباح گھر پر نہیں تھیں، وہ نیچے والوں کے گئی ہوئی تھیں کسی کی عیادت کو، حمدان آفس سے جلدی آ گیا تھا اور عدین نو بجے گھر میں گھسا تھا۔

”بھائی! آپ کو ذرا بھی ان پر رحم نہیں آ رہا۔“ عدین تو خود افسردہ ہو رہا تھا، اریشماء جتنی دیر اس سے باتیں کرتی رہی روتی رہی تھی، مگر آج اسے اپنے بھائی کی بے حسی پر بھی رونا آ رہا تھا۔

”میں جو بہتر سمجھتا ہوں وہ کرتا ہوں اور تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو کہ ایسی باتیں کرو، اپنی پڑھائی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیا کرو سمجھئے۔“ وہ ڈانٹ کے اندر چلا گیا۔

حمدان کا سر دھکنے لگا تھا، وہ سوچ رہا تھا یہ جاب ہی چھوڑ دے گا تا کہ اریشماء اسے بھول جائے، وہ جتنا اس کے سامنے رہے گا اسے غصہ ہی رہے گا اور تیمور بھی کون سا یہ سب برداشت کرے گا۔

”حمدان احمد! تم اسے بھول جاؤ گے، وہ تمہیں نظر نہیں آئے گی تم پھر کیا کرو گے؟“ اندر سے کوئی چیخ رہا تھا، وہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا، کھڑکی کے پردے ہٹا دیے باہر کے منظر پر نگاہ جمادی۔

وہ نازک کامنٹی سی کالج کی گڑیا اتنی پُر اعتمادی ساری لڑکیوں سے اس کی ادا الگ تھی، اس کا دیکھنا بات کرنا ہنسنا سب کتنا منفرد تھا، وہ ناچا رہے ہوئے بھی اس سے نگاہ نہیں چرا سکا تھا، کبھی سوچا ہی نہیں تھا یوں اچانک سے کوئی اتنا

اچھا بھی لگ سکتا ہے اسے سوچنا ہر وقت خیالوں میں رکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔
 ”اریشماء! میں بھی تمہیں شدتوں سے چاہنے لگا ہوں میرے دل پر بھی تو قیامت گزر رہی ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے ہمکلام تھا۔

”اگر میرے جسم و جاں کے مالک ہیں تو حمدان وہ آپ ہیں۔“ کانوں میں اریشماء کے الفاظ گونجنے لگے اس دن جب کال آئی تھی کتنی اداس اور غمزدہ سی ہو رہی تھی اور وہ اسے ہرٹ کیے جا رہا تھا۔
 ”اریشماء! کیسے تم رہو گی بعد میں تیمور سے تمہاری ایک لمحے کو نہیں بنتی ہے اور ساری زندگی کیسے گزرے گی۔“ اسے یہ بھی فکر اور پریشانی تھی تیمور سے اس کی دو بدولٹائی ہوئی رہتی تھی جبکہ حمدان بھی اریشماء کو کئی دفعہ ہرٹ کر چکا تھا مگر وہ اس سے کبھی نہیں لڑی تھی بلکہ افسردہ ہی نظر آتی تھی۔

”اف..... تو بہ بڑی مشکل سے آنے دیا ہے۔“ امی کی آواز پر وہ چونکا تھا۔

”مصباح کھانا لگا لو عدین بھی آ گیا ہے۔“

”جی اچھا امی۔“ مصباح کچن میں چلی گئی تھی حمدان بھی روم سے نکل آیا تھا۔

”عدین عدین.....“ امی نے اسے آوازیں دی تھیں مگر وہ ایسے بنا ہوا تھا جیسے آواز ہی نہیں جا رہی ہو۔

حمدان نے امی کے ریم میں جھانکا وہ میز پر تکیہ رکھے ہوئے لیٹا تھا۔

”عدین! تمہیں سنائی نہیں دے رہا ہے امی کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ہنوز لیٹے ہوئے جواب دیا۔

”یہ بچوں کی طرح حرکتیں کم کیا کرو بڑے ہو گئے ہو اٹھو چل کے کھانا کھاؤ۔“ اس نے تکیہ میز پر سے ہٹا کے سائیڈ پر رکھا۔

”جب کہہ دیا نہیں کھانا تو نہیں کھانا“ آپ کیا چاہتے ہیں ہر کوئی آپ کی مرضی سے ہر کام کرے۔“ وہ تو تنک کر رہ گیا۔ حمدان ہکا بکا سا اس کی بات پر رہ گیا وہ اس سے کتنی ترشی سے مخاطب ہو رہا تھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو بچ ہے وہ کہہ رہا ہوں ابھی تو آپ کو سمجھ نہیں آ رہی ہے مگر بعد میں احساس ہو گا سب آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور آپ جواب میں کیا کرتے ہیں صرف دل توڑتے ہیں دل دکھاتے ہیں۔“ اسے تو اریشماء کا خیال بار بار آ رہا تھا جس نے اپنے دل کی تمام باتیں اسے بتائی ہوئی تھیں اسے

اریشماء اپنے بھائی کے لحاظ سے بہت پسند بھی کتنا اپنائیت اور محبت و پیار سے بھرا ہوا اس کا انداز تھا مغروریت کا نشانہ تک نہیں تھا۔

”ان فضول اور بے کار باتوں کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔“ چہرہ اس کا سپاٹ تھا۔

”بھائی جواب آپ کے دل میں موجود ہے مگر زبان پر لاتے ہوئے ڈرتے ہیں آپ حقیقت سے کیوں نگاہ چرا رہے ہیں۔“ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا آواز اس نے دھیمی رکھی ہوئی تھی تا کہ امی اور مصباح تک نہیں پہنچ جائے۔

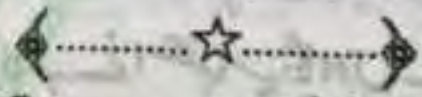
”حقیقت سے تم نے بھی نگاہ چرا لی ہوئی ہے دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جب سے تمہاری اریشماء سے دوستی ہوئی ہے وہی تمہارے دماغ میں یہ سب بھر رہی ہے۔“ وہ اسے ڈانٹنے لگا۔

”وہ مجھے کچھ نہیں کہتی ہیں مجھے بھی اندازہ ہے۔“

”میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کھانا کھانے آ جاؤ اور میں یہ نہیں چاہتا اریشماء کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول خراب ہو فوراً آؤ۔“ وہ حکمیہ لہجے میں اسے کہہ کر روم سے نکل گیا۔

عدین دانت پیس کے تکیہ پر کے برسانے لگا حمدان سے وہ نہیں جیت سکتا تھا اس کا اندازہ اسے اچھی طرح ہو گیا تھا اس کے دل و دماغ میں کیا تھا یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ مگر عدین کو ملال اور دکھ تھا اریشماء کی منگنی کی اور سے ہو رہی تھی وہ تو اسے اپنے بھائی کے حوالے سے دیکھنے لگا تھا مگر اریشماء کی حوصلہ افزائی کبھی نہیں کی اور نہ ہی امید بندھائی تھی۔

”بھائی! مجھے ایسے معجزہ کا انتظار ہے کسی طرح اریشماء باجی سے آپ کی شادی ہو جائے پھر میں تب آپ سے پوچھوں گا“ معجزے بھی تو اللہ ہی کرتا ہے اگر اریشماء باجی کے جذبے سے جے ہیں تو وہ کہیں نہیں جاسکتی ہیں۔“ وہ آئینے میں دیکھ کر بالوں میں برش کرنے لگا“ موڈ اس کا اب سیٹ ہو گیا تھا کھانا اگر نہیں کھائے گا تو حمدان پھر اس کی خبر لینے آ جائے گا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا امی کو بھی اس معاملے کی خبر ہو۔



آج وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی لیل ماہ کو شہران کا خوف رات دن سوار تھا ایک دن گزر گیا تھا اس نے تین دن کا ناٹم دیا تھا اسی وجہ سے یونیورسٹی نہیں گئی تھی اگر پھر راستہ روک کے کھڑا ہو گیا تو اسے یہ تو نظر آ گیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ نڈر اور بے باک انسان تھا اس سے ہر طرح کی حرکت کی امید بھی وہ کس حد تک جاسکتا ہے اسے اندازہ تھا اس نے اس کے باپ سے جو بیرباندہ لیا تھا اور اگر اس کے باپ کی اس محلے میں اس کی وجہ سے رسوائی ہو گئی تو پہلے ہی بے عزتی کب بھولے تھے حرما کو کس طرح ابو نے رخصت کیا تھا صفائی میں کچھ نہیں سنا تھا بے چاری حرما بے خبری میں ماری گئی تھی اور ان کا دیور شہران اب اس کے ارادے کتنے خطرناک تھے حرما کو بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ حرما کو دیکھ کر ہی پتہ چل گیا تھا اس نے اپنے بڑے پن کا رعب شہران پر رکھا ہوا ہے اگر اس نے لیل ماہ کی کوئی بات پوچھ بھی لی تو وہ تو ہنگامہ کرنے اس کے گھر تک آ سکتا ہے۔

”کیا کروں کس سے کہوں ابو کو اور باز بھائی کو خبر ہو گئی تو میں تو منہ دکھانے کی نہیں رہوں گی۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں ناخن کترنے لگی تھی۔

”پچھو! کتنی گندی ہیں ناخن کھا رہی ہیں۔“ دعا روم میں آئی تو اسے یوں سوچ میں مستغرق دیکھا تو ٹوکے بنا نہیں رہ سکی لیل ماہ خفیف سی ہو گئی ہاتھ نیچے کر لیا۔

”پچھو! لائے آئی بلار ہی نہیں دادی جان نے کہلوا دیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اپنی کاپیاں اور کتابیں اٹھا کے جانے لگی۔

وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی لائے اسے ایک سہارا نظر آئی اس سے تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہے مگر اس کے گھر تک جانے کی اجازت نہیں تھی مشکل سے ہی امی مانتی تھیں اگر وہ لائے کو یہاں بلاتی ہے تو بھابی پورا وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی ہیں لیل ماہ کو بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

”کیا کروں کیسے جاؤں؟“ کاسنی آچل شانوں پر برابر کیا امی کے پاس آ گئی۔

”لیل ماہ! وہ لائے بلار ہی تھی جاؤ چلی جاؤ۔“ وہ حیران رہ گئی امی اور اسے خود کہہ رہی ہیں جاؤ چلی جاؤ یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔

”خیریت تو ہے؟“ حیرانگی ظاہر کی۔

”پتہ نہیں تم پوچھ آؤ دو تین دفعہ کہلوا چکی ہے تمہیں اور ہاں جلدی آ جانا کہیں تمہارے ابو نہ آ جائیں۔“ انہوں نے ساتھ ہی ہدایت بھی کی وہ سر ہلاتی ہوئی سر پر آچل قرینے سے اوڑھ کے باہر نکل آئی پہلے اطراف میں نگاہ

دوڑانی شہر ان تو کہیں نہیں ہے، کہیں ڈرانے دھمکانے آجائے۔

”شکر ہے آئی تو“۔ لائبہ ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔

بسمہ نے چونک کر لیل ماہ کو ضرور دیکھا، لیل ماہ کی بھی نگاہ اس پر اٹھ گئی وہ پزل سی ہو گئی۔

”حتا سے بولتی ہوں وہ بچوں کو دیکھ لے گی ہم دونوں ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں“۔ لائبہ بچوں کے سامنے گفتگو کرنے سے گریز کرتی تھی کیونکہ سارے بچے پھر گفتگو پر کان لگاتے تھے۔

”یونیورسٹی کیوں نہیں آئی تھیں؟“

”کیسے آتی اتنی بڑی ٹینشن میں ہوں“۔ لیل ماہ صوفے پر بیٹھی، شکر تھا آج اسے لائبہ سے بات کرنے کا موقع تو مل گیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا خیریت، کیسی ٹینشن؟“ لائبہ نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

لیل ماہ نے جواب میں اپنی ساری ٹینشن جو شہر ان سے متعلق تھی اس کے گوش گزار کر دی۔

”لیل ماہ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“ وہ بھی سنائے میں آ گئی۔

”میری رات دن کا سکون تباہ ہو گیا ہے ہر وقت اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں“۔ لیل ماہ نے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔

”حرم ماجی سے بول یا ذیشان بھائی سے“۔

”آپنی سے بالکل بھی نہیں اور ذیشان بھائی ان سے بھی نہیں، تمہیں نہیں پتہ لائبہ اس پر تو جیسے ضد سوار ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے“۔ وہ روہانی ہو رہی تھی۔

”اگر اس نے زبردستی تیری انگلی میں انگلی پھنسا دی تو کیا پہن لے گی؟“

”منہ تو زردوں اگر میرا تو بس چلے مگر لائبہ وہ بہت وحشی ہے مجھے اس نے بہت دفعہ بے دردی سے پکڑا ہے“۔ وہ جب بھی بازو کی تکلیف سوچتی درد کا احساس ہونے لگتا، شہر ان بے حس تھا اسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی اس سے ہر بات کی توقع تھی۔

”پتہ ہے مجھے جیسی تو طرم خان بنتی ہے اندر سے اتنی ہی کمزور ہے، مجھے تو شہر ان بھائی پر حیرانگی ہو رہی ہے وہ اور ایسی حرکت جبکہ وہ مجھ سے جب بھی ملتے ہیں بہتا کر کے بات کرتے ہیں وہ کسی اور لڑکی کی کیسے بے عزتی کر سکتے ہیں“۔ لائبہ کو یقین نہیں آ رہا تھا پھر جب بھی وہ شہر ان کے گھر گئی کبھی کوئی ایسی حرکت بھی نہیں دیکھی جس سے لگتا شہر ان اچھی نیچر کا نہیں ہے۔

”تمہیں اتنا سب کچھ بتا دیا ہے پھر بھی یقین نہیں ہے“۔ لیل ماہ کو غصہ آیا۔

”میں ایسا کب کہہ رہی ہوں کہ تم بھی اب جھوٹ نہیں بول رہی ہو مجھے یقین ہے“۔ اس نے لیل ماہ کو ٹھنڈا کیا۔

”میں کیا کروں سمجھ نہیں آ رہا ہے کہتا ہے شادی میری تم سے ہی ہوگی“۔

”کیوں تم لوگوں کے وہ پیچھے پڑ گئے ہیں میں ان سے بات کروں“۔

”بالکل ہو گئی ہو بالکل نہیں کرنا ورنہ وہ لٹے دماغ کا ہے اگر کچھ الٹی سیدھی ہو اس کردی تو میں تو پھر ماری جاؤں گی“۔ وہ گھبرا گئی اسے شہر ان کے ہر قدم سے ڈر و خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”لڑکی ہونا بھی گناہ ہے“۔ وہ بڑبڑائی۔

”اور ہو خوبصورت تو اور زیادہ گناہ جیسے تم ہو ہو سکتا ہے شہر ان بھائی کو تم سے سچ میں پیار ہو گیا ہو“۔

”لائبہ! فضول ہانکنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مزے سوجھ رہے ہیں“۔

لیل ماہ کے توپختے لگ گئے وہ ایسی بات تو مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”سوری سوری“۔ لائبہ نے لب بھینچ لئے۔

”اچھا اپنا موڈ ٹھیک کر کچھ تو اس مسئلے کا حل سوچتا ہے میں تیرے لئے چائے کے ساتھ پیئس لاتی ہوں“۔

”نہیں میں اب چلوں گی ابو آ جائیں گے“۔ لیل ماہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

”ابھی مغرب نہیں ہوئی ہے تاہم ہے انکل مغرب کے بعد کیا عشاء پڑھ کر آتے ہیں“۔ لائبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے واپس صوفے پر گرا دیا۔

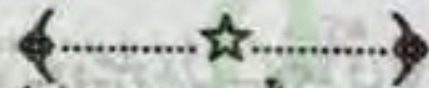
”نہیں لائبہ! وہ بھائی امی سے بار بار پوچھتی رہیں گی آپنی کی شادی کے بعد تو میں بھی بہت محتاط ہو گئی ہوں کیونکہ وہ مجھ پر بہت نظر رکھنے لگیں ہیں“۔

”ہاں مجھے پتہ ہے تمہاری بھابی کا تعلق اٹلی جنس سے ہے“۔ لائبہ نے بات مذاق میں اڑا کے افسردہ موڈ کو فریض کرنے کے لئے کہا۔

”تو بیٹھ میں دو منٹ میں آئی امی سے کہہ دوں گی چائے وہ بنا دیں گی“۔ وہ لیل ماہ کو سکرا کے دیکھتی ہوئی نکل گئی۔

لیل ماہ سائیڈ ٹیبل سے میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی، جانے کی جلدی کی وجہ سے ڈرائنگ روم میں بھی دل نہیں لگا۔

”آئی صرف چائے پیوں گی پیئس کھانے کا موڈ نہیں“۔ وہ کچن میں ہی آ گئی، آئی اس سے خیر خیریت پوچھنے لگی تھیں، لائبہ ٹیوشن کے بچوں کو دیکھنے چلی گئی تھی۔



شہر کا مہنگا ترین ہوٹل بک کروایا تھا، وہاں سارا ارجمٹ تھا، روجیل سکندر نے خاص خاص بڑے بڑے لوگوں کو بھی مدعو کیا تھا، مگر ایشیاء نے اپنی کسی فرینڈ کو نہیں بلایا تھا، زویا، عدین، کتنا ناراض ہوئے تھے مگر جب وہی اس منگنی سے خوش نہیں تھی تو وہ انہیں کیوں بلاتی۔

خوبصورت کلیوں کے فراک کو تو اس نے استری سے جان کے جلا دیا تھا، یہ بھی وہ انڈین ڈراموں میں اس نے ایک دن دیکھ لیا تھا، اس نے بھی وہی کیا تا کہ پہننا نہ پڑے اپنی مرضی سے بلیو گولڈن کڑھائی کا ریڈی میڈ ٹراؤزر کے ساتھ ڈریس پہن لیا تھا، جیولری اس نے یہ کہہ کر منع کر دی کہ اسے عادت نہیں ہے، چاچی تو اپنا سامنہ لے کر رہ گئی تھیں اور تیمور اس کی ان حرکتوں کو خوب سمجھ رہا تھا۔

ایکجہرا سے اور تیمور کو ساتھ بٹھا دیا گیا تھا، ممی اور ڈیڈی اس کے آس پاس تھے، ایشیاء سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں موجود تھی چہرے پر اس کے کوئی خوشی نہیں تھی۔

ہوٹل کے ہال کو خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا، اسٹیج پر اصلی پھولوں کی ایسا لگتا تھا بہار آئی ہوئی ہے۔

”بھائی صاحب! اجازت ہے تیمور انگوشی پہنا دے؟“ چاچی اپنی سلک کی کاہدار پر پل ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی جھلملا رہی تھیں، کامران چاچو اتنے خوش تھے جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ تیمور کی نگاہوں میں فتح مندی تھی وہ بلیک ڈن

سوٹ میں اکڑ کے بیٹھا تھا، روجیل سکندر کی اجازت ملتے ہی اس نے استحقاق سے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا، ایشیاء اور

لکھے کڑے ضبط سے گزر رہی تھی، تیمور نے ہیرے کی جگمگاتی انگوشی اس کی خروٹی انگلی میں پہنا دی تھی فوراً ہی ہاتھ

دل کا رشتہ اور عہد

”عشال! ایسے کیوں لیٹی ہو.....؟“ شایان لائٹ بھی آف تھی۔
کمرے میں داخل ہوا تو عشال آنکھ بند کئے لیٹی تھی اور ”کچھ نہیں ویسے ہی“۔ عشال نے کہا اور آنکھیں



”مجھے اپنی دوستوں کی یاد آرہی ہے“۔ عشال نے کہا۔
”بس اتنی سی بات تو چلو کوئی بات نہیں تم بات کرلو ان سے“۔ شایان نے کہا۔
”کاش ایسا ہو پاتا“۔ عشال نے سوچا۔
”کرونا کیا ہوا اچھا چھوڑو میں خود ہی ڈائل کرتا ہوں“ کیا نام ہے بسمہ ہے ناں ایک منٹ“۔ خود ہی بولتے ہوئے اس نے نمبر بھی ڈائل کرنا شروع کر دیا۔
”نہیں شایان! رکیں وہ سو گئی ہوگی اب تک“۔
عشال نے فٹ سے موبائل لیا۔



”او کے چلو کوئی بات نہیں کل کر لینا“۔ شایان نے کہا۔

”اچھا ایک کام کرو ایک کپ اچھی سی چائے پلا دو اچھی بیوی ہونے کا فرض ادا کرو“۔

”اچھا ابھی لائی“۔ عشال نے کہا اور چائے بنانے چل دی پیچھے شایان کو سوچوں میں ڈال گئی۔

”ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہے جس کا عشال کو دکھ ہے اکثر اس بات پر روتی ہے کہ فرینڈ کی یاد آرہی ہے پھر بات بھی نہیں کرتی“ پتہ نہیں بہر حال کیا پتہ خود ہی بتا دے“۔ شایان نے سوچا اور بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆

”نہیں یہ میری پلیٹ ہے بھائی واپس دیں بھئی“۔ ثومیہ نے چلاتے ہوئے کہا اس وقت تینوں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

”اچھا تو تم اپنے بھائی کے لئے دوبارہ بنا نہیں سکتی کیا ظالم لڑکی“۔ شایان نے بھی پلیٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

”لے لیں مجھے نہیں چاہئے“۔ ثومیہ نے ناراضی سے کہا اور پلیٹ چھوڑ دی۔

”اچھا میری گڑیا! سوری سوری پلیز بہنا معاف کر دو مذاق کر رہا ہوں میں“۔ شایان نے جھٹ پلیٹ واپس کرنا چاہی۔

”یہ ہوئی نابات“۔ ثومیہ نے ہنستے ہوئے کہا اور جلدی سے پلیٹ پکڑ لی۔

”اوہ..... یو چیئر گندی بچی میں سمجھا تم سچ سچ ناراض ہو گئی ہو جاؤ بات مت کرنا اب“۔ شایان نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے حساب بے باق کیا۔

”سوری بھائی! پلیز سوری نا یہ لے لیں پلیٹ میں دوبارہ اپنے لئے نکال لوں گی“۔ ثومیہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ ہوئی نابات“۔ شایان نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

”چلو آج کھانا اپنی گڑیا کو میں کھلاتا ہوں“۔

شایان نے پیار بھرے لہجے میں کہا ”عشال آج چپ چپ بھی وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی شایان کا یہ انداز دیکھ کر اسے بھی اپنے بھائی کی یاد آ گئی اسے ثومیہ کی جگہ خود اور شایان کی جگہ بھائی نظر آ رہے تھے اور اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے شایان نے ثومیہ کو کھانا کھلاتے ہوئے سرسری طور پر عشال کو دیکھا تو ٹھیک گیا وہ شایان اور ثومیہ کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ شایان اسے دیکھ رہا ہے کھانا ختم کرنے کے بعد شایان ٹیبل پر آ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

”شایان“ ثومیہ اور ندیا آپنی تین بھائی بہن تھیں ندیا شادی شدہ تھی شایان جب 22 سال کا ہوا تو اچانک ہی ایک حادثے میں ان کے والدین کا انتقال ہو گیا ندیا کی شادی والدین کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی اب ثومیہ صرف اور صرف اس کی ذمہ داری تھی والدین کے انتقال کے وقت ثومیہ صرف 8 سال کی تھی ثومیہ کی زندگی میں شایان باپ اور بھائی دونوں کا درجہ رکھتا تھا۔

شایان ٹیبل پر کھڑا سوچ رہا تھا وہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ عشال کو کوئی دکھ ہے بات نہ جانے کیا تھی وہ یہ نہیں جانتا تھا ان کی شادی کو 4 ماہ ہو گئے تھے اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ شایان سے باتوں میں عشال نے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنی بڑی آبی مشال سے ہر بات ڈسکس کرتی تھی شایان کو اپنی مشکل حل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور اس نے مشال آپنی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گیا رات کو وہ جب کمرے میں آیا تو عشال روم میں نہیں تھی وہ آ کے بیڈ پر لیٹ گیا تھوڑی دیر گزری تھی کہ عشال روم میں داخل ہوئی ہاتھ میں موبائل اور کان میں واٹر لگا ہوا تھا شایان نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔

”کیا سن رہی ہو.....؟“

”ریڈیو سن رہی ہوں“ ریحان اسدی کا شو چل رہا ہے بہت زبردست شو ہے آپ سنیں گے؟“ عشال نے پوچھا۔

”جی نہیں تم بھی فی الحال مت سنو کچھ ٹائم مجھے بھی دے دیا کرو“۔ شایان نے شکوہ کننا نظروں سے دیکھا تو عشال نے ایک اچھی بیوی ہونے کا اعلیٰ مظاہرہ کیا اور موبائل اٹھا کر رکھ دیا۔

”لیس اب خوش رکھ دیا آپ کیا کر رہے تھے ویسے“۔ عشال نے ہینڈ فری رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا انتظار ظاہر ہے بیوی تو مجھے تم دیکھنے نہیں دیتیں اکیلے کہ کہیں تمہاری غیر موجودگی میں کوئی لڑکی میرے دل پر قبضہ نہ کر لے“۔ شایان نے اس کو جلاتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی جیسے آپ تو ہر وقت میری بات مانتے ہیں نا“۔ عشال نے بھی بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں؟ نہیں مانتا کیا ایمان داری سے بتاؤ.....؟“ شایان نے پوچھا۔

”اچھا! مانتے ہیں نا تو پھر ٹھیک ہے کل میں اور ثومیہ ندیا آپنی کے گھر جا رہے ہیں شام 6 بجے تک آپ ہمیں لینے آ جائے گا ویسے بھی ندیا آپنی کافی دنوں سے کہہ رہی تھیں آنے کا“۔ عشال نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں جو حکم سرکار عظام حاضر ہے“۔ شایان نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

”ٹیلیس اب سونے کی تیاری پکڑیں صبح اٹھنا ہوگا جلدی مجھے پھر“۔ عشال نے لائٹ آف کی۔

”اچھا اب تک ریحان بھائی کا پروگرام سن رہی ہیں تب خیال نہیں آیا تھا میں نہیں بولتا تو میڈم نے 12 بجے تک پورا شو ختم کرنا تھا“۔ شایان نے کہا تو مشال ہنس پڑی۔

”ہاں تو جانے کا یاد مجھے ابھی آیا ہے اس لئے“۔ مشال نے کہا تو شایان کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔

”چلو یہ سچ ہے کل یہ لوگ ندیا آپنی کے گھر جائیں

گی تو میں جلدی آفس سے نکل کر مشال آپنی کے گھر بھی ہواؤں گا“۔

☆.....☆

اگلے دن آفس سے وہ 3 بجے ہی نکل گیا اور 4 بجے تک مشال آپنی کے گھر پہنچ گیا گیٹ ٹاک کرنے پر تانیہ نے کھولا تھا۔

”ارے شایان انکل! آپ آئیے نا“۔ تانیہ نے آگے سے ہنستے ہوئے کہا۔

”آئیں ماما کچن میں ہیں“۔ تانیہ نے کہا اور بلانے چلی گئی۔

”ماما! شایان انکل آئے ہیں آپ جائیں اندر باقی کام میں دیکھ لوں گی“۔ تانیہ نے آپنی سے یعنی اپنی ماما سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے یہ کچن صاف کر دو پھر آتے ہوئے چائے کے ساتھ کباب فرائی کر لینا اور نمکو وغیرہ لے آنا“۔ مشال آپنی اس کو ہدایات دے کر خود ہاتھ صاف کرتے ہوئے کمرے میں آ گئیں۔

”السلام علیکم“۔ شایان نے ان کو دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! عشال کو کیوں نہیں لائے تم نکلے.....؟“۔ مشال آپنی نے پوچھا۔

”وہ ندیا آپنی کے گھر گئی ہے ثومیہ کے ساتھ“۔ شایان نے کہا۔

”اور کیسے ہو تم باقی سب کیسے ہیں گھر میں.....؟“۔ آپنی نے پوچھا۔

”الحمد للہ سب ٹھیک ہیں مجھے آپ سے کچھ ضروری کام تھا اس لئے میں اکیلے آ گیا“۔ شایان نے کہا۔

”مجھ سے ضروری کام تھا شکر خدا کالوگوں کو مجھ سے بھی ضروری کام پڑتے ہیں تو نے اتنی تو عزت دی ہے مجھے اچھا کہو کیا کام تھا بولو“۔ مشال آپنی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں تو جانے کا یاد مجھے ابھی آیا ہے اس لئے“۔ مشال نے کہا تو شایان کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔

”چلو یہ سچ ہے کل یہ لوگ ندیا آپنی کے گھر جائیں

”وہ مجھے آپ سے عشال کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔“ شایان نے سنجیدہ لہجے میں بات کا آغاز کیا اس کے سنجیدہ لہجے کو دیکھتے ہوئے آپنی کو خطرے کا احساس ہوا۔

”ہاں پوچھو کیا پوچھنا ہے۔“ انہوں نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہماری شادی کو 4 ماہ ہو گئے ہیں عشال نہایت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے پر ان 4 ماہ کے درمیان میں نے عشال کو کئی بار روتے ہوئے دیکھا ہے کبھی کبھی وہ اپنے دکھ میں اس قدر کھوئی ہوتی ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اس نے مجھے ایک دفعہ بتایا تھا کہ آپ سے وہ ہر بات ڈسکس کرتی تھی تو پلیز اگر آپ اپنی بہن کو اس کے دکھ کے مدار سے نکالنا چاہتی ہیں تو آپ مجھے بتائیں کہ ایسی کیا بات ہے جس کا وہ اتنا اثر لے رہی ہے اور مجھے یقین ہے آپ وہ بات جانتی ہیں اور میری ضرورت مدد کریں گی۔“ شایان نے اپنی بات کے اختتام میں آپنی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

عشال آپنی شایان کی بات پر کچھ لمحے تک تو کچھ نہ بولیں پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔

”شایان! میں بھی اب تمہیں وہ بات بتانا چاہوں گی پر اس سے پہلے تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ایک مرد بن کر نہیں ایک اچھا انسان بن کر عشال کے جذبات کو دیکھو گے۔“ عشال آپنی کی اس بات پر کچھ لمحے کشمکش میں رہنے کے بعد شایان نے پر اس کر لیا تو آپنی نے کہنا شروع کیا۔

”عشال ہم سب کی لاڈلی ہے بہت چھوٹی سی تھی جب ہمارے والدین کا انتقال ہو گیا ماں بابا نے میری اور 3 بھائیوں کی شادی اپنی زندگی میں ہی کروادی تھی پر اپنی آخری ذمہ داری پوری ہونے سے پہلے اللہ نے ان دونوں کو آگے پیچھے بلا لیا وہ عشال کو بھائیوں کے بھروسے چھوڑ کر اپنے آخری سفر کی جانب نکل گئے

عشال نے 16 سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا تو بھائیوں نے آگے پڑھنے سے منع کر دیا عشال کی بے تحاشا ضد نے آخر کار بھائیوں کو راضی کر لیا پر اس شرط پر کہ وہ کالج سے آنے کے بعد باقی تمام کام اپنے ذمہ لے گی عشال کچھ بننا چاہتی تھی بھائیوں کے آنے کے بعد بھائی بالکل بدل گئے تھے عشال اپنے دم پر کچھ کرنا چاہتی تھی سو اس نے حامی بھری کالج میں اس نے کوئی فرینڈ نہیں بنائی اپنے کام سے کام رکھا کرتی تھی کالج سے آ کر گھر کا کام اور پھر رات گئے پڑھنا اس کا معمول بن گیا اسی بناء پر اس کی طبیعت مڈ حال ہونے لگی ایک دن اسے تیز بخار تھا اس نے کالج سے چھٹی کہلی آرام کرنے کی غرض سے پر بھائیوں نے صبح کے تمام کام اور پھر کھانا بھی اسی کے سر ڈال دیا عشال نے کھانا بنایا تو مرچی غلطی سے زیادہ ہو گئی اس بات کا بھائیوں نے خوب ایشو بنایا کہ اس نے جان بوجھ کر غصے میں مرچی زیادہ ڈالی ہے بھائیوں نے اس پر عشال کو خوب سنایا یہاں تک کہ احد بھائی نے تو عشال کو تھپڑ بھی دے مارا ہماری پوری فیملی پڑھی لکھی اور میچور ہے پر نجمانے بھائی لوگ بھائی کے آنے کے بعد اتنا کیسے بدل گئے عشال اس دن بے تحاشا روئی اس کی نفرت اور بڑھ گئی بھائی کے لئے کچھ دنوں تک جب طبیعت بحال ہوئی تو کالج دوبارہ جوائن کر لیا ایک پریذفری ہونے کی وجہ سے عشال باہر آ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں آنسو اس کی پلکوں سے جیسے باہر نکلنے کو بے تاب تھے روتے ہوئے اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔“ عشال آپنی نے تانیہ کی آمد پر سلسلہ کلام روکا اور شایان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”لو یہ چائے پیو۔“ عشال آپنی نے کہا۔

”انگل! آپ عشال آئی کو کیوں نہیں لائے.....؟“ تانیہ نے پوچھا۔

وہ ضرور لاتا مجھے اصل میں آپ کی ماسے کام تھا تھوڑا اس لئے میں اکیلے چلا آیا۔“ شایان نے بتایا۔

”مما! کل میرا ٹیسٹ ہے میں پڑھنے جا رہی ہوں روم میں کوئی کام ہو تو بلا لیجئے گا۔“ تانیہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ کوئی عشال کو دیکھ رہا تھا جب اس کے رونے میں کوئی کی نہیں آئی تو وہ آگے بڑھا اور بولا۔

”ابنی پرائیلم و دیوسٹر“ اس نے کہا۔

عشال نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اس نے اسے بلایا تو عشال نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی اور سامنے اجنبی لڑکے کو پا کر گڑبڑا گئی وہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنا اسکارف ٹھیک کیا۔

”ویٹ.....“ وہ لڑکا کچھ ہی دور گیا اور پانی کا گلاس لا کے عشال کو دیا۔

”یہ لیس پانی پی لیں پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا تو عشال نے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ گلاس تھا ما اور پانی پی لیا۔

”ہاں اب بتائیے کیا ہوا کیا گلاس فیلو سے جھگڑا ہوا ہے آپ کا آپ رو کیوں رہی ہو؟“ اس اجنبی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں ایسے ہی آپ کو کیا ہے بھلا میں روؤں یا نہ روں۔“ عشال نے تڑک کر جواب دیا۔

”آپ غصہ مت ہوئے اور دیکھئے میں کوئی پاگل تو ہوں نہیں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ آپ رو رہی ہیں اور وہ بھی اتنا زیادہ تو بلا وجہ رو رہی ہیں یا کوئی بات ہے آپ مجھے اپنا بھائی سمجھ کر بتا دیجئے۔“ اس نے کہا۔ بھائی کے لفظ پر عشال کا دماغ گھومنا لازمی تھا۔

ہونہہ..... یہ کہتے ہی عشال پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور وہ دنگ رہ گیا۔

”دیکھئے! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں بتائیں تو کیا ہوا ہے شاید میں آپ کی کوئی ہیلپ کر سکوں۔“ اجنبی کی بات کے جواب میں عشال نے ایک بھر پور گھوری اس پر ڈالی اور فائل سمیٹ کر چل دی۔

”توبہ استغفار عجیب لڑکی ہے۔“ اس نے سوچا وہ کالج میں ایک پروفیسر کی جگہ چند دنوں کے لئے پڑھانے آیا تھا اس کے دوست کا کوئی کام تھا جس کے باعث اس نے چند دنوں تک اسے پڑھانے بھیجا تھا کلاس روم سے نکل کر ہاتھ دھونے جاتے ہوئے اس نے عشال کو دیکھا تو احساس ہمدردی کے تحت پوچھ بیٹھا پر پھر سر جھٹکتے ہوئی چل دیا۔

کچھ دنوں بعد اس نے پھر عشال کو دیکھا تو اس کے پاس آ گیا۔

”ہائے آئی ایم ضمائر علی۔“ اس نے عشال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ آج پھر آگئے آپ کو چین نہیں ہے کیا.....؟“ عشال نے غصے سے پوچھا۔

”دیکھیں آپ مجھے کچھ زیادہ غلط سمجھ رہی ہو میں ایسا ویسا نہیں ہوں یہاں پر پروفیسر عامر کی جگہ چند دنوں کے لئے پڑھانے آیا ہوں۔“ ضمائر نے کہا۔

”واقعی آپ آئے ہیں پروفیسر عامر کی جگہ سچی مجھے بڑا شوق تھا آپ کو دیکھنے کا پر میری کلاس اتنی ٹھ ہے کہ موقع ہی نہیں ملتا کہ کسی اور ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاؤں اینڈ سوری سر میں نے آپ سے کچھ زیادہ ہی مس بی ہو کیا تھا اس دن۔“ عشال نے خوشی اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

”اچھا ابھی آپ کو مجھ سے ملنے کا شوق تھا بھلا وہ کیوں.....؟“ ضمائر نے پوچھا۔

”وہ میں نے آپ کے بہت چرچے سنے تھے

ساری کلاس کی لڑکیاں آپ کی تعریف کر رہی تھیں اس لئے۔ عشال نے بتایا۔

”چلو اب تو آپ کا شوق پورا ہو گیا نا۔“ ضمائر نے کہا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے پھر ملتے ہیں گڑیا نائس ٹومیٹ یو۔“ ضمائر ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

پھر اسی طرح کی ملاقاتوں پر عشال کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے کیسے اسے اپنا بھائی بنالیا اور اسے سب کچھ بتا دیا جسے سن کر ضمائر نے اسے اپنی چھوٹی بہن بنالیا اور واقعی ضمائر عشال کے لئے نہایت ہی اچھا بھائی ثابت ہوا۔ عشال، ضمائر بھائی کی فیملی سے بھی ملی تھی۔ ضمائر بھائی شادی شدہ تھے ان کی 1 بیٹی اور 1 بیٹا تھے ان کی وائف اور باقی تمام گھر والے اچھے تھے اور اسے ایک فیملی ممبر کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے۔ ضمائر بھائی 5 بھائی تھے بہن کوئی نہیں تھی ضمائر بھائی سب سے بڑے تھے ضمائر بھائی کی ماما کو عشال کے روپ میں ایک بیٹی کی جو تمنا تھی وہ پوری ہو گئی تھی ضمائر بھائی سے اس کی ملاقات کا دورانیہ 3 سال کا ہو چکا تھا۔ عشال تھرڈ ایئر میں آگئی تھی ضمائر سے اسے اتنا پیار تھا کہ وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کرتی تھی اس لئے اس نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ کوئی بھی مرد یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی بیوی کا کسی سے کوئی رشتہ ہو انہی دنوں تمہارا پر پوزل آ گیا تھا بھائیوں کو تم پسند آ گئے اور انہوں نے عشال کی شادی کرنے کی ٹھان لی جب عشال سے بات کی گئی تو اس نے انکار کر دیا۔ ضمائر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ عشال نے فہم بھائی اور احمد بھائی نے مجھے عشال کو سمجھانے کا کہا ایک دن میں گھر آئی اور عشال کو سمجھانے کی کوشش کی پر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

”عشال! شادی تو تم نے کرنی ہی ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو تو پھر.....“

”آپی! آپ بھی ایسا کہیں گی سب جانتے ہوئے

بھی۔“ عشال نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپی! میں ضمائر بھائی سے الگ ہونا نہیں چاہتی ہوں اور یہ شادی مجھے ان سے الگ کر دے گی۔“ شادی سے انکار کا مطلب تھا عشال کی بھائیوں سے لڑائی مجھے ان سب کا ایک ہی حل نظر آیا اور میں نے ضمائر کو فون کر کے سب صورتحال سے آگاہ کیا ضمائر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ عشال کو راضی کر لے گا اور اس نے کر بھی لیا۔

”بھائی آپ بھی میں سمجھتی تھی کہ مشعال آپنی اور آپ مجھے جانتے ہیں تو میرا ساتھ دیں گے۔“ عشال نے نم آنکھوں سے کہا۔

”عشال! تم اگر مجھے بھائی مانتی ہو نادل سے تو تم دیکھنا کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے گڑیا شادی کے بعد تم پلیر راضی ہو جاؤ میری خاطر اپنے بھائی کی خاطر۔“ ضمائر نے التجا کی۔

”ٹھیک ہے بھائی آپ کی خاطر یہ بھی سہی آپ میری شادی میں آئیں گے نا.....؟“ عشال نے مان سے پوچھا۔

”کیوں نہیں میری گڑیا ضرور آؤں گا میں۔“ انہوں نے پیار سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب گھر جاؤ اور شادی کے سنے دیکھو۔“ ضمائر نے کہا۔

”میں۔۔۔ تو تصویر نہیں دیکھی اس کے سنے کیسے دیکھوں.....؟“ عشال نے معصومیت سے پوچھا۔

”بتاؤں تمہیں ٹکی چلو جاؤ گھر پاگل۔“ ضمائر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جیسی بھی ہوں اپنے ضمائر بھائی پر گئی ہوں پاگل ہوں تو پاگل سہی۔“ عشال نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔ اوکے بائے بائے۔“

رخصت ہو کر تمہارے گھر آگئی پر جاتے جاتے میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں کچھ نہ بتائے اب تمہاری مرضی ہے تم جو کرو پر پلیر میری بہن کو خوش رکھنا۔“ مشعال آپنی نے التجا کی۔

”بھروسہ رکھئے مجھ پر اچھا یہ بتائیے کہ ضمائر کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے تو دیں مجھے۔“ شایان نے کہا تو آپنی نے اسے نمبر دے دیا نمبر لے کے وہ ندیا آپنی کے گھر کی جانب نکل پڑا 6 بج گئے تھے اور عشال کا غصے سے بھرا چہرہ دیکھنے کی اس کو پوری توقع تھی۔

☆.....☆.....☆

ندیا آپنی کے گھر پہنچ کر اسے حسب توقع صورتحال ملی وہاں سے نکلتے نکلتے 7 بج گئے گھر پہنچ کر ٹومیٹ اور عشال کچن میں چلی گئیں رات کے کھانے کی تیاری کرنے کے لئے کھانا کھانے کے بعد عشال نے برتن دھوئے جب دودھ گرم کرنے لگی تو ٹومیٹ بھی آگئی۔

”بھابی آج تو خوب تھکن ہو گئی نا۔“ ٹومیٹ نے کہا۔

”ہاں واقعی ٹومیٹ ویسے اگر سوچو یہ دودھ اس وقت پھٹ جائے تو تم کیا کرو گی تمہیں تو دودھ پے بغیر نیند جو نہیں آتی۔“ عشال نے مذاقاً کہا۔

”بھابی! کیا آپ بھی اچھا اچھا بولیں اور ویسے بھی اگر دودھ پھٹ جائے تو نو پر اہلم آپ ایک کام کیجئے گا وائٹ دھاگے سے سی لیجئے گا کچی کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ ٹومیٹ نے مسکراتے ہوئے کہا تو عشال ہنس پڑی۔

”اچھا اب یہ بھی بتا دو وہ دھاگہ دکھتا تو ہو گا خدایا دھاگہ بھی کوئی جادوئی ہو گا کہ سل بھی جائے گا اور دکھے گا بھی نہیں۔“ عشال نے ہنستے ہوئے کہا تو دونوں ہی ہنس دیں۔

”یار! دودھ گرم کر رہی ہو یا باتیں بگھا رہی ہو تم دونوں۔“ شایان کچن میں آیا تو بولا۔

”بس آ رہی تھی آپ کو بھی نا ذرا صبر نہیں ہے۔“

عشال نے کہا اور دودھ گلاس میں ڈال کر ٹومیٹ کو دیا اور کچن کی لائٹ آف کی اور شایان کے ساتھ کمرے میں آگئی۔

”عشال یار! کل 5 بجے ریڈی رہنا تمہیں کسی سے ملوانا ہے سر پرانز ہے۔“ شایان نے کہا۔

”کس سے ملوانا ہے پہلے بتائیں ورنہ میں کوئی ریڈی نہیں ہوں گی۔“ عشال بولی۔

”سر پرانز بھی کبھی بتا کے دیتے ہیں بھلا۔“ شایان نے مذاق اڑایا۔

”اوکے پاگل ریڈی رہوں گی میں جو حکم سرکار۔“ عشال نے کہا۔

”اچھا میں پاگل ہوں تو اپنے بارے میں جناب کے کیا نا در خیال ہیں۔“ شایان بولا۔

”میرے خیال اپنے بارے میں آپ سے کافی الگ ہیں۔“ عشال نے کہا۔

”اچھا میرا خیال تھا کہ آپ بڑی ذہین ہو عقلمند ہو پر بابا ہا شکر ہے آپ نے خود ہی بتا دیا کہ میں خوا خواہ کی غلط فہمی کا شکار ہوں۔“ شایان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھے نہیں لگ رہے ذرا بھی اچھا آپ مجھے نہیں بات کرنی آپ سے۔“ عشال نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

”اوکے بابا سوری! بھی مذاق کر رہا تھا جسٹ کڈنگ اوکے سوری نا اب کان پکڑوں کیا۔“ شایان نے اس کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ.....“ عشال نے جان کر بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا سوچ رہی تھیں تم.....؟“ شایان کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

”یہی کہ آپ کان پکڑ کر معافی مانگتے ہوئے کتنے مضحکہ خیز لگیں گے بابا۔“ عشال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بڑی اچھی لگ رہی ہو ہے نا۔“ شایان نے جل کر کہا۔

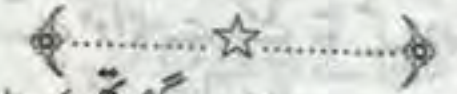
”بس آ رہی تھی آپ کو بھی نا ذرا صبر نہیں ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے آخر کار آپ بھی مان ہی گئے نا ویسے۔“

”اچھا بہت بولتی ہو تم او کے گڈ نائٹ۔“

شایان نے کہا۔

”او کے گڈ نائٹ۔“ عشال بولی۔



شام 6 بجے وہ ریڈی ہو گئی تھی ریڈ اینڈ بلیک کنٹر اس کی فراک اور چوڑی دار پا جامے میں نہایت اچھی لگ رہی تھی شایان کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا گیٹ کھولنے کی آواز پر بال بناتی ہوئی عشال نے مڑ کر دیکھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ مجھے اچھی نہیں لگ رہی کیا.....؟“ عشال نے نروس ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھی نہیں تم بے حد اچھی لگ رہی ہو ایسے جیسے آسمان سے اتری ہوئی حور جیسے ماورائی مخلوق۔“ شایان نے رومینگ انداز میں کہا عشال کو اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آج آپ کو کہیں جانا ہے۔“ عشال نے اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

”کیا یار! بہت ظالم بیوی ہو تم ویٹ بس ابھی آیا۔“ پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر سے نکل پڑے گاڑی جن جن راستوں سے گزر رہی تھی وہ راستے عشال کے جانے پہچانے تھے اچانک ایک بنگلے کے سامنے کاررک گئی عشال نے جونہی نگاہ اٹھائی اندر تک خوفزدہ رہ گئی وہ کہیں اور نہیں ضمائر بھائی کے گھر کے سامنے کھڑی تھی ڈرتے ڈرتے وہ گاڑی سے اتری اور شایان کی سنگت میں اندر بڑھی۔

”نجانے شایان کا یہاں پر کون سا فرینڈ ہے۔“ عشال نے سوچا۔

اندر گھسنے پر پورا بنگلہ تاریکی میں ڈوب گیا وہ

شایان کے ساتھ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی شایان اسے لے کر ہال کمرے کی جانب بڑھا تو لائٹ فوراً ہی آن ہو گئی اور اس پر پھولوں کی برسات ہونے لگی۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو پپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیز گڑیا پپی برتھ ڈے ٹو یو۔“ ضمائر بھائی کی پوری فیملی ضمائر بھائی کے ساتھ اس کووش کر رہی تھی سینٹرل ٹیبل پر ایک بڑا سا کیک رکھا تھا۔

”آؤ عشال! کیک کاٹو۔“ ضمائر بھائی نے کہا۔ عشال شا کڈ کی سی کیفیت میں آگے بڑھی اور کیک کاٹا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ حیران نظروں سے شایان کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔

”شایان! یہ سب کیا.....؟ اور آپ کو کیسے پتا چلا.....؟“ عشال نے حیرت سے پوچھا تو شایان نے ساری بات بتائی کہ کس طرح اس نے مشعل آپنی سے بات کی پھر ضمائر بھائی سے ملا اور اتفاق سے اس کے اگلے دن اس کا برتھ ڈے تھا۔

”سوری شایان! مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو اس لئے نہیں بتایا کیونکہ مجھے آپنی نے منع کر رکھا تھا۔“ عشال نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں عشال! اب مجھے چھوڑو اب اپنے بھائی سے ملو جس کے لئے میڈم اکثر رونی ہیں اور مجھ پر اور میری بہن پر نیت لگاتی ہیں۔“ شایان نے کہا۔

”دیکھا عشال! میں کیا کہتا تھا نا کہ تم مجھے مل جاؤ گی دوبارہ۔“ ضمائر بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا تو عشال ان کے گلے لگ کر رو پڑی کافی ٹائم گلے لگے رہنے کے اور گلے شکوے کرنے کے بعد وہ شایان کی طرف بڑھی۔

”شایان! آپ نہایت اچھے ہیں واقعی مجھے آپ پر فخر ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ عشال نے شایان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے ویسے لوگ میرے اعتراف کرتے

”شایان نے کہا تو سب ہنس پڑے۔“

”ایکدم فٹ آپ کو کیسی لگ رہی ہوں۔“ عشال مسکراتے ہوئے کہا اس کی آواز خوشی کے باعث لگ رہی تھی۔

”ہاں ضمائر جیسا بھائی اور شایان جیسا شوہر پانے کے بعد عشال نا خوش رہے گی امپا بل۔“ ضمائر بھائی نے کہا۔

”اف..... لوگوں کو اپنی تعریف کرنے کا موقع ملنا ہے بس۔“ بھابی یعنی ضمائر بھائی کی بیوی نے کہا۔

”اچھا تو آپ اپنی کر لیجئے آپ کو بھی حق حاصل ہے جوئی تعریفیں کرنے کا کیوں عشال.....؟“ ضمائر بھائی نے ہنستے ہوئے عشال سے پوچھا تو عشال سمیت ہنس پڑے اور بھابی کا منہ دیکھنے والا تھا۔

”بس بہت باتیں کر لیں سب نے عشال بیٹا! یہی ہو تم شادی شدہ زندگی کیسی گزر رہی ہے۔“ ضمائر بھائی نے پوچھا۔

”وہ تو آپ کو شایان کو دیکھ کر اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔“ ضمائر بھائی کے چھوٹے بھائی سعد نے کہا۔

”اب آپ سب مجھے شرمندہ کر رہے ہو اتنی تعریف کر کے۔“ شایان نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”چلیں..... اب نہیں کرتے آپ کی تعریف کیا کریں گے کس خنی سے پالا پڑا ہے آپ کا۔“ ضمائر بھائی نے کہا اتنے میں بھابی ہال کمرے میں داخل ہوئی۔

”چلیں سب کھانا کھالیں۔“ بھابی نے کہا تو ضمائر بھائی نے ہوئے پھر ڈانٹنگ ٹیبل پر اسی طرح کی ٹنگی ٹوک جھونک کے ساتھ پر تکلف کھانے کا بل بوتے پر۔

”چلیں اب ہمیں اجازت دیں۔“ شایان نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ بھابی نے کہا۔

”ضمائر بھائی! آپ ہمارے گھر کب آئیں گے.....؟“ عشال نے بھائی سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

”انشاء اللہ جلدی میری جان جلدی آؤں گا۔“ ضمائر بھائی نے پیار سے کہا۔ سب سے ملنے کے بعد وہ دونوں نکل پڑے۔ گھر جب پہنچے تو 9 گئے تھے تو میہ نجانے کہاں تھی عشال نے دیکھا تو وہ سوچتی تھی۔

”عشال یار! آتے ہوئے میرے لئے 1 کپ کافی لے آنا۔“ شایان نے ٹائی کی نائٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

”جی جناب ضرور۔“ عشال نے کہا۔ جب عشال کافی لے کر کمرے میں پہنچی تو شایان بیڈ پر لیٹا تھا۔

”شایان! یہ لیں۔“ عشال نے کہا۔

”شایان! آپ بہت اچھے ہیں آج آپ نے میری برتھ ڈے پر مجھے جو تحفہ دیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔“ عشال نے نم لہجے میں کہا۔

”وہ تو گفت نہیں ہوا بھی تمہاری برتھ ڈے کا گفت تو ابھی ملے گا۔“ شایان نے سائیڈ ٹیبل سے ایک گفت پیک نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو میری جان۔“ شایان نے عشال کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو سوچ شایان۔“ عشال نے کہا۔

”لو گفت کھولو۔“ شایان نے کہا تو عشال نے پیک کھولا تو اس میں خوبصورت ٹگینوں سے مزین انگوٹھی تھی۔

”تھینک یو سوچ شایان! اس سو پر بیٹی۔“ عشال نے خوشی سے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا تو شایان نے پھر اسے گلے لگا لیا آج شایان بہت خوش تھا کیونکہ اس کی جان سے پیاری بیوی خوش تھی اور عشال کو آج زندگی کی تمام خوشیاں مل گئی تھیں اس کی ساری تشنگی دور ہو گئی تھی چاند کی روشنی بھی آج چمک رہی تھی۔



انعم خان

مکمل ناول

قسط نمبر 15

ایسی دل میں سے ہوئی

حسن گیلانی سے بات کے بعد وہ مطمئن ہوا تھا انہوں نے امید دلائی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ساجدہ گیلانی راضی کر لیں گے سو ریلیکس ساعمر کے ساتھ ضروری شاپنگ کرنے مارکیٹ کی طرف گیا تھا۔



اتوار کا دن تھا حسن گیلانی بھی گھر میں ہی تھے اور بیگم سے بیٹے کے متعلق بات کرنے کا سوچ رہے تھے مگر ان بیٹے میں ہی ساجدہ گیلانی متکثر سی ان کے سامنے بیٹھتے ناراضی سے بولیں تھیں۔
”سمجھائیں آپ علی کو..... کیوں میری ممتا کا امتحان لینا چاہ رہا ہے۔“
”ہوا کیا ہے؟“

”اب نیا شوشہ لے کر بیٹھا ہے ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔“ وہ علی پر غصہ تھیں ان کی بات نے حسن گیلانی کو سنے کی طرف آنے کے لئے ہموار راہ دی تو فوراً بولے۔
”بعض اوقات والدین خصوصاً ماں کو اپنی ممتا سے بڑھ کر اپنے بچوں کا سکون عزیز ہوتا ہے اولاد کی خوشی اور سنی والدین کی خواہش ہوتی ہے اور ساجدہ یہ سچ ہے کہ علی کے لیے تمہاری ممتا تمہارا پیارا نمول ہے مگر ان سب مالک تمہیں کم از کم اس وقت ایسی صورتحال میں اپنی ممتا کو کچھ عرصے کے لیے قربان کرنا چاہیے۔“
”حسن! آپ کیا کہہ رہے ہیں میں سمجھی نہیں۔“ وہ نا سمجھی کے سے انداز میں بولیں۔
”میں تمہاری فکر سے واقف ہوں ساجدہ! لیکن علی کا فیصلہ بھی شاید غلط نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولے۔



”اوہ..... تو علی نے آپ کو سفارشی بنا کر بھیجا ہے۔“ وہ ناراض ہوئیں۔

”نہیں.....!“ انہوں نے فی الفور فی میں سر ہلایا کہ مبادیات شروع ہونے اور انہیں قائل کرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے ساتھ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے مزید بولے کہ نیگم صاحبہ کو بیٹے پر غصہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

”بس اس نے مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر کیا تھا۔“

”ایک مرتبہ میں اسے منع کر چکی ہوں حسن! اور اب بھی میرا وہی جواب ہے۔ میں اسے خود سے دور نہیں بھیج سکتی۔“ وہ دونوں قطعیت سے بولیں۔

”جن حالات سے وہ گزر رہا ہے جتنا نارسائی کے دکھ کو اس نے خود پر حاوی کیا ہے اس سے وہ میٹھی سیٹ نہیں پار رہا یہاں نہ قلبی سکون اسے یہاں مل سکتا ہے ہمیں اسے ایک موقع ضرور دینا چاہیے کیا پتہ بہت جلد وہ اپنی کوشش میں سرخرو ہوا اور بالکل فریش پہلے جیسا بن کر لوٹ آئے۔“ انہوں نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ مجھے بہلا رہے ہیں حسن! یا علی کے دھوکے میں آ رہے ہیں۔ علی کا فیصلہ سراسر غلط ہے فریب ہی سمجھیں آپ اگر اسے سنبھلنا ہوتا تو اب تک سنبھل چکا ہوتا ایک معمولی سی لڑکی کے لیے جتنا اس نے خود کو روگ لگایا ہے جتنا تڑپا ہے ایسے میں کوئی پاگل ہی ہوگا جو اس کے فیصلے کو سراہے گا یہاں ہمارے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو آگ میں جلاتا رہا وہاں ہم سے دور غیروں اجنبیوں میں مستبشرہ کو سوچ کر پاگل ہو جائے گا سچ کہوں تو حسن وہ مستبشرہ کو بھول ہی نہیں چاہتا، ٹھوکر کھا کر گرنے کا یہ مطلب تو ہرگز بھی نہیں کہ دوبارہ اٹھنا اور آگے بڑھنا ہی بھول جاؤ۔“ وہ سمجھنے کے موڈ میں ہی نہ تھیں۔

”اس فیصلے سے وہ اٹھ کر آگے ہی بڑھنا چاہتا ہے۔“ وہ اتنا ہی بولے۔

”اپنوں کی اسے فکر نہیں غیروں میں کیسے آگے بڑھ سکتا ہے وہ۔“ ساجدہ گیلانی تلخ و طنزیہ ہوئیں علی کا فیصلہ انہیں ہرگز منظور نہ تھا نہ وہ اپنے خود سے دور بھیجنا چاہتی تھیں نہ انہیں تو قلع تھی کہ علی خود کو خود ساختہ روگ سے نکالنے کی کوشش کر سکتا ہے کیونکہ وہ بھڑکی جانتی تھیں کہ علی نے مستبشرہ جہاں سے جنون کی حد تک محبت کی تھی اور جس کی سزا وہ اب بھگت رہا تھا مگر اس کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑایا تھا۔

”غیروں میں نہیں وہ اپنوں میں ہی رہے گا میں نے اسے اٹلی جانے کا مشورہ دیا ہے۔“ حسن گیلانی نے بتایا۔

”تو آپ اس نے فیصلے میں برابر کے شریک ہیں۔“ ساجدہ گیلانی نے خفیف انداز میں انہیں دیکھا۔

”شاید..... لیکن شراکت میں میں نے تمہاری پرانی خواہش کو سر فہرست رکھتے ہوئے علی کو یقین دہانی کی ہے کہ تم اپنے اجازت دے دو گی لیکن فی الحال میں نے اسے تمہاری خواہش کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ جیسی وہ سہل سے فوراً بولنے لگی کہ اپنی خواہش کے پھر سے جاگنے پر وہ مان سکتی ہیں۔

”کون سی خواہش؟“ وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے ان سے استفسار کرنے لگیں۔

”جب تک علی نے مستبشرہ کا ذکر تم سے نہیں کیا تھا اس سے پہلے تم نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ افریشم کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہو۔“ انہوں نے بیوی کو یاد دلایا۔

”ہاں تو پھر.....؟“ یاد آنے پر وہ پوچھنے لگیں۔

”پھر یہ کہ اب مستبشرہ علی کی زندگی سے چلی گئی ہے تم اپنی خواہش پوری کرنا چاہو تو یہ نادر موقع ہے۔“ انہوں نے تیر نشانے پر پھینکا۔

”مطلب؟“ وہ دھیمی پڑیں حقیقتاً ان کی یہ خواہش اس وقت حسرت بن کر رہ گئی تھی جب علی نے ان سے مستبشرہ جمال کا ذکر کیا تھا تب وہ بیٹے کی خوشی کے لیے مان گئی تھیں مگر اب پھر سے ان کی حسرت خواہش میں یکدم ڈھلی تھی۔

”اٹلی میں علی جتنا بھی وقت گزارے گا افریشم اس کے ساتھ اگر رہی تو نہ صرف وہ مستبشرہ کو بھول جائے گا بلکہ خود سے افریشم سے رشتے کے لیے کہے گا تم دیکھ لینا۔“ انہوں نے نیگم کو زبردست آس دلائی۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ پرامید آواز و نظروں سے انہوں نے شوہر کو دیکھا۔

”یقیناً۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مدھم سا مسکرائے۔

”اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ ساجدہ گیلانی نے دوسرا پہلو بھی ساتھ لیا۔

”ایسا ہی ہوگا تم فکر نہ کرو تو کیا اب تم علی کو جانے کی اجازت دو گی؟“ حسن گیلانی نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مجبوراً!.....!“ اپنی خواہش کے ہاتھوں بالآخر انہیں ماننا ہی پڑا وہ بولے۔

”سرمہ کے دونوں بیٹے بھی ابھی چھوٹے ہیں علی وہاں کے آفس کو بھی جوائن کر لے گا اور سرمہ بتا رہا تھا کہ اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے کے بعد افریشم بھی بزنس جوائن کر لے گی یوں دونوں مزید وقت ساتھ گزاریں گے اور عافیہ (بہن) بھی کتنے عرصے سے سب کو آنے کا کہہ رہی تھی وہ بھی خوش ہو جائے گی۔“

”ہاں اور کم از کم اسے خود سے دور بھیج کر مجھے اس کے کھانے پینے کی فکر تو نہیں ہوگی وہاں سب اس کے اپنے ہوں گے اس کا خیال رکھیں گے۔“ ساجدہ گیلانی نے اپنی بات کی۔ علی تو خود سے دور بھیجنے کے کھن فیصلے کے بعد ان کا دل البتہ مطمئن تھا۔

حسن گیلانی بالآخر انہیں راضی کرنے کے بعد بیٹے کا انتظار کرنے لگے شام کو جب وہ واپس آیا تو ماں کو بچن میں موجود پا کر سیدھا حسن گیلانی سے پوچھنے ان کے کمرے کی طرف بڑھا وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کسی فائل میں محو تھے۔

”آؤ بر خوردار! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“ وہ علی کو دیکھتے ہی فائل سائیڈ پر رکھ کر سیدھے ہوئے۔

”ڈیڈ! آپ نے بات کی ماما؟“ اس نے بے صبری سے پوچھا۔

”ہاں کی تھی!“ وہ اس کے انداز پر مسکرائے۔

”پھر.....؟“

”تمہاری ماں نے اپنی ممتا کو تمہاری خوشی کے لیے زبردستی سائیڈ پر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے تم کچھ عرصے کے لیے اٹلی جاسکتے ہو مگر اس شرط کے ساتھ کہ اپنے ارادے کی تکمیل کرو گے۔“ وہ تفصیل سے بولے۔

”انشاء اللہ ضرور!“ وہ ہر عزم تھا۔

”مگر وہ اتنی جلدی کیسے مان گئیں مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔“

”بس ہے ایک وجہ۔“

”کیسی وجہ؟“ وہ حیران ہوا۔

”کچھ خاص نہیں اور وہ کہتے ہیں ناں کہ آم کھاؤ پیڑ نہ گنوسو تم بھی تیاری کرو اب جانے کی وجہ تلاش نہ کرو۔“ وہ خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

”او کے ڈیڈ! جیسے آپ کہیں اینڈ تھینک یو سوچ“۔ وہ بھی ان ہی کے انداز میں مسکراتا اٹھا اور ان کے گلے لگ کر تشکر سے کہتا جانے لگا۔

”کہاں چلے؟“
”مما کی طرف..... جانے تک کا سارا وقت ان کے ساتھ گزاروں گا اب ورنہ ناراض ہوں گی۔“ ان کی طبیعت سے واقف وہ بولا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ حسن گیلانی نے اثبات میں سر ہلایا۔
وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

”مراد بھائی کی تو نگاہیں بس آپ کا ہی طواف کر رہی تھیں۔“ نفیسہ بیگم اور سعید احمد سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد پریشے اس کو تصویریں دکھانے کے لیے کمرے میں لے آئی تھی اور ایک ایک تصویر اس کے سامنے کرتی جہاں اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی وہیں مراد کی دیوانگی اور محبت سے بھی اسے آگاہ کر رہی تھی۔ مہروش نے اس کی بات پر اس کے ہاتھ میں پکڑی ان تصویروں کو دیکھا جن میں مراد صرف اسے دیکھتا مسکرا رہا تھا۔

”ہوں..... اور اسی لیے ایک بھی کچر ٹھیک نہیں آئی۔“ بظاہر وہ شریر سے انداز میں کہتی پریشے کے گھورنے پر مسکرائی تھی مگر دراصل مراد کے ذکر سے اندر تک کڑواہٹ پھیلی تھی۔
”دس ازناٹ گڈ! ایک سے ایک بیسٹ پکچر ہے۔“

”چلو تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔
”اچھا یہ دیکھیں اس میں آپ دونوں کا کیل ہنڈرڈ پرسنٹ پرفیکٹ لگ رہا ہے بالکل ایسے جیسے اللہ نے صرف ایک دوسرے کے لیے بنایا ہو آپ کو..... اور ساری خوشی محبت آپ پر نچھاور کر دی ہو۔“ پریشے نے ایک اور تصویر اس کے سامنے کی جس میں وہ اور مراد بالکل ساتھ بیٹھے زندگی سے بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے ارد گرد سے بے نیاز لگ رہے تھے ماما ہی نے پریشے کے ہاتھ سے تصویر لے کر آنکھوں کے سامنے کی پریشے باقی تصویروں کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مراد..... مراد..... مراد.....!“ اس کا دل پھٹ کر چینا تھا اس شخص نے تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نوچ کر کھرچ ڈالی تھی مگر شومی قسمت پھر بھی اب اسے آگے ہر لمحے اپنے نام کے ساتھ اسی شخص کا نام سننا اور لینا تھا اور اس قدر بے بس ہو کر لینا تھا جیسے سانسوں کی روانی اس نام کے بغیر ممکن نہ ہو۔
”کہاں کھو گئیں جناب!“ پریشے نے اسے بری طرح محو پا کر ہوش کی دنیا میں واپس لانا چاہا وہ پریشے کے لیے سنبھل کر مسکرائی۔

”کہیں نہیں..... بس!“
”بس یہاں آئے چند گھنٹے ہوئے اور مراد بھائی کی یاد آپ کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں۔“ وہ ماما کی بات اچک کر سوالیہ کھلکھلاتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
”مراد کی یاد محض یاد نہیں بلکہ بھیا تک یاد ہے جو شاید ہی میرا پیچھا چھوڑے۔“ جواباً وہ ہر جتہ دل میں بولی۔
”کیوں ایسا ہی ہے ناں؟“ پریشے مکمل اس کی طرف متوجہ تھی۔

”نہیں ایسا بھی نہیں ہے اب!“ ماما نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا وہ کسی کو بھی اپنے متعلق غلط فہمی کی اصلیت خود اپنی زبانی بتانا نہیں چاہتی تھی نہ کوئی بھی ایسا تاثر غلط بھول کر انہیں دینا چاہتی تھی جس سے شک کی کوئی گنجائش نکلتی۔

”اب آپ بن رہی ہیں مراد بھائی کو پتہ چلے گا تو ناراض ہوں گے ان کی محبت کی قدر کریں گی تو ان کی محبت میں برکت ہوگی کچھ سمجھ آیا؟“ پریشے نے بڑی بوڑھیوں کے سے شوخ انداز میں کہا۔
”جی آگیا سمجھ..... پر کیا ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں؟“ ماما نے بچوں کے سے انداز میں کہتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی کم از کم وہ یہاں مراد کے ذکر سے آزاد رہنا چاہتی تھی۔
”ضرور کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر کریں ناں۔“
”ہاں بالکل!“ پریشے ہنسی اور تصویریں سمیٹ کر نئے سرے سے باتوں میں مصروف ہوئی کچھ دیر بعد پریشے کام سے اٹھ کر گئی تو وہ بھی اٹھ کر باہر لان میں نکل آئی جہی ہارن کی آواز پر چوکیدار نے مین گیٹ کھولا اور وقار کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وقار فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکلا۔ اس نے قدم اندر کی جانب حسب معمول بڑھانے چاہے مگر اس سے پہلے اُس کی نظر مہروش پر پڑی جو اسی کی طرف متوجہ تھی تو اندر جانے کے بجائے خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

السلام وعلیکم وقار بھائی!
”علیکم السلام! کیسی ہو ماما!“ وقار نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔
”ٹھیک ہوں!“ اس نے رمان سے بتایا۔ لب و لہجہ انداز اس نے نارمل رکھا تھا مگر وقار کو دیکھتے ہی گزرے ڈیڑھ ماہ کا تمام عرصہ مراد کے بہروپ کی وجہ آج آنے سے پہلے پڑنے والا پتھر اور آئندہ کی تمام وہ متوقع بے قدری بے بسی بربادی کسی فلم کی طرح اس کے دماغ کے پردے پر رونما ہوئی تھیں جن کا ذمے دار یا وجہ وقار سعید کی ذات تھی۔

”کس وقت آئی ہو تم؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
”ابھی ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔“ اس نے مختصراً کہا۔ وقار سے لمبی گفتگو فی الحال وہ کرنا نہیں چاہ رہی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا لہجہ وقار کے لیے تلخ نہ ہو جائے۔
”کچھ دن رہو گی تو سہی ناں؟“ جبکہ وقار اسے کافی عرصے بعد دیکھ کر خوش ہوا تھا۔
”جی تقریباً ایک ہفتہ۔“

”او کے پھپھو کیسی ہیں؟ اور مراد بھی آیا ہے؟“ وہ بہن کی اندرونی و بیرونی کیفیت سے بے خبر اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”پھپھو ٹھیک ہیں اور مراد تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔“ وہ ہر سوال کا جواب سنجیدگی سے دے رہی تھی خود کو کمپوز کر رہی تھی بہن ہونے کے ناطے وہ اس سے نفرت تو نہیں کر سکی تھی مگر دل اس کا کچھ بدل سا گیا تھا۔
”او کے اور تم اندر آؤ ناں سب کے ساتھ بیٹھو یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو۔“ وقار نے اسے اندر آنے کو کہا تو اثبات میں سر ہلاتی اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھی۔ باقی تمام افراد لاؤنج میں بیٹھے تھے پریشے بھی کام سے فارغ ہو کر وہیں آئی تھی۔

”بھئی میں نے ریحانہ خالہ کے گھر فون کیا تھا کل وہ اور سین وغیرہ آپ سے ملنے آئیں گی۔“ ماہی کے برابر بیٹھے ہوئے وہ اسے بتانے لگی۔
”اوکے۔“ تو وہ محض اتنا ہی بولی۔

رات کا کھانا کھانے سے پہلے تک اور کھانا کھانے کے دوران گھر کے تمام مینوں کے درمیان ان کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کرتی مگر کھانا کھانے کے بعد پریشے کو گرین ٹی بنانے کا کہہ کر آہستگی سے کمرے میں چلی آئی اور بیڈ کی طرف بڑھی سینڈز اتار کر پاؤں اوپر کھینچ کر بیٹھ گئی پھر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے دانستہ گردن سائیڈ ٹیبل کی طرف ڈالتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فریم شدہ تصویر اٹھائی اور بغور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

یہ وہی تصویر تھی جو پریشے نے اس کی ایجنٹ کے دن لی تھی جب مراد اسے رنگ پہنارہا تھا۔ وہ روش کو وہ لمحہ اب بھی یاد تھا جسے پریشے نے موبائل میں کیچ کیا تھا۔ اس وقت مراد منصور کی آنکھوں میں بے پناہ محبت تھی اور ماہی کے چہرے پر انبساط کے ہزاروں رنگ اور آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی مگر اب..... مراد کی اصلیت اس کے سامنے تھی مراد کی جھوٹی چاہتوں کا مقصد اس پر کھل گیا تھا تو اب نہ آنکھوں میں پہلی سی چمک ٹھہری تھی نہ اس لمحے کی یاد سے دل میں ترنگ پیدا ہوئی تھی بس مراد کی ذات اس کی یاد سے ابھرنے لگی تھی۔

ایک دھوکا کھا کر اس کی خواہشات و جذبات انتقام کی بجائے چڑھ گئے تھے اور دل تپتے انگاروں پر لمحہ لمحہ جھلس رہا تھا پگھل رہا تھا نہ تن من کو سکون تھا نہ روح کو قرار مل رہا تھا اپنی بے قدیری پر ملال بھی اسے ناکافی لگا تھا۔
”مگر یوں بھی آخر کب تک چلے گا؟“ وہ دل میں خود سے ہم کلام تھی۔

”مراد کا ہاتھ ایک بار اٹھ چکا ہے میں لاکھ ہمت دکھاؤں مگر ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکتی وہ زخمی شیر بنا ہر صورت میرا شکار کرتا رہے گا میری زندگی تو اجیرن کر چکا ہے مجھے سب کی نظروں میں بھی قصور وار ٹھہرا سکتا ہے مجھ سے جہاں تک ممکن ہوا میں مراد کا مقابلہ کروں گی مجھے مراد با آسانی مات نہیں دے سکتا۔“ حواسوں پر مکمل اختیار رکھے وہ اپنی سوچ پر یقین کی مہر ثبت کرنا چاہ رہی تھی نگاہیں ہنوز ہاتھ میں پکڑی تصویر پر مرکوز تھیں۔

”وقت کی اس کروٹ میں میں تزلزل کا شکار نہیں ہو سکتی۔“ دل میں چھپے گہرے رنج کو بظاہر وہ آنکھوں میں عیاں ہونے سے روکے ہوئے تھی مگر اشکوں کی ایک لمبی قطار بنا جاتے ہوئے بھی اندر ہی اندر گرے جا رہی تھی۔

”اپنے حق میں میں کسے گناہگار سمجھوں اور کسے بے قصور ٹھہراؤں۔ مراد منصور کو..... جسے اپنے آگے محض اپنے اور اپنی انا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا یا وقار بھائی کو..... جو ایک طرف میری بربادی کا سبب بنے ہیں اور دوسری طرف پورے خلوص سے میری خوشیوں کی دعا کرتے ہیں مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ کشمکش کا شکار ہوئی۔ البتہ وقار سے سخت نالاں ہو کر بھی وہ انتہا تک اس سے متنفر نہیں ہو سکی تھی۔

”میرا مجرم کوئی ایک ہو یا دونوں..... میں شاید ہی کسی ایک کو بھی معاف کر سکوں گی۔“ وہ گہری سوچ میں تھی وقار نے تقدیر کے اس بدلتے کھیل کا آغاز جانے انجانے میں اس کے لیے کیا کہا تھا اور مراد منصور نے اسی کھیل کو اپنے تئیں ایک دلچسپ موڑ دے کر اس کے لیے اسی کھیل کے اختتام کو سوالیہ بنا دیا تھا۔

وہ جانے کب سے کب تک یونہی اپنی سوچوں خیالوں میں مجور رہتی اگر پریشے کی آمد نہ ہوئی ہوتی۔ پریشے کمرے میں آتے ہی اسے تصویر پر نظریں گاڑے منہمک دیکھ کر مسکرائی اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فریم شدہ تصویر اچک کر شریر انداز میں بولی۔

”میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا“ لگتا ہے مراد بھائی نے آپ پر اپنی محبتوں کا جادو کر دیا ہے جو آپ یہاں بھی آئے

کے سحر سے نکل نہیں پار ہیں۔“
”ہاں..... اب تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ جس پر ماہی نے مصنوعی مگر دھیمہ قہقہہ لگا کر خود کو کمپوز کرنا چاہا تھا مگر ساتھ ہی سوچے بنانہ رہ گئی۔
”مگر محبتوں کا نہیں..... اپنی ذات کا ایسا کالا جادو کیا ہے جس کا اثر دل پر ہوا ہے اور تکلیف روح نے محسوس کی ہے۔“

”آپ کی چائے!“ پریشے نے گرین ٹی کا مگ اس کی طرف بڑھایا۔
”تھینک یو۔“ اس نے چہرے پر خوشگوار ریت لائی اور مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆.....☆.....☆
میردی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی مگر اس کے لیے اتنی بے اثر کہ سوچوں کی فرمائش کو جامد کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

”تم مجھے کمزور نہیں کر سکتے علی..... میرے اور تمہارے درمیان اب کچھ نہیں رہنا چاہیے نہ تمہاری یادیں نہ تمہاری محبت..... میرے دل کو کمزور کرنا چھوڑ دو پلیز!“ مستبشرہ جمال اس موڑ پر کھڑی تھی جہاں اسے اپنے ہر اس عزم و ارادے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس پر وہ علی آیان کو بھولنا چاہ رہی تھی اس کے غصے پر اسی ناکامی نے بے بسی کے آثار نمایاں کرنے شروع کیے تو وہ التجائیہ لہجے میں بڑبڑائی۔

”میں اپنے بابا کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی علی! اپنی یادوں سے کہو کہ میری زندگی تباہ نہ کریں میں نے ابھی بہت آگے بڑھنا ہے میرے دل کو اپنے خیالات میں مت جکڑو میں اپنے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں دیکھنا چاہتی۔“ مستبشرہ کو اس لمحے بھی اپنی ذات کی سالمیت کی فکر تھی۔ وہ اپنی لمبی پرواز کو قائم رکھنا چاہ رہی تھی۔ اپنے بابا کی نظروں میں ہر صورت سرخرو رہنا چاہتی تھی ایسے میں علی کا اس کی سوچوں اور خیالات سے دور..... بہت دور رہنا لازم تھا۔

”چلو میں مان لیتی ہوں کہ مجھے تم سے پیار کا نائک کرنے کے بجائے پہلے ہی دن صاف لفظوں میں تمہیں جواب دینا چاہیے تھا لیکن مجھے سچ میں پچھتاوا نہیں ہے اپنے کیے پر..... میں نے سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کیا تھا سچ میں میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز بھی نہیں تھا۔“ جانے مستبشرہ اس کے سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سمجھا رہی تھی یا خود کو تسلی دے کر اپنی پُر سوچ وحشت زدہ کیفیت سے چھٹکارا چاہ رہی تھی کیونکہ وہ جان کر بھی انجان بننا چاہ رہی تھی کہ علی کی یادوں سے محض وہ ذہنی طور پر فرسٹریشن کا شکار ہو رہی تھی اس کا دل شانت تھا دھڑکنوں کی روانی برقرار تھی۔

”یہ تمہارے خط کا وقتی اثر ہے بس اور کچھ نہیں..... اگر میرے دل میں واقعی تمہارا خیال یا ذرا برابر بھی جگہ ہوتی تو مجھے اسی لمحے احساس ہو جاتا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو دل سے دماغ سے مجھے تمہاری طرف مائل کرتا“ آئی ہوپ میں جلد از جلد اس تمام اثر سے خود کو نکال لوں گی تم زبردستی مجھ پر اپنی یادوں سمیت جاوی نہیں ہو سکتے۔“

وہ ہر سیرھی پر ثابت قدم رہ کر اپنے فیصلے پر اٹل ہونے کی مہر ثبت کرنا چاہ رہی تھی۔
”اصل میں محبت کچھ نہیں ہوتی علی! یہ نہ زندگی بن سکتی ہے کسی کی نہ کسی کی زندگی بنا سکتی ہے محض الجھن پیدا کرتی ہے محبت تم خود دیکھو؟ تمہیں کیا بنا دیا محبت نے؟ اور مجھے دیکھو! میں نے محبت کو اہمیت نہ دی تو اپنے بابا کو اعتبار دیتا جس سے میری وہ خواہش پوری ہونے جا رہی ہے جو اگر میں محبت کے چکر میں پڑتی تو ہمیشہ تشنہ رہتی۔“

مستبشرہ نے محبت کے پاٹ میں اسے اور خود کو گھسیٹ کر موازنہ کیا اس کے تصور کو سمجھانا چاہا ایک مرتبہ پھر قرار کے حصول کے لیے حتمی لہجہ اپنایا۔

”محبت پاگل پن کے علاوہ کچھ نہیں ہے علی! یہ صرف بے وقوفی کا دوسرا نام ہے اور نہ میں پاگل ہوں نہ بے وقوف..... میں تم سے محبت نہیں کر سکتی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اگر تم زبردستی مجھے یاد آتے بھی رہے تو میں اسے محبت ہرگز نہیں کہوں گی میں ایک لمحے کی قید میں تمام عمر نہیں گزار سکتی..... میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ اس کے الفاظ مضبوط اور لہجہ پائیداری لیے تھا۔

مگر یہ بات تو اس کے علم میں بھی تھی۔

محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی نہ کسی ارادے سے محبت کو توڑ لگایا جاتا ہے محبت پاگل پن ہو یا بے وقوفی یہ پھر بھی محبت ہی رہتی ہے دھیرے دھیرے رفتہ رفتہ اپنی جڑیں پھیلاتی ہے۔ چاہے کوئی خفا ہو یا خوش جس دل میں بسیرا کرنا چاہے اس دل میں بس جاتی ہے ایک خوبصورت ننھے معصوم جذبے کی طرح جس کا احساس بھلے جلد ہو یا بدیر مگر اس احساس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

محبت کا ایک لمحہ کافی ہوتا ہے عمر قید کے لیے.....!

اور جو احساس محبت ہو جائے تو محبت کا جذبہ فرار کی انکار کی تمام راہیں مفقود کر کے اپنی من مرضی کرتا ہے پھر کسی کی نہیں سنتا۔

مستبشرہ جمال فی الحال تو اس اصلیت سے نظریں چرا رہی تھی اپنے دل کی بھرپور نفی کر رہی تھی دماغ کے ہر فیصلے کو مستحکم کرنا چاہ رہی تھی اور جتنی جلدی کرنا چاہ رہی تھی اتنی شدت سے ناکامی کا سامنا کر رہی تھی جسے وہ فی الحال تو علی کے خط کا وقتی اثر گردان رہی تھی لیکن.....!

دل اور دماغ کی جنگ میں فیصلہ آنا ابھی باقی تھا۔

☆.....

”ماہی! تم سے ایک بات کا کہا تھا میں نے“۔ مہروش کو تنہا دیکھ کر وقار اس کے پاس آیا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا اس سے مخاطب سوالیہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا دوسری جانب اس نے وقار کے سامنے ایک مرتبہ پھر اپنے اندر موجود جتنی کو چھپانے کی سعی میں کچھ نہ یاد آنے پر آہستگی سے استفادہ کیا۔

”کون سی بات؟“

”مجھے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی مراد تھوڑا بہت اب بھی خفا ہے مجھ سے“۔ وقار قدرے سنجیدہ مٹھہرے ہوئے انداز میں گویا ہوا ماہی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”سب ٹھیک ہی تو نہیں ہوا بھائی!“ اور نہایت شکوہ کنناں لہجہ میں اندر ہی اندر گلوگیر انداز اپنایا اس کے سامنے ماہر نادل رہی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مراد کا دل بالکل صاف ہے آپ پلیز ایسا نہ سوچیں“۔

”ہاں مگر مجھے گلٹی فیل ہوتا ہے“۔ وہ اب بھی پشیمان تھا۔

”تو وقار بھائی! آپ اس وقت سوچتے ناں..... اب کیا فائدہ جب زندگی کی ہر سانس داؤ پر لگ گئی ہو“۔ جس سے ماہی باوجود کوشش کے لمحوں میں سخت ہوئی۔

”ماہی.....؟“ اس کی بات پر وقار کی آنکھیں گویا پھٹی تھیں۔

”جب آپ نے اُس وقت کسی کی فکر نہیں کی تھی تو اب کیوں کر رہے ہیں“۔ ماہی کا انداز تلخ و طنزیہ ہوا اندر ہی اندر خود سے سوال جواب نے جیسے اسے تھکا دیا تھا۔

”تب اور بات تھی ماہی!“ وقار کی آواز البتہ دھیمی و قدرے کمزور تھی۔

”کیا فرق ہے تب اور اب میں..... یہی کہ پہلے کسی اور کی بہن تھی اور اب بات آپ کی بہن کی ہے اس لیے آپ متفکر ہیں؟“ وہ خود کو بولنے سے روکنے میں ناکام ہو گئی تھی آواز کی گونج کم تھی مگر وقار کے لیے حیران کن تھی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے“۔ اس نے شکست خوردہ ہو کر نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیسی بات ہے بھائی؟“ وہ سخت نالاں نظر آئی۔

”میں مانتا ہوں کہ میری وجہ سے بہت پہلے دلوں میں رنجشوں نے جنم لیا تھا لیکن میں ساری عمر کی عداوت نہیں چاہتا۔ تھک گیا ہوں میں بھی ہر ایک کو خود سے متنفر دیکھ کر میرا بھی دل چاہتا ہے کہ.....“ تاسف زدہ آواز میں وہ جذباتی سا ہوا تھا لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ماہی بول پڑی۔

”اب سب ٹھیک ہو گیا وقار بھائی!“ وہ بات یہیں سمیٹنا چاہ رہی تھی۔

”تو پھر ماہی! تمہاری باتیں؟“

”میں صرف اس لیے یہ سب کہہ رہی ہوں کہ آپ کو پہلے بھی فکر کرنی چاہیے تھی اب میری فکر سے صرف اچھا بھائی بن رہے ہیں ایک اچھا انسان نہیں ادینہ کا بھی آپ سے رشتہ تھا جس کا پاس آپ نہیں نبھاسکے تھے۔ آپ نے کیوں شادی سے انکار کیا یہ آپ کسی کو اب بھی بتانا نہیں چاہتے لیکن ادینہ کی زندگی تو داؤ پر لگ گئی تھی تب آپ نے نہ اس کے بارے میں سوچا تھا نہ آنے والے وقت کے بارے میں پھر اب کیوں؟“ ماہی نے اس مرتبہ خود کو سیٹ کر لیا تھا۔

”کیا میں بھائی ہونے کے ناطے تمہاری فکر نہیں کر سکتا تمہارے لیے سوچنا نہیں چاہیے مجھے؟ کیا میں بے حس بن کر بیٹھ جاؤں؟ سب سے قطع تعلق کر لوں؟“ وہ دلبرداشتہ سا ہوا تھا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”بات قطع تعلق کی نہیں ہے وقار بھائی!“

”تم مجھے الجھن میں ڈال رہی ہو ماہی!“

”میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز بھی نہیں تھا آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں“۔ وقار کو مایوس دیکھ کر وہ نادم سی ہوئی۔

”میں تمہیں واقعی خوش دیکھنا چاہتا ہوں ماہی!“ وہ خلوص سے بولا۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ میں خوش ہوں؟“ وہ بولی پھر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”میں بہت خوش ہوں وقار بھائی! آپ میرے دل میں بہت معتبر مقام رکھتے ہیں مجھے آپ کے خلوص آپ کی فکر کی قدر ہے اور مراد کو بھی آپ سے اب کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں نے ان سے بات کی تھی اور اگر ان کے دل میں ذرا سی بھی کھٹک ہوئی تو وہ کیوں مجھ سے شادی کر کے ابو اور پچھو کو پھر سے ایک کرتے مراد بہت اچھے ہیں میں ان کے ساتھ بہت خوش ہوں آپ پلیز زیادہ نہ سوچا کریں“۔

”ہوں..... مگر تم زندگی داؤ پر لگنے کی بات.....“

☆.....

محبت (شخص کی صورت)

”تیرا انداز بیاں ہے کہ عنوان بہار
جب بھی کوئی پھول کھلا میں نے تجھے یاد کیا“
”آج پنک کمر کے ڈریس میں تم کسی پری سے کم
نہیں لگ رہی تھیں۔“ فلک کو شعر پڑھ کر جتنا غصہ آیا
تھا اس سے کئی زیادہ حیرت شعر کے نیچے الفاظ پڑھ کر
ہوئی تھی، پچھلے ایک سال سے یہ نمبر اسے مسلسل تنگ
کر رہا تھا نہ جانے کون تھا جو اس قدر مستقل مزاج تھا؟
فلک نے آج تک اس کے کسی بھی میسج کا کوئی رسپانس
نہیں دیا تھا لیکن آج اس اجنبی شخص کی اس بے باکی
اور جرأت پر وہ نہ صرف حیران ہوئی تھی بلکہ بری طرح
ٹھٹکی بھی تھی۔

”کوئی جواب تو دو! آخر کتنا انتظار کرواؤ گی.....؟“
”یا اللہ! یہ کون ہے.....؟“ وہ بری طرح روہانسی
ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”فلک بیٹا! اٹھو اکیڈمی سے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ
کالج سے واپس آ کر معمول کے مطابق کچھ دیر ستانے
کو لیٹ گئی تھی مگر اب عالیہ بیگم کے کئی بار اٹھانے پر بھی
نہیں اٹھ رہی تھی۔

”امی! میں آج نہیں جا رہی میرے سر میں درد
ہے، پلیز مجھے سونے دیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے بیٹا! تم آرام کرو، میں عروبہ کو
بتا دیتی ہوں۔“ عالیہ بیگم اس پر کمرل درست کرتے

ہوئے بولیں۔
”امی! آپ رہنے دیں، میں خود ہی کال کر لیتی
ہوں اسے، وہ انتظار کر رہی ہوگی میرا۔“ فلک نے تنکے
کے نیچے سے اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔
”اچھا ٹھیک ہے پھر سونا مت، میں تمہارے لئے
چائے بنا کر لاتی ہوں، سردرد کی گولی لے لیتا۔“ وہ محبت
سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں، عالیہ بیگم کے
جاتے ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی اور عروبہ کو کال کرنے لگی،
دوسری تیل پر ہی عروبہ نے کال پک کر لی تھی۔
”کہاں رہ گئی ہو تم یار فلک! اتنی دیر ہو گئی ہے۔“
عروبہ چھوٹے ہی بولی۔

”عروبہ! میں نہیں جا رہی آج اکیڈمی۔“

”کیوں.....؟“ عروبہ چیختی تھی۔

”وجہ تم اچھے سے جانتی ہو، میں نے کل رات تمہیں
کال پر سب بتا دیا تھا یار۔“ فلک ناراضی سے بولی۔

”اوہ..... تو اس وجہ سے تم اکیڈمی نہیں جا رہی
اب کیا تم ایک رنگ نمبر کی وجہ سے اپنی پڑھائی چھوڑ
دو گی.....؟“ کیریر تباہ کر دو گی.....؟ ڈر کے گھر بیٹھ
جاؤ گی.....؟ ہاؤ اسٹو پڈ یار۔“ عروبہ نے بری طرح
اسے ڈپٹا تھا۔

”عروبہ یار! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں.....؟ مجھے
بہت ٹینشن ہو رہی ہے یار آخر وہ کون شخص ہے جو ایک
سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، میں جو نمبر بدلوں

اسے پتہ چل جاتا ہے میری ہر سرگرمی پر اس کی کڑی نظر ہوتی ہے اور..... اب..... اب تو حد ہوگئی ہے یار وہ مجھے یہ بھی بتانا شروع ہو گیا ہے کہ میں نے کب کس کلر کا ڈریس پہنا ہوتا ہے دس از نوچ۔“ فلک غصے سے بولی۔

”پھر تم نے کیا سوچا ہے.....؟ اس سب کا کیا حل ہے تمہارے پاس.....؟“ عروبہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”پتہ نہیں یار..... اگر میں امی سے شیئر کروں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو جائیں گی تم جانتی ہو وہ میرے لئے کتنی پوزیسیو ہیں اور رہی بات ابو کی تو..... انہیں تو بتانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔“ فلک بے بسی سے بولی تھی۔

”اچھا پھر سنو! تم ایسا کرو کہ اسے میسج کرو اس سے صاف صاف پوچھو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے.....؟“

”ایسا ہی کروں گی اب۔“ فلک نے آہستگی سے کہہ کر کال کاٹ دی۔

”ہمارے کالج میں تو کوا بھوکیشن ہے ہی نہیں اور اکیڈمی بھی گرلز اکیڈمی ہے ان دو جگہوں کے علاوہ تو میں کہیں آتی جاتی بھی نہیں پھر یقیناً یہ شخص میری اکیڈمی کے راستے میں ہی کہیں ہوتا ہوگا۔“ فلک خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی کہ اسی رائگ نمبر سے میسج آ گیا۔

”آج اکیڈمی نہیں جانا کیا.....؟“

”کون ہو تم.....؟“ فلک نے فوراً رپائی کیا۔

”اوہ..... کیا واقعی تم نے مجھے دیکھا ہی کیا اوہ میرے خدا..... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا میں تو سمجھا تھا شاید اپنی قسمت میں صرف انتظار ہی لکھا ہے شکر ہے یہ خاموشی کا جمود ٹوٹا تو سہی آئی ایم ویری پیپی۔“ اس اجنبی شخص نے پلک جھپکتے ہی رپلائی دیا تھا لیکن فلک کے سوال کا جواب نہ دیا تھا جس پر فلک مزید تپ گئی تھی اور

غصے سے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

”دیکھیں مسٹر ایکس..... وائے..... زی..... اور میرا قیمتی وقت ضائع مت کریں سیدھے سے بتا دیں کہ کون ہیں آپ اور کیا چاہتے ہیں مجھ سے.....؟ کیوں مسلسل مجھے اری میٹ کر رہے ہیں میں خاصی بد اخلاق اور بد لحاظ ہوں اس سے پہلے کے میں اس کا مظاہرہ کروں شرافت سے بتا دیں کہ یہ چیپ حرکت کرنے کا کیا مقصد ہے.....؟“

”دیکھیں میڈم! میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی میں ایک پڑھالکھا شریف انسان ہوں مجھے عام کر کے ہیں عام رضا میں نے آپ کو کچھ عرصہ قبل ایک شادی کے فنکشن میں دیکھا تھا آپ مجھے بے حد اچھی لگیں بہت مشکل سے آپ کا نمبر ٹریس کیا لیکن آپ نے بھی کوئی رسپانس نہیں دیا جس پر مجبوراً مجھے آپ کا پیچھا کرنا پڑا میرا جرم صرف یہ ہے کہ..... مجھے آپ سے محبت ہے۔“ میسج کا آخری جملہ پڑھ کر فلک کے ہاتھ لمحہ بھر کو لرزے تھے اپنی انیس سالہ زندگی میں پہلی بار اس نے صنف مخالف سے اپنے لئے ایسا جملہ سنا تھا اس نے خاموشی سے سیل فون ایک طرف رکھ دیا تھا بتا کوئی جواب دیئے۔

”اس منحوس نے بھی ابھی ہی باہر نکلتا تھا سارا موڈ خراب کر دیا۔“ دل ہی دل میں کڑھتی وہ اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی مگر وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے.....؟“ فلک کو اس کی اس حرکت پر بے پناہ غصہ آیا تھا۔

”میں تمہیں چھوڑ آؤں اکیڈمی تک.....؟“ وہ ڈھیٹ پن سے بولا تھا۔

”جی نہیں ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میں تم جیسے گھٹیا شخص کے ساتھ سفر کروں۔“ فلک نے بالآخر اپنا غصہ نکال ہی دیا تھا۔

”ارے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی کے ساتھ وقت گزارنا..... وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا تھا۔“

”اگر تم میری پچھو کے بیٹے نہ ہوتے تو اس وقت میں تمہارا منہ نوج لیتی میں صرف اور صرف اپنے ابو کی سہارا لحاظ کر رہی ہوں مسٹر خادری۔“ وہ ایک جملے سے اپنا بازو چھڑوا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

”فیروز کی کلر تم پر بہت چلتا ہے۔“ فلک جیسے ہی اکیڈمی سے گھر لوٹی تھی عامر رضا کا میسج اسے ریسیو ہوا تھا۔

”آخر تم ہوتے کہاں ہو میری اکیڈمی کے آس پاس تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔“ فلک نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں میسج ٹائپ کیا تھا۔

”ارے جناب! میں تو تمہیں دل کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہوں ویسے بھی محبت دل کا رشتہ ہے اور میرے دل کے تار تمہارے دل سے جڑے ہوئے ہیں تم کب کیا کرتی ہو کیا پہنتی ہو کہاں جاتی ہو سب کچھ مجھے محسوس ہو جاتا ہے۔“ میسج پڑھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی فلک کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی بہت سی دوسری عام لڑکیوں کی طرح اسے بھی یہ سب اچھا لگنے لگا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ عامر رضا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”بھلا چاہے جانا کسے برا لگتا ہے۔“

”اچھا جی..... تو اتنا یقین ہے تمہیں اپنی محبت پر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے عامر رضا کو رپلائی دیا تھا۔

”ہاں..... اس سے بھی زیادہ چاہو تو آزماؤ۔“ فوراً جواب آیا تھا۔

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ پیار میں آزما یا نہیں جاتا۔“ فلک نے سرشاری سی کیفیت میں جواب دیا تھا۔

”بالکل درست سنا ہے آپ نے جناب! لیکن میرا

یہ خیال ہے کہ جن سے پیار ہوا نہیں نہیں آزمانہ چاہئے مگر جو آپ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہوں انہیں آزما لینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور پیار تو مجھے ہے ناں تم سے تمہیں تو نہیں..... آئی ایم رائٹ.....؟“ فلک کا دل بری طرح دھڑکا تھا اس نے رپلائی دیئے بناء ہی موبائل سوچ آف کر دیا تھا۔

”فلک! یہ سب ٹھیک نہیں ہے ایک رائگ نمبر کے ساتھ اس قدر انچنٹ کہاں کی عقلمندی ہے یار اگر تمہارے والدین کو خبر ہوگئی تو کتنا برا ہوگا ان کا اعتماد اٹھ جائے گا تم پر سے تمہارا امیج خراب ہو جائے گا۔“ عروبہ نے اسے حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ارے عروبہ! وہ کوئی ایسا ویسا شخص نہیں ہے وہ ایک شریف اور باوقار انسان ہے جانتی ہو اس نے کبھی مجھے باہر ملنے پر فورس نہیں کیا ورنہ آج کل تو دوستی کے بعد پہلا مطالبہ ہی ملاقات ہوتی ہے وہ باقی مردوں سے بہت مختلف ہے۔“ فلک نے پوری طرح دفاع کیا تھا۔

”بہت بڑی بھول ہے تمہاری فلک شہزاد کے وہ باقی مردوں سے مختلف ہے مرد صرف وہی مختلف ہوتا ہے جس سے آپ کا خونی رشتہ ہو یا پھر شرعی اور قانونی طور پر جو آپ کی زندگی میں آتا ہے باقی سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور بہت جلد تمہیں اس بات کا ادراک ہو جائے گا۔“ عروبہ بات مکمل کر کے رکھ کر نہ تھی۔

”امی! ابو کب آرہے ہیں.....؟“ فلک نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

”بیٹا! دو چار دن مزید لگ جائیں گے انہیں کہہ رہے تھے بزنس ذیل کچھ لمبی ہوگئی ہے۔“ عالیہ بیگم

چائے کاسپ لیتے ہوئے بولیں۔
”ابو کے بناء گھر بہت دیران ویران سا لگتا ہے۔“
فلک ادا سے بولی تھی۔

”وہ تو ہے بیٹا! لیکن اب کام بھی تو ضروری ہے
نان اچھا تم ایسا کرو چائے پینے کے بعد یہ رقم اپنی پھپھو کو
دے آؤ تمہارے ابو نے مجھے فون پر بار بار تاکید کی تھی
کہ میں یہ رقم آج ہی ان تک پہنچا دوں۔“ عالہ بیگم نے
کچھ رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”امی! میرا بالکل بھی دل نہیں کرتا ان کے گھر کا
رخ کرنے کو۔“

”بری بات بیٹا! ایسا نہیں بولتے وہ پھپھو ہیں
تمہاری۔“ عالہ بیگم نے پیار سے اسے سمجھایا تھا۔
”امی! کیسی بہن ہیں وہ جنہیں صرف ابو کی دولت
سے پیار ہے نہ وہ آپ کی عزت کرتی ہیں نہ ابو کی قدر
کرتی ہیں پھر آپ اور ابو کو بھلا کیا پڑی ہے ان کی اتنی
فکر کرنے کی.....؟“ وہ جرح کر رہی تھی۔

”فلک بیٹا! ہر شخص کا اپنا کردار ہوتا ہے اپنی سوچ
ہوتی ہے اپنا عمل ہوتا ہے ہم صرف اپنی سوچ اور اپنے
عمل کے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں کسی دوسرے کے نہیں
اٹھو شاباش۔“ وہ پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے
بولیں۔

☆.....☆

فلک شہزاد اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی
اولاد تھی اسے زندگی میں ہر آسائش اور راحت میسر
تھی کوئی گلہ کوئی شکوہ نہ تھا اسے زندگی سے ہاں مگر
اپنے والدین سے اسے ایک اختلاف ہمہ وقت رہتا
اپنی پھپھو کی لالچ اور ان کے اکلوتے سپوت خاور علی
کی سرگرمیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں لیکن اس
سب کے باوجود شہزاد صاحب اور عالہ بیگم کا ان کے
لئے فکر مند رہنا اسے بری طرح کھولتا تھا خاور علی کا
باپ اشرف علی عالہ بیگم کا خالہ زاد تھا خاور علی کا
اور شہزاد صاحب کے توسط سے ہی اشرف علی کی شادی

شہزاد صاحب کی سوتیلی بہن ساجدہ بیگم سے ہوئی تھی
عالہ بیگم اور شہزاد صاحب کی شادی کے چند ماہ بعد
ساجدہ بیگم اشرف علی کے سنگ رخصت ہو گئی
تھیں عالہ بیگم اور شہزاد صاحب اس بات سے قطعی نا
واقف تھے کہ اشرف علی کا اٹھنا بیٹھنا غلط سوسائٹی میں
تھا وہ ڈرنک کا عادی اور بری صحبت کا شکار تھا اس
سب کا الزام ساجدہ بیگم سراسر اپنی بھانج اور سوتیلی
بھائی شہزاد تو قیر کو دیتی تھیں شادی کے ایک سال بعد
خاور علی کی پیدائش نے ساجدہ بیگم کو قدرے چپ کر دیا
دیا تھا جبکہ عالہ بیگم تا حال اس نعمت سے محروم تھیں اور
اس محرومی کو ساجدہ بیگم اپنی بددعا قرار دیتی تھیں لیکن
ان کے تمام تر خدشات اس وقت غلط ثابت ہوئے
جب 5 سال کے طویل عرصے کے بعد فلک نے آخر
عالہ بیگم کی گود بھر دی شہزاد صاحب اور عالہ بیگم کی
جان بھی کبھی پری میں تھی زندگی اپنے معمول کے
مطابق رواں دواں تھی کہ اشرف علی کی اچانک ڈیڑھ
نے ایک بھونچال مچا دیا اشرف علی نشے کی حالت میں
ایک پارٹی سے واپس آرہے تھے کہ ایک روڈ
ایکسیڈنٹ کی نظر ہو گئے ساجدہ بیگم اپنی زندگی کی تباہی
کا قصور وار تا حال شہزاد صاحب اور عالہ بیگم کو ہی سمجھتی
تھیں شہزاد صاحب اس تقدیر کے لکھے کو اپنے سر
ڈالتے ہوئے ساجدہ بیگم اور ان کے 15 سالہ بیٹے
خاور علی کو اپنے گھر کے ساتھ والے پورشن میں لے
آئے تھے وہ دن اور آج کا دن وہ ان کی ہر ضرورت
کا خیال رکھتے تھے خاور علی کو انہوں نے علاقے کی
نامور یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی بہن کی کڑوی
کیسی باتیں وہ کمال ضبط سے برداشت کر جاتے تھے
اور عالہ بیگم کو بھی اسی صبر کی تلقین کرتے ساجدہ بیگم کا
واحد چشم و چراغ خاور علی اپنے باپ کا ہی پرتو نکلا۔

☆.....☆

”فلک! میں کب سے تمہیں کال کر رہا تھا تم میری
کال کیوں نہیں پک کر رہی تھیں۔“

”بس یوں ہی دل نہیں کر رہا تھا۔“ فلک نے عامر
رضا کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب
دیا جبکہ دوسری طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

”ہیلو..... عامر! ہیلو..... میں..... میں مذاق
کر رہی تھی جب تمہاری کال آرہی تھی اس وقت امی
کمرے میں تھیں میرے پاس ایسے میں میں کیسے پک
کر سکتی تھی تمہاری کال پلیز ناراض مت ہوں۔“ فلک
اس کی خاموشی سے بری طرح بوکھلا گئی تھی۔
”مجھے ایک بات سچ بتاؤ فلک۔“ عامر رضا
قدرے توقف کے بعد بولا تھا۔

”ہاں..... ہاں پوچھو۔“ فلک ہمہ تن گوش ہوئی۔
”تمہیں مجھ سے محبت ہے.....؟“ وہ بہت آس
سے پوچھ رہا تھا جبکہ فلک سانس لینا تک بھول گئی تھی
باپ کے بعد وہ پہلا شخص تھا جسے فلک چپکے چپکے چاہنے
لگی تھی اسے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا محسوس
ہوتا تھا فلک شہزاد نے ان دو سالوں میں صدیوں کے
فاصلے طے کر ڈالے تھے گو کہ اس نے آج تک عامر رضا
کو دیکھا نہ تھا نہ کبھی ملی تھی دل لاکھ منتیں کرتا ملاقات
کے لئے پروہ اسے ایک ہی دلیل دیتی کہ محبت روح کا
رشتہ ہے جسم کا نہیں۔“ وہ عامر رضا کو بنا دیکھے بنا ملے
ٹوٹ کر چاہنا چاہتی تھی محبت کی منطق انوکھی تھی اس
کے نزدیک لیکن آج عامر رضا کے یوں صاف صاف
پوچھنے پر وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔
”جتنا تجھے چاہا ہے جتنا تجھے سوچا ہے
اس کے لئے ایک لفظ ”محبت“ کچھ بھی تو نہیں
ہے۔“

”عامر! میں نہیں جانتی۔“ ایک طویل سانس خارج
کر کے اس نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہہ کر کال
ڈسکنیکٹ کر دی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ عامر رضا
ڈس ہارٹ ہوا ہوگا۔

☆.....☆

عالہ بیگم کے کہنے پر فلک شام کا کھانا ساجدہ بیگم کو
رہتا ہوں تو تمہاری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں

دینے چلی آئی تھی دو دن سے ساجدہ بیگم کی طبیعت
خاصی خراب تھی عالہ بیگم خود ہی باقاعدگی سے کھانا اور
دوا دے آتی تھیں آج چونکہ شہزاد صاحب کے کچھ
دوست کھانے پر آرہے تھے تو انہوں نے فلک کو کھانا
دے کر بھیج دیا تھا۔

”پھپھو کہاں ہیں.....؟“ وہ اپنے سامنے خاور علی
کو دیکھ کر سخت بد مزہ ہو گئی تھی۔
”دوائی لے کر سو رہی ہیں..... بائے داوے تم نے
آج کس طرح ہمارے غریب خانے کو رونق بخش
ڈالی.....؟“ خاور علی اس پر نظریں گاڑے بولا تھا۔

”امی نے کھانا بھیجا ہے پھپھو جا گئیں تو یاد سے
انہیں بتا دینا میں کچن میں رکھ رہی ہوں۔“ وہ بمشکل
اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے بولی تھی۔ کھانا شلف پر رکھ
کر فلک پلٹی ہی تھی کہ خاور علی سے بری طرح ٹکرا گئی۔
”اندھے ہو کیا راستہ دو مجھے۔“ وہ تلملا گئی تھی۔

”جانے والے اپنا راستہ خود بناتے ہیں فلک بی
بی۔“ وہ بے حد قریب ہوتے ہوئے بولا تھا۔ فلک نے
پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

”جانے والے ایسی یادیں چھوڑ کر جاتے ہیں جو نہ
چھینے دیتی ہیں نہ مرنے۔“ اس کا اشارہ اس کے منہ پر
چھپی اپنی انگلیوں کی طرف تھا وہ نفرت سے اسے
پرے دھکیلتی تیزی سے باہر نکل گئی تھی خاور علی کا ہاتھ
انہی تک اپنے گال پر دھرا تھا اس کی آنکھیں ضبط کے
مارے لال انگارہ ہو رہی تھیں گویا کہ آنکھوں کی رگیں
پھٹ گئیں ہوں جیسے۔

☆.....☆

”فلک شہزاد! میں اچھی طرح جانتا ہوں تم میرے
جذبوں سے قطعی انجان نہیں ہو جو میں محسوس کرتا ہوں
ہو نہیں سکتا کہ وہ تم تک نہ پہنچتا ہو میرا دل اگر تمہارے
نام کے ساتھ دھڑکتا ہے تو تمہاری سانسیں بھی میرے
ہی نام کی مالا جیتی ہیں تمہیں دیکھنے کو اگر میں بے قرار
رہتا ہوں تو تمہاری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں

ہے میں نے تم سے محبت کی ہے اور..... اب شادی کرنا چاہتا ہوں، صرف تمہارا عامر رضا۔ فلک کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں وہ بار بار عامر رضا کا متحج پڑھ رہی تھی اسے اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ سے محبت محسوس ہو رہی تھی۔

”کتنا مخلص ہے یہ شخص کس قدر سچائی ہے اس کے الفاظ میں۔“ اسے رہ رہ کر اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی قرار دے رہی تھی جسے بنانا ملے ہی محبت مل گئی تھی آنسو در در بھر..... کچھ بھی تو نہ آیا تھا اس کے حصے میں پھر وہ خود کو کیونکر خوش قسمت نہ سمجھتی۔

”عامر! آئی ریلی لو!“ فلک شہزاد کے لبوں نے آہستگی سے جنبش کی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

”امی..... یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ.....؟“ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میں مر تو سکتی ہوں پر خاور علی سے شادی نہیں کر سکتی۔“ فلک بے حد مشتعل ہو رہی تھی وہ کالج سے لوٹی تو عالیہ بیگم نے ہی اسے ساجدہ بیگم کے متعلق بتایا جو کہ شہزاد صاحب سے فلک کو خاور کے لئے مانگنے آئی تھیں۔

”بیٹا! ہم نے آج تک تمہاری ہر خواہش کو پورا کیا ہے، خواہ اس کے لئے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑا، لیکن اس معاملے میں تمہارے ابو بہت مجبور ہیں وہ تمہاری اپنی بہن کو انکار نہیں کر سکیں گے میں جانتی ہوں خاور کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں، لیکن بیٹا شادی کے بعد وہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا اور دوسری بات یہ کہ تم ہمارے قریب ہماری نظروں کے سامنے ہی رہو گی۔“ عالیہ بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خاور علی کے لئے رضامند کر رہی تھیں اور ایسا وہ صرف اور صرف شہزاد صاحب کی خوشی کے لئے کر رہی تھیں۔

”امی! میں کچھ نہیں جانتی ایک اوباش شخص کے حوالے کر کے آپ میری بہتری کی امید رکھ رہی ہیں

نہیں..... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی ابو چاہیں تو میرا گلہ گھونٹ دیں، لیکن میں خاور علی کو ہرگز قبول نہیں کروں گی۔“ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو بری طرح رگڑتی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی اس خیال سے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ عامر رضا کو قبولیت کی سند دے دے دوسری تیل پر ہی عامر رضا نے کال پک کر لی تھی۔

”ع..... عا..... عامر.....“ فلک بری طرح رو دی تھی۔

”فلک..... فلک کیا ہوا.....؟ سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟ تم رو کیوں رہی ہو.....؟“ عامر بے چینی سے بولا تھا۔

”عامر! تم نے کل رات جو مجھے کہا تھا مجھے منظور ہے..... میں کورٹ میرج کرنے کو تیار ہوں میں صرف تمہاری ہوں پلیز.....“ وہ سیل فون ایک طرف پھینک کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں لئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی عامر نے فاتحانہ نظر موبائل پر ڈالی دو سال کی محنت بالآخر رنگ لے ہی آئی تھی۔

”ہر لڑکی محبت کی پیاسی ہوتی ہے کوئی دو بول اس کے ساتھ پیار کے کیا بول دے وہ دل و جان سے اس کی ہو جاتی ہے ماں باپ عزیز رشتے دار ہر ایک کی عزت کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے، لیکن فلک شہزاد..... تم تو میری..... سے بھی زیادہ بے وقوف نکلیں مجھے دیکھے بنا مجھ سے مے بنا میرے لئے اس قدر پاگل ہو گئیں، تق ہے یا تم پر۔“ عامر رضا کا رانہ مسکراہٹ کے ساتھ مسلسل گم تھا۔

☆.....☆.....☆.....

”خاور علی! تم ایک گھٹیا اور کمینے شخص ہو یہ تو میں روز اول سے جانتی ہوں، لیکن تم اس قدر ڈھیٹ اور ذلیل ہو گے اس بات کا اندازہ نہیں تھا مجھے، تم جیسے لوز کرکٹ کے ساتھ ”فلک شہزاد“ ایک بل بھی گزرا نا اپنی توہین سمجھتی ہے اور تم پوری زندگی بتانے کے خواب دیکھ رہے ہو۔“ فلک کی زبان آگ برسا رہی تھی وہ کالج سے واپسی

پر سیدھی خاور علی کے گھر گئی تھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور اسے آئینہ دکھانے۔

”میں لوز کرکٹ ہوں ایک گھٹیا، ذلیل، کمینے شخص ہوں، چلو ٹھیک ہے فلک بی بی! مان لیا اب ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم خود کو کس کیٹگری میں رکھتی ہو.....؟“ خاور علی اس کے بالکل سامنے آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

”میرے پاس تمہاری کسی بھی فضول بکواس کا جواب نہیں ہے میں صرف یہ کہنے کے لئے یہاں آئی ہوں کہ آئندہ پھپھو کو اس مقصد سے مت بھیجنا، دیش فائل۔“ وہ بے حد نڈر ہو رہی تھی۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے ٹھیک ہے میں امی کو اب نہیں بھیجوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم خود آؤ گی مجھ سے شادی کرنے۔“ خاور علی اس کے بے حد قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ کیا بے ہودہ پن ہے.....؟“ فلک چند قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”یہ کوئی بے ہودہ پن نہیں ہے یہ تو تمہاری حقیقت ہے فلک بی بی۔“ وہ عجیب سے انداز سے مسکرایا تھا۔

”کیسی حقیقت..... آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“ فلک شہزاد کو اس کی آنکھوں سے عجیب وحشت ہو رہی تھی نہ جانے کیوں اسے آواز کچھ شناسا خی لگ رہی تھی خطرے کے سائرن اس کے ذہن میں بجنا شروع ہو گئے تھے۔

”جانتا چاہتی ہو اپنی اصلیت.....؟“ خاور علی نے پل بھر میں اپنا موبائل اٹھایا تھا۔

”یہ رہے تمہارے سب میسجز..... ایک ایک میج تمہارا Save ہے یہ رہیں تمہاری ریکارڈ فون کالز جو تم اپنے ماں باپ سے چھپ کر رات رات بھر مجھے کرنی تھیں اور یہ..... یہ رہا تمہاری نظروں کے سامنے تمہارا عامر رضا میں ہی ہوں میری بے وقوف سی فلک..... اب پیو اپنی شرافت کا ڈھنڈورا۔“ خاور علی نے ایک بلند قہقہہ لگایا تھا فلک شہزاد کو آج صحیح معنوں

میں پتہ چلا تھا کہ پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جانا کسے کہتے ہیں موت سے پہلے موت کا آنا کیا ہوتا ہے وہی لہجہ تھا وہی آواز..... مگر یہ عامر رضا نہیں..... یہ تو..... یہ تو خاور علی ہے..... خاور علی تم نہیں۔“ فلک ہذیانی کیفیت میں چلائی تھی۔

”عامر رضا نہیں ہو سکتے خاور خدا کے لئے میرا سب کچھ لے لو مجھے جو جی میں آئے کہہ لو لیکن خدا کے لئے ایسا مت کہو کہ تم عامر رضا ہو۔“ فلک گھٹنوں کے بل اس کے پیروں میں بیٹھ گئی تھی۔

”سب کچھ ہی تو ٹوٹ گیا تھا مان..... بھروسہ..... انا..... خواب..... بری طرح توڑ پھوڑ ہو رہی تھی اس کے اندر..... محبت جیج رہی تھی چلا رہی تھی دل دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے فلک شہزاد! کہ اب کچھ بھی کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی اٹھو..... گھر جاؤ..... اور جا کر اپنے والدین کو بتاؤ کہ تم اس رشتے پر راضی ہو۔“ وہ بے حد سفاکی سے کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اس کے صبیح چہرے سے آنسو متواتر بہہ رہے تھے لمبی گھنیری پلکوں کے نیچے کالی سیاہ آنکھیں ماتم کناں تھیں گلابی خوبصورت تراشیدہ لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا وہ اپنے والدین کے اعتبار کا خون کرنے جا رہی تھی لیکن زندگی نے اسے ایسا دھوکہ دیا تھا کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گئی تھی قرآن پاک کی ایک آیت مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔

”بریں عورتوں کے لئے برے مرد ہیں اور پاکیزہ عورتوں کے لئے پاکیزہ مرد۔“

بے شک خدا بہترین فیصلہ کرتا ہے اس کی آنکھوں سے محبت اشکوں کی مانند بہہ رہی تھی کمرے کی ہر چیز اس کے ساتھ ماتم کناں تھی وہ تہی داماں گھر کی طرف لوٹی تھی۔

تھا زندگی

”پلیز چپ ہو جاؤ دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی قسمت کو جو منظور تھا وہ ہو گیا ہے جانے والے تو لوٹ کر نہیں آسکتے ناں، اگر تم خود روتی رہو گی تو بڑے پیامی کو کون سنبھالے گا انہوں نے اپنے



اکلوتے بیٹے کو کھویا ہے اب تم ہی انہیں سنبھال سکتی ہو اور کیا تم طلحہ بھائی سے کیا ہو ا وعدہ بھول گئی ہو جوان سے تم نے کیا تھا کہ تم طلحہ بھائی کے مہی پیا کا خیال رکھو گی، کیا تم طلحہ بھائی سے کیا ہو ا وعدہ نہیں نبھاؤ گی بتاؤ توڑ دو گی اپنا وعدہ؟“ زمین نے روتی ہوئی نگین کو چپ کرانے کی کوشش کی۔

”کیوں مانو میں اس کا وعدہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے کیا وہی تو کہتا تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا بتاؤ زمین کیوں توڑا اپنا وعدہ اس نے؟“

”دیکھو! جب زندگی نے ہی اسے مہلت نہیں دی“

تو وہ کیسے نبھائیں اپنا وعدہ۔“

”زندگی میں ایسا ہی کیوں ہوتا ہے جسے ہم سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں جنہیں کھونے سے ڈرتے ہیں وہ ہی ہم سے دور چلے جاتے ہیں کیوں زندگی ان سے بے وفائی کر جاتی ہے زندگی بے وفا کیوں ہوتی ہے زمین.....؟“ نگین زمین سے سوال کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی زمین اسے بے بسی سے روتے ہوئے دیکھتی رہی کہ اس کے سوا وہ کون بھی کچھ نہیں سکتی تھی کہ قسمت کا لکھا کوئی بدل نہیں سکتا۔



”السلام علیکم! ایسا کیا سوچا جا رہا ہے کہ آپ کو میرے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی، کیا میرے بارے میں سوچ رہی تھیں.....؟“ طلحہ نے مسکراتے ہوئے نگین کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ خلاف توقع طلحہ کو سامنے دیکھ کر نگین کھل اٹھی۔

”نہیں وہ تو میں بس۔“

”اچھا تو یہ تھی آپ کی اداسی کی وجہ جن کے آنے کے فوراً بعد ہی آپ کے چہرے کی رونق لوٹ آئی ہے۔“ زمین نے اچانک انٹری دیتے ہوئے نگین کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا، جس پر طلحہ نگین کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”اچھا جی! تو آپ اس لئے ہی اتنی گم ہوئی تھیں اپنے خیالوں میں۔“ طلحہ نے نگین سے پوچھا۔

”اور تم ہمیشہ غلط وقت پر ہی انٹری کیوں ہوتی ہو، کبھی تو ہمیں اکیلے میں بات کرنے کا موقع دے دیا کرو۔“

طلحہ نے اسے مصنوعی غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ذرا صبر کیجئے طلحہ بھائی! ہفتے بھر کی بات ہے پھر جتنی دل چاہے اکیلے میں بات کر لیجئے گا شادی کے بعد اوکے۔“

”تم لوگ بیٹھو میں پایا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ اس نے دیکھا کہ ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں تو وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی۔

”اوکے! جاؤ واپس آ جانا۔“ زمین نے کہا۔

”بھائی کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ نگین نے جب زمین کی گھبرائی ہوئی آواز سنی تو فوراً پلٹ کر دیکھا اور اپنی جگہ سے بھاگ کر فوراً طلحہ کے پاس آئی۔

”طلحہ..... طلحہ کیا ہوا آپ کو.....؟“ نگین نے سخت مضطرب ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے پوچھا جو شدت درد سے اپنے سر کو پکڑ رہا تھا۔

”طلحہ پلیز! بتائیے ہمت کیجئے طلحہ۔“ نگین نے روتے ہوئے طلحہ کو دیکھ کر کہا۔

”کچھ نہیں..... وہ.....“ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، نگین تو اپنی جگہ ساکت ہو گئی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”زمین! تم رکو میں ابھی پایا کو بلا کر لاتی ہوں۔“

نگین کہتے ہوئے جلدی جلدی پایا کے کمرے کی سائیڈ جانے لگی اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی طلحہ اور زمین کے ہنسنے کی آواز سن کر پلٹ کر دونوں کے مسکراتے چہروں کو بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ جو ہنستے ہوئے اس کے سامنے آ کر رک گئے۔

”اوں.....! تم تو واقعی میں ڈر گئیں! میں تو مذاق کر رہا تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر کیساری ایکٹ کرتی ہو اگر واقعی میں مجھے علم ہوتا کہ تم اتنا گھبرا جاؤ گی.....“ اس سے پہلے کہ طلحہ اپنی بات مکمل کرنا نگین روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی یہ دیکھ کر دونوں کے مسکراتے ہوئے لب ایکدم ٹھم گئے۔

☆.....☆

دن کے دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو سردرد کی وجہ سے پھٹ رہا تھا، رات بھر رونے کی وجہ سے آنکھیں بھی سوج گئی تھیں، طلحہ نے جو اس کے ساتھ مذاق کیا تھا اس کی وجہ سے دل بہت دکھا تھا، زمین نے بھی سوچی کہنے کے لئے بار بار دروازے کو ناک کیا تھا پر اس نے دروازہ نہ کھولا تو وہ مایوس واپس پلٹ گئی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے می! پتا گھر پر نہیں ہیں ورنہ میری سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر وجہ ضرور پوچھتے۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور شاور لینے چلی گئی۔

”ناراض ہو مجھ سے.....؟“ نگین جو شاور لینے کے بعد اپنے بالوں کو سکھانے میں مگن تھی، طلحہ کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو وہ اسے اپنی آنکھوں کے حصار میں لئے پوچھ رہا تھا، نگین نے حلق سے انا

رخ موڑ لیا اور کمرے سے باہر آ کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔

”پلیزنگی! جو مرضی سزا دو منظور ہوگی، لیکن پلیز ناراض مت ہو مجھ سے.....؟“ طلحہ نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے ہاتھی لہجے میں کہا۔

”میری ناراضی سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کیا لگتی ہوں میں آپ کی.....؟“ آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا، بہت شدت سے روتے ہوئے وہ بولی تو طلحہ کو بھی دکھی کر گئی۔

”سب کچھ..... میری سب کچھ تم ہی ہو تمہاری ناراضی سے مجھے اتنا سرور کا رہے کہ میں اسے سہہ نہیں پاؤں گا بالکل بھی نہیں۔“ وہ اسے شانوں سے تھام کر احساس بے بسی سے بولا تھا۔

”ہاتھ مت لگائیے مجھے..... نہیں..... چھوڑیں۔“ اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ آگے بڑھنے کو بھی کہ طلحہ نے سامنے آ کر جانے سے اسے روک لیا۔

”بس کرونگی! بس کرو جان نہیں سہہ پاؤں گا تمہاری یہ ناراضی مر جاؤں گا، قسم سے مر جاؤں گا۔“ اس کے سامنے کھڑے ہو کر سرگوشی نما الفاظ شکستگی میں ڈبو کر کہنے لگا اس کے ہر لفظ سے ٹھکن عیاں ہو رہی تھی، نگین کے رونے میں اور تیزی آ گئی۔

”ابنہا سے زیادہ برے ہیں آپ پہلے تکلیف دیتے ہیں پھر خود ہی مرنے کی بات کرتے ہیں۔“ نگین نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا سزا دو گی.....؟“ طلحہ نے اس کے مان جانے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”سزا کوئی نہیں پر اگر آج کے بعد ایسا مذاق کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، کبھی بات نہیں کروں گی میں آپ سے اپنی جان ہی ختم کر لوں گی۔“ اس کو دیکھتے ہوئے نگین نے وارن کیا تھا۔ اس کی بات پر طلحہ سنجیدہ ہو گیا۔

”ذرا سا روٹھ جانے پر اتنی خوشامد

وصی تم بگاڑو گے عادت ان کی“

زمین جو کب سے دروازے پر کھڑی دونوں کی باتیں ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی صبر نہ ہوا تو آخر کار انٹری دے ہی دی، دونوں زمین کے شعر کو سن کر مسکرانے لگے۔

☆.....☆

احمد آفس کا منیجر جو کسی کام سے آفس میں آیا تھا، طلحہ کو کراہتے ہوئے اور درد کی وجہ سے سر کو تھامتے دیکھ کر جلدی سے طلحہ کے پاس آیا۔

”کیا ہوا سر! آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ احمد نے فکر مندی سے پوچھا، طلحہ کوئی جواب دیتا کہ اس سے پہلے وہ اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے زمین پر گر کر دنیا سے بے گانہ ہو گیا۔

☆.....☆

”مما آپ رو کیوں رہی ہیں اور میں یہاں کیسے آیا.....؟“ طلحہ نے ہوش میں آتے ہی سب کو اپنے سامنے پا کر اور ممما کو روتے ہوئے دیکھ کر کہا، طلحہ اکلوتا بیٹا تھا اس لئے سب ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے، اس کے سوال پر اس کی ماں نے سارا واقع اسے بتا دیا جو آفس کے منیجر نے ہسپتال سے فون کر کے انہیں بتایا تھا۔

”اوہ ہو ممما! آپ سب لوگ تو ویسے ہی پریشان ہو رہے ہیں معمولی سا سر درد تھا جواب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے دیکھئے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ طلحہ نے ماں کو چپ کرواتے ہوئے کہا۔

”حد ہوتی ہے طلحہ! لا پرواہی کی بھی نہ دن کی فکر نہ رات کی، کھانے پینے کی بھی فکر کرنا چھوڑ چکے ہو اور نہ ہی آرام کرتے ہو پیسے کمانے کے لئے کم از کم انسان کو اپنی صحت کا تو خیال رکھنا چاہئے یہ کیا کہ کام ہی کرتے رہو طبیعت خراب نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔“ طلحہ کے مطمئن چہرے کو دیکھتے ہوئے آمنہ بیگم (طلحہ کی ماں) اس پر برس پڑیں۔

”پاپا پلیز! آپ ہی ماما کو سمجھائیے میں بالکل ٹھیک ہوں معمولی سا درد تھا جو ٹھیک ہو چکا ہے۔“ طلحہ نے اپنے والد کو مدد کے لئے پکارا۔

”سوری بیٹا! میں اس معاملے میں کچھ نہیں بول سکتا، آپ کی ماما ٹھیک بول رہی ہیں آپ کی شادی کو بھی صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے اور آپ پھر بھی آفس میں لگے ہوئے ہو۔“ ولید حسن (طلحہ کے والد) نے بھی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا، طلحہ ان کی آخری بات سن کر سامنے کھڑی نگین کو دیکھ کر مسکرانے لگا، نگین نے جب دیکھا کہ طلحہ کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں تو اس نے رخ موڑ لیا یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہے۔

ولید حسن اور نوید حسن دو ہی بھائی تھے ماں باپ کے انتقال کے بعد ولید حسن نے نوید حسن کو کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور باپ کا فرض پورا کیا ادھر آمنہ بیگم نے بھی نوید کو ماں جیسا پیار دیا، آمنہ بیگم نے اچھی سی لڑکی دیکھ کر نوید کی شادی کر دی، نفیسہ بیگم (نوید کی بیوی) نے گھر کی ذمہ داریوں کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیا، ایک سال بعد جب ولید حسن کے لڑکا پیدا ہوا اور نوید کے یہاں بیٹی ہوئی تو دونوں بھائیوں نے اور ان کی بیگم نے مل کر دونوں بچوں کو خوشی خوشی ایک بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا جس پر سب ہی خوش تھے، تینوں بچوں میں بہت محبت تھی کہتے کہ وہ دونوں بھائی الگ الگ رہتے تھے مگر تینوں بچے ایک ہی جگہ پائے جاتے تھے، ولید کے صرف ایک ہی بیٹا طلحہ جبکہ نوید کے صرف دو بیٹیاں تھیں نگین اور نرمین، تینوں بچے جیسے جیسے شعور کی زندگی میں قدم رکھتے گئے ان میں محبت بھی بڑھتی گئی جب نگین اور طلحہ کو بڑوں کے فیصلے کی خبر ہوئی تو دونوں بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ ان کے دل کی بھی خواہش تھی، جب نرمین کو پتہ چلا تو وہ تو

جبکے لگی کیونکہ وہ طلحہ کو اپنا بھائی مانتی تھی اور یہ ہی سوچتی رہتی تھی کہ پتا نہیں اس کی بھائی کیسی آئے گی وہ طلحہ کو بدل نہ دے لیکن اس کا یہ وہم بھی ختم ہو گیا، سب کی زندگی بہت خوشگوار طریقے سے چل رہی تھی مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ کبھی کبھی انسان کو ایسے حالات کا اچانک سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

”کیا ہوا نگی! میں کب سے تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں لیکن تم بات ہی نہیں کر رہی ہو کیا ناراض ہو مجھ سے؟“ نگین جو بچپن میں کچھ رکھنے آئی تھی طلحہ نے اکیلے دیکھ کر اسے روک کر پوچھا تو وہ رونے لگی۔

”کیا ہوا نگی! تم رو کیوں رہی ہو.....؟“ طلحہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”طلحہ! مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ زندگی ہم سے وفا نہیں کرے گی، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی طوفان آنے والا ہے جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا۔“ نگین نے اپنے دل میں چلتے ہوئے وہم طلحہ کو بتائے تو وہ مسکرانے لگا۔

”سب تمہارا وہم ہے کچھ نہیں ہوگا دیکھنا ہم سب بہت خوش رہیں گے، تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم سارے وہم بھول جاؤ گی۔“ طلحہ نے کہا۔

”یاد سے لے لینا۔“

”او کے باس لے لوں گا۔“ طلحہ مسکراتے ہوئے کہہ کر چلا گیا۔

دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گئی، نگین دہن بنی بہت پیاری لگ رہی تھی ہر کوئی دونوں کی جوڑی کو دیکھ کر سراپے بغیر نہیں رہ پاتا تھا، نگین کی رخصتی بہت دھوم دھام سے ہوئی، نگین دہن بنی طلحہ کے بیڈروم میں بیٹھی طلحہ کا انتظار کر رہی تھی آج پتا نہیں کیوں اسے بے چینی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”اب ہو گئے تمہارے سارے وہم ختم.....؟“ نگین اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی کہ طلحہ کی بات پر سامنے کھڑے مسکراتے ہوئے طلحہ کو دیکھنے لگی۔

”نگی! آج تمہارے سارے وہم ختم ہوئے کہ نہیں بتاؤ مجھے.....؟“ طلحہ نے نگین سے پوچھا۔ تو وہ خاموش رہی کہ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے تب ہی طلحہ بولا۔

”میں تمہیں کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑوں گا نگی! تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا، میں تمہیں زندگی کی.....“ طلحہ کچھ اور بھی کہتا کہ بڑھتے ہوئے سر کے درد نے اسے کچھ بولنے ہی نہ دیا اور وہ سر کو بری طرح تھام کر کرا بنے لگا۔

نگین نے جب دیکھا کہ طلحہ کو بہت زیادہ درد ہو رہا ہے تو بڑے مہم پیہا کو آواز دینے لگی سب کو بلانے کے لئے باہر جانے ہی لگی تھی کہ طلحہ کے گرنے کی آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو طلحہ کو بے ہوش دیکھ کر اپنی جگہ ساکت ہو گئی، طلحہ کو اس حال میں دیکھ کر زور زور سے سب کو آواز دے کر بلانے لگی اور طلحہ کو بلانے لگی کہ شاید وہ ہوش میں آجائے لیکن طلحہ کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی اتنے میں سب ہی کمرے میں آ گئے اور فوراً طلحہ کو ہسپتال لے کر جانے لگے۔ لیکن ہسپتال میں جب ڈاکٹر نے انہیں یہ خبر سنائی کہ طلحہ کو برین ٹیومر تھا

جس کا لاسٹ اسٹیج تھا۔

”ہم اپنی کوششوں کے باوجود اسے نہیں بچا سکے آئی ایم سوری۔“ یہ خبر سن کر سب کو ایسے لگا جیسے ان سب کے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین چھین لی ہو اور روتی ہوئی نگین یہ خبر سن کر بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی اس کے بعد اس کو کوئی ہوش نہ رہا اس کے بعد اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ طلحہ کو گھر کیسے لے جایا گیا کیسے اسے اس کے آخری سفر پر رخصت کیا گیا، پورے دس دن بعد اسے ہوش آیا تھا لیکن ہوش آنے کے بعد بھی نہ وہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں سب نے اسے رلانے کی کوشش کی پر اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا۔

”تم نے تو وعدہ کیا تھا ناں کہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گے پھر تم نے اپنا وعدہ کیسے پورا نہیں کیا تم تو میری آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے آج دیکھو میرے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے پلیز طلحہ واپس آ جاؤ اپنی نگی کی خاطر۔“ نرمین جو نگین کو کھانا کھلانے کے لئے کمرے میں آ رہی تھی نگین کو روتے اور شکوہ کرتے دیکھا تو اس کی بھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے نرمین جو طلحہ کو اپنا بھائی سمجھتی تھی ایک طرف بھائی کا غم تو دوسری طرف بہن کی حالت کو دیکھ کر بالکل ہی مڈھا ہل ہو گئی۔

”کاش..... طلحہ بھائی آپ نے اپنی بیماری کو معمولی نہ سمجھا ہوتا تو آج آپ ہمارے ساتھ ہوتے۔“ اکثر ہم اپنی بیماری کو معمولی سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے ہماری موت کا سبب بنتی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پیاروں کو بھی دکھی کر جاتی ہے اگر لوگ اپنی بیماریوں کو معمولی سمجھ کر فراموش نہ کریں تو یہ ان کے فائدے کا سبب ہی بنتی ہے نہ کہ نقصان کا۔

عابدہ سبین

مکمل ناول

قہار بن نہیں رہنا

آج پھر جب وہ ماما سے ملنے آیا تو اسے وہاں موجود دیکھ کر اس کے ماتھے پر کتنی ہی شکنیں درا آئیں تھیں، اس کے وجود کو قطعی انور کرتا وہ ماما کے سر ہانے آکھڑا ہوا۔



”گڈ ایوننگ ماما! اب کیسا فیل کر رہی ہیں؟ حالانکہ اس کا مسکرا نے کا موڈ بگڑ گیا تھا، مگر پھر بھی ماما کے خیال سے اس نے زبردستی مسکرا ہٹ لبوں پر سجائی۔

”بہت بہتر فیل کر رہی ہوں مائی سن!“ ماما نے بھی اسے اسٹائل کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”او کے آئی! میں چلوں، آپ کو ضرورت ہو تو پلیر ضرور بلوا لیجئے گا، میں پھپھو کے پاس ہوں۔“ سحاب نے اپنے انڈی نرمل لہجے میں کہا تھا اور پھر اٹھ کر روم سے نکل گئی۔

”بھینکس!“ از میر نے شکریہ ادا کیا پھر ماما سے مخاطب ہوا۔

”ماما! یہ کیا مصیبت گلے میں ڈال لی ہے آپ نے، جب بھی آؤ اس کی شکل دیکھو، کیا ضرورت ہے آپ کو اس طرح کے لوگوں کو منہ لگانے کی؟“

”از میر! نئی بات بچے! کیسی بات کر رہے ہیں آپ، وہ تو اتنی معصوم اور پیاری بچی ہے، سارا دن تم نہیں ہوتے تو وہ میری کیئر کرتی ہے، حالانکہ کیا رشتہ ہے اس کا اور میرا، صرف انسانیت کا ناں اور وہ اپنی پھپھو کی کیئر کے لیے



ہاسپٹل میں ہے، مگر مجھے ہر منٹ کے بعد پوچھنے آتی ہے۔
 ”ارے ماما! آپ نہیں جانتیں لوگوں کو، محض آپ کی نرم مزاجی اور سادہ طبیعت کا فائدہ اٹھا رہی ہے وہ، پلیز آپ احتیاط برتا کریں، آج کل کے حالات سے واقف ہیں ناں آپ، کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے ہم۔“
 ”یہاں ہاسپٹل میں میرے ماتھے پر نہیں لکھا تھا کہ میں ”حیدر اینڈ کوانٹر پرائز“ کے اونر کی ماں ہوں از میر! اور میں نے اتنی زندگی گزاری ہے، اچھے بُرے انسان کی پہچان رکھتی ہوں میں بھی، میں کسی کے خلوص کو تمہاری طرح دھتکار نہیں سکتی۔ ماما! امان گئیں تھیں، وہ مزید بحث کے بجائے خاموش ہو گیا۔“
 ”اوکے، جیسے آپ کی مرضی۔“

”اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، کب جاؤں گی میں گھر؟ میں تنگ آ گئی ہوں بیٹا!“
 ”ماما! ایک دو دن مزید لگ جائیں گے، بہت کمزوری ہے آپ میں، پلیز آپ میری خاطر برداشت کر لیں۔“
 ”چندا! مجھے لگتا ہے کہ ہاسپٹل میں رہ کر میری طبیعت مزید خراب ہی ہوگی، مجھے یہاں کے ماحول میں لحد بھر کا سکون نہیں آتا، اگر سحاب نہ ہوتی تو شاید میں کب کی مر جاتی یہاں۔“
 ”ماما پلیز! اس طرح مت کہا کریں، آپ جانتی ہیں ناں کہ میں!...“ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ اُن کو لے کر وہ کس قدر حساس ہے، اتنی بھری دنیا میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سب کچھ تھے۔

”اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے ماما! ایسی باتیں مت کیا کریں، آپ کے سوا ہے کون میرا؟“
 ”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ شادی کر لو، بیوی بچے ہو جائیں گے تو تمہاری اور میری دونوں کی تنہائی دور ہو جائے گی۔“

”ہاں، جیسے سمیر بھیا کی ہو گئی تھی، ماما! پلیز آئی ہیٹ وِس ٹاپک، ایک تجربہ کافی نہیں تھا آپ کے لیے؟“ اس کے لہجے میں تلخی اُتر آئی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی ویسی ہو، اچھی بُری ہر طرح کی لڑکیاں ہیں، بس سمیر کے ساتھ جو ہوا، وہ شاید ہمارا نصیب تھا۔“

”مگر میں محض نصیب کا لکھا سمجھ کر سب فراموش نہیں کر سکتا، مجھے نفرت ہے لڑکیوں سے اور یہ بات آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔“

”از میر! تم ساری عمر تنہا کیسے گزارو گے؟“

”اوہ گاڈ! ماما پلیز! یہ باتیں کرنے کے لیے ہم انتظار کر سکتے ہیں، ایک عمر پڑی ہے، آپ کم از کم ہاسپٹل میں تو اس ٹاپک کو کلوز کر دیں۔“ وہ مسکرا دیں، سچ ہی تو کہہ رہا تھا، گھر پر بھی جب وہ میسر آتا اپنی بے جا مصروفیت سے اگر کبھی وقت نکال لیتا، تو وہ اس بحث کو لے کر بیٹھ جاتیں اور از میر اُکتا کر موڈ خراب کر کے اُٹھ جاتا، وہ اتنا روڈ تھا نہیں، مگر اس کے ساتھ حادثہ ہی ایسا پیش آیا تھا کہ وہ ہر انسان سے اپنا اعتبار کھو بیٹھا تھا، یہ بات وہ سمجھ سکتی تھیں، صدمہ تو ان کے لیے بھی چھوٹا نہیں تھا، از میر نے اگر اپنا بھائی کھویا تھا تو انہوں نے اپنے جوان بیٹے کی موت کا درد اپنے دل کے اندر کہیں چھپا رکھا تھا، از میر کے خیال سے وہ بظاہر سب بھول چکی تھیں، مگر کیا ایک ماں کے لیے جوان اولاد کی موت بھول جانا ممکن ہے؟ وہ بھی حادثاتی موت نہیں، سوچی سمجھی پوری پلاننگ کے ساتھ دی جانے والی موت۔

آج وہ ڈسچارج ہو رہی تھیں، سحاب ان سے ملتے ہوئے رو پڑی تھی۔

”میں نے بہت کم لوگ دیکھے ہیں آپ جیسے، بے غرض اور پُر خلوص، اور آنٹی میں آپ کو عمر بھر نہیں بھول پاؤں گی، آپ بہت اچھی ہیں، پلیز! اپنا خیال رکھا کریں۔“

”یاد تو تم بھی مجھے بہت آؤ گی، اس زمانے میں اتنی سادگی اور اتنے اچھے اخلاق کی مالک بچی ملی ہو تم مجھے، ورنہ اس نئی نسل پر سے میرا اعتماد ختم ہو چکا ہے سحاب! مگر ان چند دنوں میں تم سے مل کر مجھے لگا کہ ابھی اچھے لوگ باقی ہیں، تمہارے ماں باپ جیسے، جنہوں نے تمہیں اتنے اچھے اقدار دیئے، تمہاری اعلیٰ تربیت کی۔“

”تھینک یو سوچ آنٹی! مگر وہ ماں باپ مجھے اس بُرے زمانے کے سپرد کر گئے، تنہا چھوڑ گئے، اپنی دے، آپ مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دیں گی؟ کبھی دل چاہا تو آپ سے لمحے دو لمحے کے لیے بات کر لیا کروں گی، آئی نو، آپ کے بیٹے کو یہ اچھا نہیں لگے گا، مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر آنے والی نفرت اور غصہ میں دیکھ چکی ہوں، مگر پھر بھی۔“

”ارے تم از میر کے روڈ بی بیویز کو پلیز دل پر مت لینا، وہ اپنی عادت سے مجبور ہے اور بس۔“ انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے تھے پھر اسے اپنا سیل فون نمبر دے دیا، وہ از میر کے خیال سے جلدی سے آنٹی سے نمبر لے کر انہیں اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے پھپھو کے پاس آ گئی، مگر راستے میں ہی وہ بد اخلاق انسان اسے ٹکرا گیا، جسے قطعی انور کرتی وہ آگے بڑھی تھی، اس شخص کی آنکھوں میں جو نفرت اسے اپنے لیے نظر آتی تھی وہ سحاب کو جانے کیوں خوفزدہ کرتی تھی، حالانکہ اس نے تو از میر حیدر کا بکاڑا بھی کچھ نہیں تھا، صرف آنٹی کے ساتھ وہ کچھ وقت گزار لیتی تھی۔ ہاسپٹل کے اس ماحول میں اس کی گھٹن کم ہو جاتی تھی، اپنی طرف سے تو وہ آنٹی کے ساتھ اچھا ہی کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی، جانے ان کے بیٹے کو یہ بات کیوں پسند نہیں تھی؟ خیر! اب تو قصہ ہی ختم ہو گیا تھا، آنٹی اپنے گھر جا رہی تھیں اور کل پھپھو کو بھی چھٹی مل جانی تھی، وہ پھپھو کے بیڈ کے پاس بیٹھی ان کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ ان کی آواز نے چونکا دیا۔

”سحاب! تم خاموش ہو!“

”نہیں پھپھو! بس وہ...“

”مجھے پتہ ہے تم آکٹا جاتی ہو، دل چاہ رہا ہے تو گھر ہواؤ، میں رہ لوں گی کچھ دن تنہا۔“

”ارے نہیں پھپھو! صبح تو آپ ڈسچارج ہو جائیں گی، بس آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ وہ مسکرا دی، پھپھو اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور خلوص خاموشی سے دیکھنے لگیں، اپنی تلخی بہت کم ہو چکی تھی، مگر اپنے خاوند کے روکے رویے کی وجہ سے جب وہ سحاب کو اداس دیکھتی تھیں، تو بہت دلی دکھتا تھا، اگر سحاب کا کوئی اور آسرا ہوتا تو وہ اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول میں نہ رکھتیں، مگر ان کے ساتھ ساتھ سحاب کی بھی مجبوری تھی ان کے ساتھ رہنا، مگر اب تو اس بے چاری نے ہلڈ روز کی اس بحث سے ہار کر پرائیویٹ اسکول میں لکری کر لی تھی، تین ہزار میں بننا تو کچھ نہیں تھا مگر اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ پھپھو کو مزید پریشان نہ کرے، اس وجہ سے جو ہر وقت پھپھو کو باتیں سننا پڑتی تھیں وہ کچھ کم تو ہوں، وہ ساری سیلری پھپھو کو دے دیتی تھی، اور شام میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے جو رقم ملتی وہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے رکھتی تھی، یوں کم از کم گھر میں قدرے سکون ہو گیا تھا، لیکن پھپھو اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”ایسا کب تک چلے گا از میر! تم میری وجہ سے ذرا بھی ریٹ نہیں کر سکتے، یہ بات مجھے بہت تکلیف دیتی ہے۔“

”ماما! میں فل ٹائم لیڈی آپ کے لیے رکھنا چاہتا ہوں، مگر مجھے کوئی بھی قابل اعتبار نہیں مل رہی، میں ریسک نہیں

لے سکتا۔

”تم اپنے دوست ڈاکٹر حماد سے بات کرو، وہ کوئی نرس....“

”مما! نرس صرف آپ کو میڈیکل ٹریٹمنٹ دے گی، تھراپی وغیرہ کرے گی، مگر میں ایسی کوئی لیڈی چاہتا ہوں جو دن رات آپ کا خیال رکھے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ تو مفلوج ہی ہو کر رہ گئی تھیں، بنا سہارے کے چلنے سے بھی محتاج، اور کھانے سے بھی، ایسے میں واقعی انہیں ہمہ وقت کے لیے ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مکمل طور پر ان کا دھیان رکھے، ساتھ ہی ان کی ایکسرسائز میں بھی ہیلپ کرے، از میرا کیلا کیا کیا کر سکتا تھا، وہ بھی انسان تھا، صبح وہ اکثر ان کی وجہ سے لیٹ ہو جاتا اور پھر رات بھر ان کے پاس رہتا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔

”از میر! ایسی ایک لڑکی ہے میری نظر میں، جو نہ صرف میرا پورا خیال رکھ سکتی ہے بلکہ مجھے اس پر مکمل بھروسہ بھی ہے۔“

”کون ہے ممما! وہ؟“

”سحاب!“ ان کے منہ سے نکلا نام سن کر از میر کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”مما! مجھے پہلے ہی شک تھا وہ معصومہ بی بی آپ کو اپنی سادگی کے جال میں جکڑ چکی ہے، ممما! کیوں ایک بار پھر آپ دھوکہ کھانا چاہتی ہیں؟“

”نیو از میر! اس بار دھوکہ تم کھا رہے ہو، وہ ایسی نہیں ہے، بہت بے غرض اور خلوص سے بھرادل ہے اس کا، یقین کرو وہ بچی اتنی نیک فطرت ہے، بھلا ہاسپٹل میں اسے میری ذات سے کیا لالچ تھا جو وہ میری اتنی کیڑ کرتی تھی؟“

”یہ لالچ کم تھا کہ اس نے اپنی اس چالاکی سے آپ کے گھر راستہ استوار کر لیا؟“

”قصورتہمارا نہیں ہے میرے بچے! مگر پلیز! ہر انسان کو ایک نظر سے دیکھنا چھوڑ دو، جو ہمارے ساتھ ہو چکا وہ بھولنا میرے لیے بھی آسان نہیں، مگر اگر ہم انسانیت سے اپنا اعتبار کھودیں گے تو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے گا، اگر بڑے لوگ ہیں یہاں تو اچھے بھی ہیں، جن کی اچھائی اور نیکی کی وجہ سے انسانیت قائم ہے، فارگاڈ سیک از میر! خود کو یوں تنہامت کرو میرے بچے!“

”اگر آپ کو اس پر اتنا بھروسہ ہے تو بلو ایجنے اسے، مگر کل کو اگر کچھ ہوا تو....“

”میں اس کی گارنٹی لیتی ہوں، تم بس ایک بار مجھے اس کے گھر لے چلو۔“

”مما! میں کیا جانوں کہ....“

”اوکے۔“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا تھا، انہیں یاد آ گیا کہ جب سحاب نے ان سے فون نمبر لیا تھا تو اپنا نمبر بھی دیا تھا، انہوں نے اپنے موبائل کو نیٹک نمبرز چیک کیے اور اگلے پل وہ سحاب کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم!“ ان کی کال ریسپونڈ کرتے ہی خوبصورت آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

”وعلیکم السلام! تم سحاب ہو ناں؟“

”جی، مگر آپ....؟“

”ارے اتنی جلدی بھول گئیں، تم تو کہتی تھیں آنٹی میں عمر بھر آپ کو یاد رکھوں گی۔“ اتنا بیٹھا لہجہ تھا، وہ فوراً پہچان گئی۔

”آنٹی جی! کیسی ہیں آپ؟ آئی ایم سوری، میں آپ کی آواز سے آپ کو پہچان نہیں پائی۔“

”اس اوکے میری جان! اچھا میرا بڑا سن کر رہا ہے تم سے ملنے کو، مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ گی؟“

”ریلی آنٹی! آپ میرے گھر آئیں گی؟“ وہ بہت ایکسانڈ تھی، اس نے انہیں اپنا ایڈریس دیا اور وہ شام میں ہی

ان کے گھر تھیں، از میر حیدر کے ساتھ، آف کورس اس کا آنا ضروری تھا، بی کو زوہ اکیلے نہیں آ سکتی تھیں، انہوں نے جب اس کی پچھو اور پچھا سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو، پچھا اتنے خوش ہوئے کہ ان کے سر سے بوجھ ہٹ رہا ہے، مگر پچھو تذبذب کا شکار تھیں، بالکل غیر اجنبی لوگوں کے حوالے وہ اپنی جوان بچی نہیں کر سکتی تھیں، یہ کون سا اعتبار کا زمانہ تھا، ان کی نظرس بار بار از میر تک جا کر پلٹ جاتیں، وہ شاید ان کی نگاہوں کا مطلب پڑھ چکی تھیں۔

”بے فکر رہیں بہن! سحاب میری بیٹی کی طرح رہے گی، اس کی عزت آبرو ہماری عزت آبرو ہے، میرا یقین کریں، آپ کی بچی میرے گھر میں بالکل محفوظ رہے گی، میری مجبوری سمجھ لیں، میں کسی غیر پر اعتبار کر کے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی، سحاب پر میرا بھروسہ ہے۔“

”ہم غریب ہیں آپاجی! مگر اس طرح کی نوکری کی اجازت.... وہ بھی جوان بچی کو؟“

”اوہو.... وہ کہہ تو رہی ہیں کہ وہ خیال رکھیں گی سحاب کا۔“

”مگر میرا دل نہیں مانتا، میں اپنے مرحوم بھائی کو کیا جواب دوں گی کہ میں ان کی ایک آخری نشانی کی بھی حفاظت نہ کر سکی، اپنے گھر میں جگہ نہ دے سکی۔“

”ارے، اس گھر میں جگہ ہے کب؟ اب تیرے بھائی بھادج خزانے چھوڑ نہیں مرے، جو ہم نے ان کی بچی کا ٹھیکہ لے لیا ہے، اپنے بچے پالنا مشکل ہیں اس دور میں، اوپر سے یہ مفت کا خرچہ۔“

”کب بوجھ بنی ہے وہ تجھ پر؟ نوکری کرتی ہے، ساری تنخواہ تیرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے، شام میں بچوں کو پڑھا کر اپنا خرچ نکالتی ہے، مفت میں دو وقت کی روٹی تک نہیں کھاتی وہ تیری۔“

”پلیز پچھو! بحث نہ کریں، میرے نصیب نہیں بدلیں گے، آپ کے بحث کرنے سے۔“ اس نے پچھو کے کندھے پر ہاتھ دھرا، پھر بمشکل آنے والے آنسو اندر لیے تھے۔

”آنٹی! میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔“

”سحاب....!“ پچھو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے ملنے آتی رہوں گی، پلیز پچھو!“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا، آنٹی اور از میر کے سامنے یہ حقیقت لانا وہ کبھی نہیں چاہتی تھی، مگر اب تو وہ سب جان چکے تھے، تو وہ نظرس اٹھانے کے قابل بھی نہ رہی، اس نے اپنا ضروری سامان بیگ میں ڈالا اور پندرہ منٹ بعد وہ ان کے ساتھ جانے کو تیار تھی، گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے آخری نظر اس بوسیدہ دو

کمروں کے مکان پر ڈالی تھی، جس مکان نے بڑے وقت میں اسے آسرا دیا تھا، پھر چہرے پر پھیلنے والے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے، وہ جس احساس اور کیفیت سے گزر رہی تھی اس کے پیش نظر اس وقت گاڑی میں صرف خاموش تھی، اور اس کے خاموش آنسو جو روکنے کے باوجود بھی جانے کیوں اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

کئی دن لگے تھے دل کا بوجھ ہلکا ہونے میں، بھلا کب سوچا تھا اس نے کہ زندگی اسے یہ وقت بھی دکھائے گی کہ دنیا میں وہ بے آسرا ہو کر رہ جائے گی، سگی پچھو کے ہوتے ہوئے وہ غیروں کے سہارے تھی، آنٹی نے اسے محبت سے سمجھایا، بہت مان دیا، اپنے ہونے کا احساس دلایا، مگر یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی تھی ناں کہ وہ کچھ بھی کرتے اس کے کبھی اپنے نہیں کہلا سکتے تھے اور نہ ہی وہ ان کو اپنا کہہ سکتی تھی، سحاب نے وقت اور زندگی دونوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا، مقدر کا لکھا سمجھ کر ہر حقیقت قبول کرنے کی کوشش کر ڈالی تھی، اس نے اپنے لیے اپنے آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور خود کو مقدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ از میر حیدر کی سردنگا ہیں جن میں سوائے تنفر کے اور کچھ نہ تھا، اسے شاید یہاں بھی

زندگی کو سہل نہیں سمجھنے دیں گی، وہ اب بھی کہتا کچھ نہ تھا مگر وہ جب بھی سامنے آتا تو صرف پل بھر کے لیے ہی سہی سحاب کو اپنا وجود پستی میں اترتا محسوس ہوتا، جانے وہ کیا سمجھتا تھا اسے، جانے کون سی غلطی ہوئی تھی اس سے، وہ بے خبر تھی، مگر از میر کا رویہ اسے بہت شرمندہ کر جاتا تھا کہ وہ اب ان پر بوجھ بن گئی ہے، اس سب کے باوجود وہ آنٹی کی دیکھ بھال دل و جان سے کرتی تھی، دن رات ایک کر کے حتیٰ کہ آنٹی خود کہہ کہہ کر تھک جاتیں ”سحاب! کچھ دیر آرام کر لو“۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئی ہے، سو پوری ایمانداری سے وہ ڈیوٹی انجام دیتی، آنٹی کی ہر ضرورت کے علاوہ کچن بھی اب اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا، اس گھر میں ملازم کے نام پر صرف رحیم بھائی تھے، جو گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، حتیٰ کہ کچن بھی، مگر سحاب کے آنے سے انہیں بھی بہت ریلیف ملا تھا، وہ بہت قدر کرتے تھے اس بچی کی، دعائیں دیتے نہ تھکتے، صرف ایک ماہ میں از میر حیدر کے علاوہ ہر چیز، ہر شخص اس کا عادی ہو چکا تھا، اور آنٹی میں آنے والی امپروومنٹ بھی قابل ستائش تھی۔ بے شک از میر نہ مانتا مگر یہ سچ تھا کہ وہ بہت اپنے پن اور خلوص سے مہم کی خدمت کرتی تھی، ان کا دھیان رکھتی تھی، یہی وجہ تو تھی آج وہ مہم کو خود اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا، جن کا دایاں ہاتھ ہلتا نہیں تھا، یہ سحاب کی محنت اور توجہ کا کمال تھا، مہم کی تھراپی، میڈیسن انہیں ہر چیز ٹائم پر ملتی تھی کہ وہ صرف مہم کو دیکھنے جاتا تھا، ان کی فکر نہیں ہوتی تھی اب اسے، پھر مہم کے چہرے پر اب ہر لمحہ مسکراہٹ نظر آتی، اداسی، مایوسی، دکھ نہیں، ان کی صحت بھی بہت بہتر ہو گئی تھی۔

”آئی ایم سوپہی مہم! آج آپ کو کھانا خود سے کھاتے دیکھا تو بلیومی، بہت اچھا لگا، جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہو۔“
 ”دیکھاناں سحاب کی محبت اور توجہ کا رزلٹ؟“ اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے، کچھ کہنے کو لب ہلے تھے، مگر مہم نے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”تم اس کی اچھائی اور محنت کو سراہ نہیں سکتے تو فارگا ڈسک! کچھ ایسا ویسا بھی مت کہنا کہ مجھے دکھ ہو۔“
 ”مے بی، یہ ان کا کریڈٹ کیا ہوا کوئی ڈرامہ ہو؟“

”مجھ سے وعدہ کرو از میر! کہ تم سحاب کے لیے اچھے الفاظ نہیں کہہ سکتے تو بُرے بھی مت کہا کرو، میری تم سے ریکوریٹ ہے کہ پلیز! اس بچی کو کبھی ایسے لفظ مت کہنا کہ وہ ہرٹ ہو جائے، ورنہ تمہاری مہم کو اس کے دل سے زیادہ اپنا دل ٹوٹا محسوس ہوگا۔“

”آپ اتنا ٹرسٹ کرنے لگی ہیں اس پر؟“

”ہاں، بالکل اتنا ہی اعتبار کرتی ہوں میں اس پر، جتنا کہ مجھے تم پر ہے۔“ ان کے مضبوط اور ٹھوس لہجے نے اسے خاموش کر دیا۔

”لیجئے آنٹی! دودھ اور آپ کی میڈیسن جلدی....“ وہ جس تیزی اور جوش سے اندر آئی تھی، اتنی ہی جلدی سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، سامنے از میر حیدر کو دیکھ کر، از میر نے حسب عادت ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”چہرے سے جس قدر معصوم و سادہ نظر آتی ہے اتنی ہے نہیں، مہم کو ایک دن ضرور یقین آئے گا میری بات پر۔“ اس کی سوچ زہر آلود تھی، پل بھر کو ٹھہرا وہ سحاب کی موجودگی میں، پھر باہر نکل گیا۔

”سحاب! ادھر آؤ میرے پاس۔“ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ گئی، دودھ کا گلاس ٹیبل پر دھرا انہیں میڈیسن دیں، پانی کا گلاس پکڑا، یہ تمام امور بہت چپ چاپ انجام دیئے تھے اس نے، پھر وہ اٹھ گئی، کچن کا کام سمیٹا اور باہر کے تمام کام ختم کر کے جب وہ زہرہ حیدر کے پاس لپٹی تو اس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی ٹھہرا تھا، ان کا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر پر ٹھہرا تھا، پھر وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چاٹنے لگیں۔

”میں سمجھتی ہوں بچے! از میر کی چبھتی نظریں، سر اور روکھا انداز تمہیں اندر کا شتا ہے، تم بنا کسی غلطی کے اس کے سامنے مجرم بن کر کھڑی ہو جاتی ہو، وہ ایسا ارادہ نہیں کرتا، بس وہ مجبور ہے، اس کا عورت ذات سے اعتبار بہت بُری طرح ٹوٹا ہے، اور جوان بھائی کی موت نے اسے توڑ دیا ہے، وہ جو تمہیں اسٹون مین دکھائی دیتا ہے ناں سحاب! ایسا ہے نہیں، وہ بہت بکھرا ہوا ہے، اندر سے خوفزدہ ہے، یہی خوف تو ہے جو اسے تم پر اعتبار نہیں کرنے دیتا، تمہاری ہر اچھائی وہ ڈر کھا جاتا ہے۔ ان کی الجھی باتیں اسے بھی الجھا گئی تھیں، اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تو ان کا چہرہ درد کی داستان بنا ہوا تھا۔

”از میر میرا اکلوتا بیٹا نہیں ہے بلکہ چھوٹا بیٹا ہے، میرا بڑا بیٹا میر حیدر تھا، باپ کے انتقال کے بعد تمام بزنس وہ بہت احسن طریقے سے چلا رہا تھا، از میر ان دنوں ملک سے باہر تھا، اپنی اسٹڈی کے سلسلے میں، میر بہت زندہ دل بچہ تھا، وہ بہت نرم طبیعت اور نرم دل رکھتا تھا اور اسی وجہ سے وہ مار کھا گیا، اس کے آفس میں ایک نئی لڑکی آئی تھی، سیکریٹری تھی اس کی، بس دھیرے دھیرے وہ اسے چاہنے لگا، اور جب اسے لگا کہ اسے تانیہ کو اپنا لینا چاہیے تو اس نے مجھے اپنی پسند سے آگاہ کیا، میں کوئی پرانے خیالات کی مالک نہ تھی، یوں بھی میری لائف ان دنوں بہت سوشل ہوا کرتی تھی، مجھے اعتراض نہ تھا، تانیہ بھی تمہاری طرح یتیم تھی، وہ بہت خوبصورت تھی، ساتھ ہی اس کا لہجہ بہت دھیمہ اور نرم تھا، مجھے بھی وہ اچھی لگی، یوں جلد ہی وہ میرے گھر میں میری بڑی بہو بن کر آ گئی، اس کے آنے سے گھر میں وہ رونق بڑھی کہ ہم خوشی سے پاگل ہونے لگے، از میر بھی بہت خوش تھا، وہ بھائی کی شادی پر آیا تھا، کچھ دن بھائی اور بھائی کے ساتھ گزار کر پھر واپس چلا گیا، تانیہ کو ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں قطعی دقت نہ ہوئی تھی، کہ وہ بھی ماڈرن خیالات کی مالک تھی اور سوشل لائف گزارنا اسے پسند تھا، میرا سے پا کر بہت زیادہ خوش تھا اور میں انہیں دیکھ کر خوش رہتی تھی، تین ماہ سکون سے گزر گئے، پھر دھیرے دھیرے میر کی طبیعت ڈھیلی رہنے لگی، وہ بہت سست رہنے لگا، میں بہت فکر مند تھی، تانیہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی، میڈیسن وغیرہ، ڈاکٹر کے پاس لے جانا، اس کی ذمہ داری تھی، ظاہر ہے وہ بیوی تھی میر کی، اور ہر بیوی کا فرض ہوتا ہے یہ تمام ذمہ داریاں سنبھالنا، پھر جیسے جیسے میر کی طبیعت خراب رہنے لگی، دھیرے دھیرے بزنس بھی تانیہ سنبھالنے لگی، میں اور از میر یہ سب اس کی نیکی اور محبت ہی سمجھتے رہے، میر بستر سے لگ گیا، مجھے از میر کو بتانا پڑا، اور از میر صرف پندرہ دن کے اندر پاکستان آ گیا، اور جب از میر، میر کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو انہیں جو حقیقت معلوم ہوئی، اس نے ہمارے پاؤں کے نیچے سے گویا دھرتی ہی کھینچ لی تھی، میر کو رگولری سلوپوائزن دیا جا رہا تھا، یہ ہمارے لیے شاکنگ تھا، کون کر سکتا تھا ایسا؟ سوائے تانیہ کے، از میر کی چھٹی حس فوراً بیدار ہوئی تھی، اس نے جہاں اپنے بھائی کو اچھے ہسپتال میں ایڈمٹ کرایا، ساتھ ہی وہ بزنس کے معاملات دیکھنے آفس پہنچا، مجھے اس دن علم ہوا کہ مجھے تانیہ پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ مجھے کہہ دیتی کہ ماما میں نے میر کو چیک کروا دیا ہے، میڈیسن دے دیں، میں مان لیتی، مجھے کیا علم تھا کہ وہ میرے بچے کو میڈیسن کے نام پر زہر دے رہی تھی، تانیہ از میر کے آفس پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئی، وہ سارا بزنس اپنے نام کرانے کے چکر میں تھی، صرف میر کے سائن باقی تھے اور اگر ٹھیک وقت پر از میر نہ آتا تو وہ شاید یہ بھی کر لیتی، پھر بھی وہ پچاس لاکھ تک کا نقصان دے گئی تھی، مگر ہمارے نزدیک اس وقت وہ دولت اہم نہ تھی، میر کی جان اہم تھی، ہم نے ہر اچھے ڈاکٹر کو دکھایا، مگر دیر بہت ہو چکی تھی، تین ماہ سے مسلسل اسے زہر دیا جا رہا تھا، وہ تو اس کے خون میں رچ گیا تھا، ہم کوشش کرتے رہے، مگر میر ہمیں چھوڑ گیا، میرے لیے حیدر داد کی موت کے بعد یہ صدمہ سہنا بہت کٹھن تھا، مجھے ہارٹ اٹیک ہوا، مگر میری ابھی زندگی تھی، سو میں اپنے از میر کے لیے بچ گئی، مگر اس کے بعد میں سنبھل نہیں، ایک دن بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا، از میر فوراً مجھے ہسپتال بھی لے گیا، مگر میرے جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا، بس جب سے میں

”میں سمجھتی ہوں، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ توجہ اور کوشش مجھے پھر سے چلا سکتی ہے، مگر از میر تنہا کیا کیا کرتا، سو مجھے لگا تم یہ کر سکتی ہو، تم پر وہ بھروسہ ہے جو مجھے اپنے از میر پر ہے، بچے! تم اس کے رویے کو دل سے نہ لگانا میری جان، وہ مجبور ہے اپنی ذات سے، اس کا بھائی اسی اعتبار اور محبت نے چھین لیا ہے، اور اب وہ محبت اور عورت دونوں سے نفرت کرتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے وہ دن جلد آئے گا، جب وہ خود تمہاری اچھائی کا، تمہارے خلوص، تمہاری نیک نیتی اور ایمانداری کا اعتراف کرے گا۔“ آئی نے جو بچ اسے بتا دیا تھا اس کے بعد تو اس کے دل میں از میر حیدر کے لیے ہمدردی ہی ہمدردی تھی، وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا، جو کر رہا تھا جا رہا تھا، اب اسے اس کے رویے اور نظروں کی سرد مہری سے گلہ نہ تھا، اور نہ ہی دکھ تھا کہ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی کیوں مجرم بنی ہوئی ہے، وہ مجرم نہیں تھی، مگر اس جیسی ہی ایک لڑکی نے ان نیک دل لوگوں کا اعتبار کیا تھا، پھر بھلا کیوں کروہ کسی پر بھروسہ کر سکتے تھے؟

☆.....☆.....☆

سحاب کو یہاں آئے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ کبھی کبھار پھپھو سے ملنے چلی جاتی تھی اور کس قدر حیرت کی بات تھی ناں کہ اس کو پھپھو کے گھر لے جانے کی ڈیوٹی خود از میر حیدر انجام دیتا تھا، یہ کام وہ خوشی سے نہیں کرتا تھا، بلکہ صرف اس بنیاد پر کہ سحاب کی اصلیت کھلے اور وہ ماما کو دکھائے، مگر وہ اب تک اپنی کسی بھی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا، ہاں سحاب نے اپنا کام بہت کامیابی سے انجام دیا تھا، وہ اب جب ماما کو دھیرے دھیرے اسٹیپ اٹھاتے دیکھتا تو ناقابل فراموش خوش ہوتی تھی اسے، ماما اب خود سے چلنے لگی تھیں، بہت زیادہ نہیں مگر یہ کیا کم تھا ان کے وجود کا وہ حصہ جسے ڈاکٹر نے بے جا قرار دے دیا تھا اب حرکت کر سکتا تھا، پہلے ہاتھ اور اب پاؤں، ماما دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھیں اور اس نے اسی نشی میں گید رنگ رکھی تھی، جس میں اس کے چند فرینڈز اور کچھ خاص خاص رشتہ دار شامل تھے، سب کے لیے سحاب کا وجود حیرت کا باعث تھا، کچھ لوگوں کے لیے خوشی کا سبب بھی دکھائی دیا، جیسے فیضی، لڑکیاں (خوبصورت لڑکیاں) دیکھتے ہی ہانپا گل ہو جاتا تھا، اسے حیرت اور ناگواری کا احساس شدت سے ہوا تھا، جب ماما نے سحاب کو اپنی قریبی عزیزہ کہہ کر معاف کروایا اور اس بات پر وہ ان سے خفا بھی ہوا تھا۔

”یہ رانگ ہے ماما! میں آپ کی وجہ سے اسے برداشت کر رہا ہوں، مگر یہ جھوٹ....“

”جھوٹ کیا ہے؟ وہ میرے قریب بھی ہے اور مجھے عزیز بھی بہت ہے۔“ ان کی لاجک اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”مگر میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”تو میں کب بنا رہی ہوں؟“

”ماما! اگر آپ اسے اپنی بھانجی بتائیں گی تو میری کیا لگے گی وہ؟“ اس کا غصہ عروج پر تھا، ماما کا چہرہ بھی سنجیدہ تر آ گیا۔

”از میر پلیز! یہ گھر اس کا بھی ہے۔“

”واٹ....؟“ وہ اُچھل گیا، جی سحاب اندر آئی تھی۔

”ڈونٹ وری از میر حیدر! میرا یہاں کچھ نہیں ہے، آئی پراس، کل بھی سب آپ کا تھا، آج بھی آپ کا ہے اور نے والے ہر دن میں بھی صرف آپ کا ہوگا، آئی نو، میں یہاں جسٹ اے سروینٹ ہوں، جس کی مجھے پے ملتی ہے، اس کے علاوہ اور مجھے کچھ درکار بھی نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا، طنز بھی نہیں تھا، صرف اعتماد تھا۔

”تمہارے آنے سے میری ماما تو میری رہیں نہیں۔“

”وہ آپ کی ہی ہیں، ہاں یہ ان کا بڑا پین ہے کہ ان کے دل میں مجھ یتیم کے لیے اتنی چاہت ہے، آئی نے جو میرے

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit

<http://www.paksociety.com>

لیے کیا وہ میں عمر بھر یاد رکھوں گی، اور احسان تو میں آپ کا بھی نہیں اُتار سکتی کہنا چاہتے ہوئے بھی آپ مجھے اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور ہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ، تمہارے یہ ڈائلاگز صرف ماما کو اٹریکٹ کرتے ہیں بس سحاب! بہتر ہوگا ان پر ہی ٹرائی کرو۔“ وہ اسی تنفر بھرے لہجے میں کہتا کمرے سے نکلا تھا اور سحاب گہری سانس خارج کرنے لگی۔

”سحاب بچے!“

”پلیز آئی! اس اوکے، اب میں سب جانتی ہوں پلیز۔“ اس نے انہیں ریلیکس کیا اور پھر ان کے برابر میں ہی لیٹ گئی۔ از میر حیدر کے رویے کو جھیلنے کی وہ عادی ہو چکی تھی، سو اس کی اتنی زہر میں بجھی باتیں سن کر بھی اس نے صبح روٹین کے مطابق کام کا آغاز کیا تھا، صبح خلاف معمول جب از میر دس بجے اُٹھ کر آیا اور ناشتے کے لیے رحیم بھائی کو پکارا تو اسے یاد آیا تھا کہ آج سنڈے ہے، اور اس سنڈے اس نے پھپھو سے ملنے جانا ہے، اس نے فوراً سے پہلے ناشتہ تیار کر کے رحیم بھائی کو دیا تھا، اور خود کچن میں برتن سینے لگی۔

”سحاب بیٹا! از میر بیٹے کا کہنا ہے کہ بسٹ بنادیں سامان کی، کچن میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، اور ہاں اس بار سامان کی کوانٹیٹی ڈبل لکھئے گا۔“

”کیوں رحیم بھائی؟“

”بھیا کا آرڈر ہے؟“ انہوں نے مسکرا کے کہا، ظاہر ہے از میر کے سامنے جواب سوال صرف زہرہ آنٹی ہی کر سکتی تھیں، اس نے کچن سمیٹا، پھر بسٹ بنانے بیٹھ گئی اور دس منٹ بعد وہ بسٹ اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔

”سامان زیادہ لکھنا۔“

”جی لکھ دیا ہے۔“ وہ اسی کے انداز میں مختصر جواب دے کر آنٹی کے پاس آ گئی، یہ نائم ان کی ایکسر سائز کا ہوتا تھا، ان کا ہاتھ بہت بہتر تھا، بے شک سحاب کی محنت تھی مگر ان کی ول پاور نہ ہوتی تو شاید اس کی محنت بھی رنگ نہ لاتی، مستقل آدھے گھنٹے ان کو تھراپی وغیرہ کے بعد اس نے ریٹ کے لیے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔

”آپ کے لیے جوس لاتی ہوں۔“

”سحاب! ابھی کچھ دیر رہنے دو، میرے پاس بیٹھو۔“ ان کے کہنے پر وہ ان کے پاس آ گئی، دو تین دن سے سحاب کی خاموشی وہ نوٹ کر رہی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے تم پھپھو کو مس کر رہی ہو؟“

”نہیں مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے، جو میرے ابو نے بہت محنت اور محبت سے بنایا تھا مگر آج وہ ویران پڑا ہے۔“

”سحاب! تم اپنی پھپھو سے کہہ دو ناں کہ وہ اس گھر میں شفٹ ہو جائیں، کرائے کے مکان سے تو اچھا ہے ناں، پھر تمہارا گھر بند بھی نہیں ہوگا اور تم جب پھپھو سے ملنے اس گھر میں جاؤ گی تو تمہیں اچھا لگے گا۔“

”جی آنٹی! مگر پھپھو اپنے شوہر کی لالچی فطرت کی وجہ سے وہاں شفٹ نہیں ہوتیں، ان کے بقول وہ امانت ہے میری، کہیں ان کے شوہر کی نیت خراب ہوگئی تو وہ اپنے مرحوم بھائی کو کیا جواب دیں گی؟“ اس نے پھپھو کا فلسفہ بیان کیا، آنٹی ہنس دیں۔

”ہاں ان کے شوہر ہیں تو لالچی سے۔“

”بٹ آنٹی! مجھے کرنا کیا ہے اس گھر کا؟ پھپھو میرے ساتھ رہیں گی تو گھر آباد تو رہے گا اور پھر وہ گھر ان کا بھی تو ہے، آخر ان کے بھائی کے گھر پر ان کا حق بنتا ہے ناں؟“

احادیث

فرزانہ عمر دراز کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

میرے نقش گر میرے کوزہ گر
مجھے توڑ دے مجھے توڑ دے
میں خزاں رسیدہ شجر ہوں اک
مجھے پھر سے اذن بہار دے
میری زندگی کو نگار دے
مجھے بخش پھر سے حیات نو
مجھے گوندھ طیبہ کی خاک میں
میرا گھر مدینے میں ہو کہیں
میرے دل میں گنبد سبز میں
میرے سر میں طیبہ کی دھول ہو
میرے نقش گر میرے کوزہ گر
میرے نقش پھر سے بنائے
میرے خیال و خد کو سنوار دے
جو میرے نصیب میں یہ نہیں
مجھے خاک پر سے اتار دے!

روشنی فاطمہ کی ڈائری سے

افتخار عارف کی غزل

ہو گئے جواں بچے بوڑھی ہو رہی ہے ماں
بے خواب آنکھوں میں چراغِ لودھی ہے ماں
روٹی اپنے حصے کی دے اپنے بچوں کو
صبر کی ردا اوڑھے بھوکے سو رہی ہے ماں
سانس کی مریضہ ہے پھر بھی ٹھنڈے پانی سے
اتنی سخت سردی میں کپڑے دھو رہی ہے ماں
غیر کی شکایت پر کبھی کسی شرارت پر
مجھ کو مار کر عارف خود بھی رو رہی ہے ماں
روکتی تھی مجھ کو کھیلنے سے جس مٹی میں
آج اسی مٹی کو اوڑھے سو رہی ہے ماں

ملیجہ بیگ کی ڈائری سے

زبیر راج کی غزل

زمانے بیت جاتے ہیں

کبھی نظریں ملانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی نظریں چرانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کسی کی آنکھ بھی کھلتی ہے تو سونے کی نگری میں
کسی کو گھر بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی گھر سے نکلتے ہی نظر آ جاتی ہے منزل
کبھی رستوں کو پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی صدیوں کی سی راتیں ہمیں پل بھر کی لگتی ہیں

کبھی سورج کو آنے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کوئی سجدے میں گر جاتا ہے تو پالیتا ہے رب کو
کسی کو لو لگانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
وہ بھی سب چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں
جنہیں دنیا کمانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی اک پل برابر بن کے صدیاں بیت جاتی ہیں
کبھی اک پل بتانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

سحر انجم کی ڈائری سے

مرقظی برلاس کی غزل

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیر جاتا ہے لہجے کا یہ روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے
لکھتے ہیں وہ کچھ جو ہر اک پہ گزرتی ہے
پریوں کی کہانی ہم تحریر نہیں کرتے
دو گز ہی زمین سب کا جب آخری مسکن ہے
ہم کوئی مکاں اپنا تعمیر نہیں کرتے

سعدیہ عابد کی ڈائری سے

ارشاد ملک کی نظم

کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
جو دورِ افق پر رہتے ہیں
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے
کیوں ہنستے ہنستے روٹھ گئے
ترماتے ہیں مکاتے ہیں

کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
اک روز میں یونہی شام ڈھلے
بس تنہا تنہا بیٹھا تھا
تب چاند مجھے الجھا سا لگا
مجھ سے آخر یہ کہنے لگا
معلوم ہے کچھ تم کو ارشد
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے
کیوں مجھ سے آخر روٹھ گئے
میں ہر شب ڈھونڈتا رہتا ہوں
پر مشکل ہے تڑپاتے ہیں مسکاتے ہیں
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں

مسز ریمانا نور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

اپنی محبت کا کچھ حق ادا کر دو
ہمارے نام اپنی کچھ وفا کر دو
اگر یہ ممکن نہیں تیرے لیے تو
اپنی یادوں کو مجھ سے جدا کر دو
دو بول محبت کے بول کر
میری محبت کی آساں راہ کر دو
رفتہ رفتہ جا رہا ہوں موت کی طرف
مجھے بچانے کے لیے زندگی کی دعا کر دو
ایسا نہیں کر سکتے اگر تم تو
ہمیشہ کیلئے مجھے الوداع کر دو



سیدہ امبر ہاشمی..... کراچی رابعہ منیر..... سرگودھا

اے آسمان والے زمین پر اتر کے دیکھ
ہوتی ہے کیا جدائی تو بھی پچھڑ کے دیکھ

سحر انجم..... کراچی

چاند کی تلاش میں پھرتی تھی ہر نظر
کوئی دیکھتا ادھر کوئی دیکھتا ادھر
میری چاہ نے اُس کے دل پر کچھ ایسا کیا اثر
تو ہی چاند ہے میری عید کا کہہ گئی اُس کی نظر

نور بانو..... کوئٹہ

تیرے لبوں سے محبت کے قصے سنتے ہیں تو بہت روتے ہیں
اپنے ہاتھوں پہ تیرا ہاتھ دیکھتے ہیں تو بہت روتے ہیں
نجانے تو اجنبی ہو گیا ہے یا ہمارے ہاتھ کی انگلیاں
کہ گیلی ریت پہ تیرا نام لکھتے ہیں تو بہت روتے ہیں
صبحا سحر..... ہارون آباد

کبھی ادھورے چہروں میں
اک تیرا چہرہ پورا ہے
میرے جیون کا ہر لمحہ
تیرے بغیر ادھورا ہے

عاصمہ رشید..... فیصل آباد

کبھی میری جگہ خود کو رکھو پھر جان جاؤ گے
کہ دنیا بھر کے دکھ دل میں سمونا کس کو کہتے ہیں
نہ خواب آور دوائیں کھا کے بھی نیند آسکے تم کو
سمجھ لو گے کہ کانٹوں کا پچھونا کس کو کہتے ہیں

سنتے ہیں اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا میں نے یہ تماشا نہیں دیکھا
یہ شہر صداقت بھی عجب شہر ہے شبنم
میں نے یہاں ایک شخص بھی چپا نہیں دیکھا

یاسمین حسن..... اسلام آباد

کسی کے آنے کی کچھ یوں بھی آہٹیں مانگوں
کواڑ بند رکھوں اور دستکیں مانگوں
عجب شے ہیں یہ محرومیاں محبت میں بھی
کہ اب میں بھی ترک مراسم کے بہانے مانگوں

عانیہ نیازی..... ربوہ

وہ تمام دنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وقایہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
میرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ زندگی
میں کہاں جلاؤں کہاں بجھاؤں یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

امبرین حیدر..... اسلام آباد

محبت روح میں اتر اتر ہوا اسم ہے سو جان جاں
تعلق ختم کرنے سے محبت کم نہیں ہوتی

عائشہ اعوان..... بھکر

میرے جنوں کا فسوں ہے جو رو پڑا ہے وہ
کہ میرے غم نے اسے آج جاں سے کھینچ لیا
اُسے بھی زعم تھا انکار پر مگر میں نے
وہ ایک لفظ محبت زباں سے کھینچ لیا

شائلہ قیصر..... کراچی

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے
رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے جتنے استعارے تھے

شمینہ عمران..... گجرات

گزر گئے ہیں جو خوشبوئے رائیگاں کی طرح
وہ چند روز میری زندگی کا حاصل تھے
اب ان سے دور کا واسطہ بھی نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو میرے رنجوں میں شامل تھے

ارم قیوم..... پشاور

جسے مانگا تھا میں نے ہر دعا میں
وہ بن مانگے کسی کو مل گیا ہے

حنا بخاری..... گجرات

اپنی افسردہ مزاجی کا بُرا ہو قاتل
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے

سعدیہ حیدر..... ملتان

لطف تو جب ہے سفر کا کہ میرے ہمسفر و
اپنے سائے کو بھی رستے میں نہ چھوڑا جائے
دل تجھے بھولنا چاہے بھی تو مشکل یہ ہے
کس طرح سانس کی زنجیر کو توڑا جائے

حنا جہانزیب..... سیالکوٹ

وہ اور ہیں جو تجھے چھو کے دیکھنا چاہیں
مجھ کو تو تیرے خواب کی دنیا بہت ہے

رانیہ حسن..... شیخوپورہ

تمہاری آنکھ سے دل تک سفر کرنا ہے بس ہم کو
یہ کتنی خوبصورت منزلوں کا راستہ ہو گا

صدف سحر..... ملتان

پریم کتھا کا انت نہ کوئی

کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہیں مانگیں سب کچھ پائیں

صائمہ..... کراچی

تم آ کے بڑے شوق سے لو جائزہ دل
جو چیز جہاں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں ہے

ریما نور چمن..... کراچی

جس شام دل میں میری یاد نہ آئے
خدا کرے کہ ایسی کوئی شام نہ آئے
اے دوست یہ تو ممکن ہی نہیں ہے
افسانہ لکھا ہو دوستی کا اس میں تیرا نام نہ آئے

سعدیہ عابد..... کراچی

نئے موسم کی خوشبو سے خرا کر آنکھ پل دو پل
گئے موسم کی باتیں سوچتا رہتا ہوں بارش میں
نہ سونا میرے بس میں نہ شب بھر جاگنا خالد
میں آنکھیں کھولتا اور میچتا رہتا ہوں بارش میں
مدیحہ گل..... حاصل پور

ہے اختیار میں تیرے تو یہ معجزہ کر دے
وہ میرا نہیں ہے اے میرا کر دے

خولہ عابد..... لاہور

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
وہ میرے ہو کے بھی میرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

شبنم شاہد..... اوکاڑہ

دل میں اک کسک سی ہے معلوم تو ہو
چھوڑ کر مجھ کو کس حال میں ہو گا وہ

☆☆☆

اس ماہ میں

اس ماہ کا اقتباس

ہم لڑکیاں:

ہم کیا جانیں ہم کون ہیں؟ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ ہماری گردنوں میں تو نظر نہ آنے والے دھاگے بندھے ہیں اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھ کبھی ان دھاگوں کو اوپر کھینچتے ہیں اور کبھی گرا دیتے ہیں ہم تو آٹے کے چراغ ہیں جنہیں کسی نہ کسی کی خوراک بننا ہے۔
(قرۃ العین حیدر)

مرحوم خصوصی

برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ برادری کی تمام بوڑھیاں کسی کے ہاں غمی میں شریک ہوتی ہیں تو لمبا لمبا گھونگھٹ کاڑھ کے بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کر مین کرتی ہیں دھاڑتی ہیں سب اپنے اپنے مردوں اور مردوں کی خوبیاں بیان کر کے خشک آنسوؤں سے روتی ہیں اگر کوئی ناواقف حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹے میں بین سن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس مجلس میں آہ و بکا میں دوڑھائی سو مردوں میں آج کا مرحوم خصوصی کون ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی کی تحریر سے انتخاب)

انتخاب: عانیہ نیازی..... ربوہ

اس ماہ کا مزاحیہ قطعہ

میں ستارے توڑ کر لاؤں گا تیرے واسطے
اس کا وعدہ میرے جان و دل پہ ایسا چھا گیا
میں بہت خوش تھی مجھے اک چاہنے والا ملا
وہ ہمارے گھر ”ستارہ لان“ لے کر آ گیا
راجعہ منیر..... کراچی

اس ماہ کی ہری مرچیں

○ دامن میں داغ لگا بیٹھے۔
☆ تو پھر جلدی سے پٹیج سے دھو لیجیے۔
○ نہ جھکوزلف سے پانی۔
☆ کہ یہ وگ گر جائے گی۔
○ تیری گلیوں میں نہ رکھیں گے قدم۔
☆ کیوں کیا گلی کے کتے بچان لیتے ہیں۔
○ جو بات تجھ میں تیری تصویر میں نہیں۔
☆ کیونکہ آج میں نے بیوٹی پارلر سے میک اپ کروایا ہے۔
○ آج کی رات یہ ایسی رات..... کہ ہم کو نیند نہیں آتی۔

☆ تو بھی نیند کی گولی کھا لو فوراً آ جائے گی۔

○ دل کی آواز بھی سن۔

☆ ارے بھائی! بیوی کو سننے سے فرصت ملے تو

دل کی سنیں ناں۔

○ گھر کب آؤ گے؟

☆ جب تمہارے لبا گھر پر نہیں ہوں گے۔

○ اپریل فول بتایا تو ان کو غصہ آیا۔

☆ فول کو فول بتاؤ گے تو غصہ تو آئے گا۔

○ میں زندگی میں ہر پل روتا رہا ہوں۔

☆ کس نے کہا تھا کہ شادی کرو۔

○ دیکھا ہے پہلی بار۔

☆ ساجن کے منہ میں نسوار۔

حناعلی..... گجرات

اس ماہ کی خوبصورت بات

☆ وقت اچھا ضرور آتا ہے پر کبھی وقت پر نہیں آتا۔
☆ ہر کسی کو اتنی اہمیت دو جتنی وہ آپ کو دیتا ہے اگر کم دو گے تو مغرور کہلاؤ گے اگر زیادہ دو گے تو خود گر جاؤ گے۔
ثناء ملک..... کراچی

اس ماہ کی غزل

جس دن تم سے ملاقات کی امید ہوگی
قسم سے میرے چائیاں اس دن میری عیند ہوگی
ہو گا کب حقیقت یہ افسانہ میرا
جو مجھے نصیب تیری دید ہو گی
رکس کر کے تنگ میرے صبر کا امتحان نہ لو
یوں طلب میری آنکھوں میں مزید ہوگی
گر ہو گئی تیری تقدیر میرے نام
تو میری محبت تیری مرید ہو گی

شاعر: رکس امیر بہادر

انتخاب: کرن امیر بہادر..... کراچی

اس ماہ کا لطیفہ

اسٹنٹ: ”سر! آپ آفس میں ہمیشہ شادی
• شدہ اسٹاف ہی کیوں رکھتے ہیں؟“
باس: ”کیونکہ انہیں بے عزتی سہنے کی عادت ہو
جاتی ہے۔“

نور بانو..... کوئٹہ

اس ماہ کا فلسفہ

”انسان پیار کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں
استعمال کرنے کے لیے لیکن بات تب بگڑتی ہے جب
چیزوں سے پیار کیا جائے اور انسانوں کو استعمال۔“
وریشا خان..... حیدر آباد

اس ماہ کا قطعہ

کل جب ہم آزاد ہوئے تھے
خون میں ڈوبی ارض وطن تھی
65 سال کے بعد بھی حالت
ویسی ہی ہے ارض وطن کی

کلام: براؤ تہذیب حسین تہذیب
انتخاب: مریم افروز..... رحیم یار خان

اس ماہ کے اقوال

اقوال حضرت علی

☆ جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ رزق کو
کوئی راستہ نہ نکالے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرو۔
☆ دوست اور بھائی میں فرق۔ دوست ہیرا ہے
تو بھائی سونا۔

☆ انسان بھی بڑی عجیب چیز ہے جب کسی سے
ڈرتا ہے تو اس سے دور بھاگتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ
سے ڈرتا ہے تو اس کے اور بھی قریب آ جاتا ہے۔



☆ اگر تمہارا کوئی اچھا دوست روٹھ جائے تو اسے بار بار منالو کیونکہ اگر تسبیح کے دانے ٹوٹ جائیں تو چین لیے جاتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رضا کی علامت ہے کہ بندہ اس کی تقدیر پر راضی ہو۔

☆ کبھی اپنے دوست کی سچائی کا امتحان نہ لو کیا پتہ اُس وقت وہ مجبور ہو اور تم (غلط فہمی) میں ایک اچھا دوست کھو بیٹھو۔

☆ خاموش رہو یا ایسی بات کرو جو خاموشی سے بہتر ہے۔

☆ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحان دے کر سبق دیتی ہے۔

روشنی فاطمہ..... کراچی

اس ماہ کی نظم

آخری شام

نئی رُتوں کے نئے سفر میں
تمہیں اجازت ہے بھول جانا
ہزاروں سالوں پہ ثبت چاہت کی
پوری تاریخ بھول جانا
مگر مری جاں
سیراب ماضی کے خواب آلود روز و شب کی
وہ آخری شام یاد رکھنا
وہ آخری شام
جب تمہاری مری نگاہوں نے
ایک دوجے کے دل کے اندر اتر کے
شفاف آئینوں میں

خود اپنے چہروں کے عکس دیکھے
تو رو پڑے تھے
وہ آخری شام
جب مجھے تم نے یہ کہا تھا
کہ چاند عید کا دیکھو
تو سرسراتی ہوا کے دل پہ
مری تمنا کے نام
کوئی پیام لکھنا
وہ آخری شام یاد رکھنا

ناصر عباس..... کراچی

اس ماہ کا فلسفہ

کامیاب لوگ اپنے ہونٹوں پر دو چیزیں رکھتے ہیں خاموشی اور مسکراہٹ۔ مسکراہٹ مسئلے کو حل کرنے کے لئے اور خاموشی مسئلے سے دور رہنے کے لئے۔

مدیحہ سلطان..... لاہور

اس ماہ کی دعا

وقت دعا میں اک دعا کروں
میں رب سے اک التجا کروں
تو خوش رہے تو شاد رہے
تیرے دل کا آنگن سدا آباد رہے
تو ہر پل یوں ہی ہنسا کرے
تو پھول کی مانند کھلا رہے
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو
تجھے کسی گلہ نہ ہو کوئی دکھ تجھے ملا نہ ہو
تجھے بن مانگے وہ عطا کرے
تیری معاف ہر اک خطا کرے
بشری تو قیر..... جہلم

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم نے فرمایا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کھجور کے پاس سے گزرے آپ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم نے فرمایا ”اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ کھجور کا یہ دانہ صدقے والی کھجوروں میں سے ہے تو میں اسے کھا لیتا۔“

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم میرے پاس گھر تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا زمین پر پڑا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم نے اسے اٹھایا صاف کیا پھر کھا لیا اور فرمایا ”عائشہ! اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں تمہاری پڑوسی بن جائیں ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ (حسن سلوک سے پیش نہ آؤ گے تو بھاگ جائیں گی) اور جس قوم سے یہ بھاگ جاتی ہیں ان کی طرف واپس لوٹ کر نہیں آئیں۔“

(مسلم)

روشنی فاطمہ..... کراچی

انمول ہیرے

☆ اخلاق اچھا ہونا اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔

☆ دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔
☆ مصیبت کی شکایت مت کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
☆ خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔
☆ علم ایسا بادل ہے جس سے رحمت برسی ہے۔
☆ نیک بننے کی کوشش ایسے کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔
☆ کسی سے ملو اس طرح کہ وہ دوبارہ آپ سے ملنے کی تمنا کرے۔

ماں باپ

ماں باپ کے لئے سب کو چھوڑ دینا لیکن کسی کے لئے ماں باپ کو مت چھوڑنا کیونکہ! جب ماں باپ روتے ہیں تو فرشتوں کو بھی رونا آ جاتا ہے۔
دوزخ نے کہا:
ماں وہ ہستی ہے جو گنہگار کو بھی دوزخ سے بچا لیتی ہے۔
جنت نے کہا:
ماں وہ ہستی ہے جس کے قدموں کے نیچے میں ہوں۔
رب نے کہا:
ماں میری طرف سے انسان کے لئے قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔

لفظوں کی روشنی

☆ مصیبت کی شکایت سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض، دشمن خوش اور دوست غمگین ہوتا ہے۔

☆ لوگوں سے بے رخ رہنا عداوت پیدا کرتا ہے ان کے ساتھ خوشی سے ملنا بُرے ہم نشین پیدا کرتا ہے لہذا دونوں کے درمیان رہو۔

☆ وقت کا بلند و بالا ہاتھ بڑی بڑی اونچی عمارتوں کو خاک میں ملا دیتا ہے لیکن دنیا کی کوئی طاقت اچھی کتاب کے وجود کو ختم نہیں کر سکتی۔

☆ آنکھیں سب لوگ رکھتے ہیں مگر نظر بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

☆ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے جنہیں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔

☆ عورت کی بد اخلاقی یہ ہے کہ وہ نامحرم سے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔

☆ کسی کے ایمان کا اندازہ اس کے وعدہ سے لگاؤ۔

☆ صرف نیکی پر ایمان رکھنا زندگی کو پر مسرت بنا دیتا ہے۔

☆ برتنوں کے ٹوٹنے پر خفا نہ ہوں کیونکہ ان کے لیے بھی تمہاری طرح وقت مقرر ہے۔

☆ جب تم کسی دوست کا حال دریافت کرو اور وہ کہے میں فلاں چیز کا محتاج ہوں اور تم اس سے تغافل کرو اور اس کی ضرورت پوری نہ کرو تو اس کا حال دریافت کرنا اُس کے ساتھ مسخر ہوگا۔

☆ تمام لوگوں سے زیادہ حسد کرنے والے رشتے دار اور ہمسائے ہیں کیونکہ وہ عوام کی نسبت

تیرے انعامات کو زیادہ دیکھتے اور حسد کرتے ہیں۔

☆ مسائل کس گھر اور کس شخص کو درپیش نہیں ہوتے بس بات حوصلے کی ہے۔

☆ خواب اور سراب کبھی بھی انسان کے دوست نہیں رہے۔

☆ یاد رکھو وقت اور قسمت سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا۔

☆ انسان بہت دیر تک اپنے اصل سے دور نہیں رہ سکتا۔

☆ بسمہ علی..... سکھر

☆ ایک بھکاری نے دوسرے بھکاری سے پوچھا ”یار تم نے وہ پل والی جگہ کیوں چھوڑ دی وہاں تو تم خوب کمائی کرتے تھے“۔

☆ پہلا بھکاری کہنے لگا ”پچھلے دنوں میرے چھوٹے بیٹے کی شادی ہوئی تھی میں نے وہ پل اسے تحفے میں دے دیا ہے“۔

☆ عانیہ نیازی..... ربوہ

☆ وہم کا مرض

☆ میں ہو بائیل فون اس لئے نہیں رکھتا کہ چور اچکے نہ چھین لیں۔

☆ میں دوست اس لئے نہیں بناتا کہ وہ کہیں پیسے نہ مانگ لیں۔

☆ میں مسجد میں اس لئے نہیں جاتا کہ کہیں جوتے چوری نہ ہو جائیں۔

☆ میں موٹر سائیکل اس لئے نہیں چلاتا کہ کہیں چالان نہ ہو جائے۔

☆ میں بس میں اس لئے نہیں سوتا کہ کہیں

ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔

☆ میں مکان کے باہر ٹپ ٹاپ اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں ٹیکس نہ دینا پڑے۔

☆ میں دوستوں کے ساتھ چائے اس لئے نہیں پینا کہ کہیں مجھے پیسے نہ دینے پڑ جائیں۔

☆ میں کلاس میں اس لئے نہیں بیٹھتا کہ کہیں استاد کچھ پوچھ نہ لے۔

☆ میں چینی اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں شوگر نہ ہو جائے۔

☆ حنا علی..... ملتان

☆ اصل ضرورت

☆ بیگم صاحبہ کو گھریلو ملازم کی ضرورت تھی انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ آنے والے امیدواروں میں سے ایک سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”مجھے ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو گھر کا ہر کام کر سکے بازار سے سودا سلف لاسکے جو میں کہوں وہ کرے کبھی کام سے انکار نہ کرے اور میرے سامنے زبان نہ چلائے“۔

☆ بیگم صاحبہ! میرے خیال میں آپ کو نوکر کی نہیں شوہر کی ضرورت ہے۔ امیدوار نے جانے کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆ صبا سحر..... ہارون آباد

☆ دفتر

☆ ایک موکل نے کچھ دیر وکیل کے دفتر میں بیٹھنے کے بعد وحشت زدہ سے لہجے میں کہا ”خدا کی پناہ آپ کا دفتر تو تندور کی طرح گرم ہے“۔

☆ ”اے ایسا ہی ہونا چاہیے“۔ وکیل نے اطمینان سے کہا۔

☆ ”آخر مجھے روٹی یہیں سے ملتی ہے“۔ دھنک ناز..... کراچی

☆ دنیا

☆ یہاں اگر انسان اپنا دکھ چھپاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بے حس ہے اور اپنا دکھ ظاہر کرتا ہے تو لوگ ہمدردی کی بھیک اس کی جھولی میں ڈالنے کے لئے آگے آ جاتے ہیں۔

☆ اگر بالکل خاموش رہے تو کہتے ہیں کہ یہ مغرور ہے۔ اگر ہنستے مسکراتے زندگی گزارے تو لوگ پاگل سمجھتے ہیں۔ اس سے تو پاگل اچھے ہیں جو اپنی مرضی سے ہنس بھی لیتے ہیں اور رو بھی لیتے ہیں۔

☆ فرزانہ شوکت..... کراچی

☆ سایہ دار لوگ

☆ رات کتنی ہی کالی ہو آسمان کتنا ہی تاریک ہو تارے تو نکلنے ہوتے ہیں..... انہیں چمکنا اور راہ دکھانا ہوتا ہے۔ آدمی سارے تو نہیں اکثر ان کی ہی مدد سے چلتے ہیں جن کے دامن میں آپ کی خیریت کی خبروں اور دعاؤں سے بھرے ہوئے ہیں یہ پیارا ایثار محبت اور توجہ کے پھل ان بوٹوں کو لگتے ہیں کوئی پھل بے تنا ہوتا ہے کم شکل تو کوئی نہایت شیریں خوش نظر خوش اطوار نہ تو فوری لگتے ہیں نہ فوری ملتے ہیں جانے کیسے بھول جاتے ہیں کہ وہ کتنی سخت دھوپ میں تھا کیسے درد سے بھرے تنگ اور تاریک درپیش رہے تب کہیں جا کر سایہ دار لوگ آتے ہیں.....

☆ ایس امتیاز احمد..... کراچی

☆☆☆☆☆

☆ رداۃ النجسٹ 225 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 224 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 225 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 224 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 225 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 224 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 225 ستمبر 2012ء

☆ رداۃ النجسٹ 224 ستمبر 2012ء

غزل

جب بہار آئی تو ہر شے پر جوانی آ گئی
میرے لب پر بھی کوئی جب رنگین کہانی آ گئی
اختلاف فکر گھر گھر رویہ کار آتا رہا
یوں ہوا پھر نوبت نقل مکانی آ گئی
آندھیاں بے اعتباری کی چلیں انجام کار
دل کے آئینوں پر گرد بدگمانی آ گئی
تھا بہت پُر خار یوں بھی جادہ صدق وفا
راستے میں ہر بلائے ناگہانی آ گئی
اس کے گرد و پیش دیکھا ہم خیالوں کا ہجوم
بزمِ یاراں میں جیسے جادو بیانی آ گئی
دامنِ حدود کو چھوڑ تو میری فکر میں
رفتہ رفتہ ایک وسعت لامکانی آ گئی
سعیِ اخلاص عمل سے واجد جو قریب المرگ تھے
کسے ان فتنوں پر آبِ نو جوانی آ گئی
پروفیسر ڈاکٹر واجد نگیںوی

نظم

ایک نازک سی پیاری سی لڑکی
جو ہر وقت ہنستی مسکراتی
اپنی باتوں سے دوسروں کا دل لبھاتی
جو ہر کسی کو پیاری

اوچی نیچی پگڈنڈیوں پر

جب وہ چڑھتی
تو اس کے خوبصورت سے چہرے پر
روشنی سی بکھرتی
ایک دن اسے کوئی ملا
جو اسے زندگی سے بھی پیارا ملا
جسے دیکھ کے ایک کول سا احساس
اس کے دل میں جاگتا

جو اس کے خوابوں میں آنے لگا
اس کی نیندوں پر چھانے لگا
اس کے ہر وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی
وہ خلاؤں میں اسی کی شبیہ تلاش کرتی
بس

اس ایک دن نے اس کی مسکراہٹ
اس کی خوشیاں چھین لیں
جب اس نے جانا وہ اس کا نہیں
اس کی تو دنیا اندھیر ہو گئی
مسکراتے لب تھم گئے

دل کی مسند پر اداسی ڈیرے ڈال گئی
ایک نازک سی پیاری سی لڑکی

سیدہ ارم

غزل

جسے اپنا سمجھا وہ مجھے بھلا دیتے ہیں
کیوں مجھے اپنی نظروں سے گرا دیتے ہیں
سدا خوش رہے جہاں میں میرے دوست تو
ہم ہر لمحہ تجھے جینے کی دعا دیتے ہیں
جلاتے ہیں ہم اپنی ناکام آرزوؤں کے چراغ
ان چراغوں کو بھلا دے کچھو کچھ بھلا دیتے ہیں
کیوں ترپاتے ہو تم نظروں سے دور ہو کے
ٹھیس اٹھتی ہے دل سے مگر ہم مسکرا دیتے ہیں
ہم نے جسے دل و جاں سے عزیز سمجھا جاوید
ہماری وفاؤں کی وہ ہمیں سزا دیتے ہیں
محمد اسلم جاوید

غزل

بے چینی میں کٹا دن تو رات کانٹوں پر
گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹوں پر
تغییرات سے افزوں ہے ارتقاء کا مزاج
ملا ہے گل کو چمن میں ثبات کانٹوں پر
بلا سے دامن ہستی جو تار تار ہوا!
مرے جنوں نے لگائی ہے گھات کانٹوں پر
چنگد ہے ہیں شگوفے تمہاری یادوں کے
بچی ہے شبنم و گل کی برات کانٹوں پر
یہ اور بات ہے پھولوں کا ذکر تھا امتیاز
کہ اتفاق سے پہنچی ہے بات کانٹوں پر
ایس امتیاز احمد

غزل

ایس امتیاز احمد

سنا ہے تیرے دل میں میری چاہ سائی ہے
یہ تو جرمِ محبت ہے اس میں تو رسوائی ہے
لمحہ بھر کے لئے جو تیری چاہ میں مسکرائی تھی
اس خوشی کی قیمت میں نے اشکوں سے چکائی ہے
یہ جو میرے اپنے ہیں یہ ہے ان کا اپنا پن
میری چتا کے لئے آگ خود انہوں نے سلگائی ہے
میری خوشی کے لئے کیا کیا نہ سہا تو نے اے دوست
تیری تصویر میں نے بھی اپنے من میں سجائی ہے
اب جدا کیسے کریں گے ہمیں یہ زمانے والے
جہاں تیرا نام آیا وہیں میں نے جہیں جھکائی ہے
سحر انجم

غزل

کوئی منزل کوئی ساحل تو ہو
بھٹکتی کشتیوں کی جانب کوئی مائل تو ہو
خدا تو بیٹھا ہے رحمت بانٹنے کو
سوال یہ ہے کہ کوئی سائل تو ہو
تمام مذاہب پہ ہے حاوی انسانیت
مگر یہاں کوئی قائل تو ہو.....
مانا کہ تم تیر نظر رکھتے ہو.....
بات تب ہے کہ محفل میں کوئی گھائل تو ہو
نالہ مئے نسیم شب ہے اور ہم تنہا.....
مگر عامر اس نالہ مئے نسیم شب کا حاصل تو ہو

عامر عزیز

ناسور

اتنا وقت گزر گیا ہے

غزل

اس نے نظریں اٹھائیں دیکھ کر پھر جھک لیں آنکھیں
میں دیکھتی رہ گئی کیا عذاب ہیں آنکھیں
نگاہوں سے کہیں دل کا بھید نہ کھل جائے
دل کے رازوں کی کیا کتاب ہیں آنکھیں
جب بھی اٹھتی ہے نظر اس کی اک نیا سوال ہوتا ہے
میں حیران رہ جاتی ہوں کیا نصاب ہیں آنکھیں
جب تک نہ دیکھوں اسے یہاں رہتی ہیں میری آنکھیں
مشکیزہ تھامے کھڑی رہتی ہوں کیا آب ہیں آنکھیں
کشید کرتی رہتی ہوں اس کی آنکھوں سے عرق
اکثر سوچتی ہوں کیا گلاب ہیں آنکھیں
رکھتی تھی ہر وقت اپنی آنکھوں میں روشنی کی طرح
پھر بھی اوجھل ہو گئیں کیا نایاب ہیں آنکھیں
جگہ جگہ ڈھونڈتی رہتی ہوں ان آنکھوں کو
لوگ پوچھتے ہیں کیا نایاب ہیں آنکھیں
اب بھی ڈوبی رہتی ہوں ان آنکھوں کے سمندر میں
ترتر ہو جاتی ہوں شانزے کیا سیراب ہیں آنکھیں
بسمہ شانزے پارس نواب

نظم

کچھ بیتے بل
کچھ بیتی یادیں
کچھ اُن کی باتیں
جو کہنا چاہوں
پر کہہ نہ سکوں

اپنی جدائی کو.....
ہجر کو بے رخی کو.....
ضبط کرتے کرتے.....
دل نادان پتھر سا ہو گیا ہے.....
تمام جذبات کی موت ہو چکی ہے.....
زیست یادوں میں کھو چکی ہے.....
اور ہجر.....
ناسور بن گیا ہے.....!

سمیرا غزل

نظم
یونہی چپ چاپ رہتے ہو
کبھی ہنس کر تو دیکھو تم

کہ.....
چپ رہنے کی نسبت
بول دینے سے
اکثر.....
ہمارا دل.....
شانت رہتا ہے
خاموشی ہمیں اندر سے
چاٹ لیتی ہے
اور.....

دکھوں میں مزید
اضافہ کرتی ہے
سنو.....
تم بولنا سیکھو
اداسی دور بھاگے گی

اس پل میں جینا

ان یادوں میں بسنا
کتنا اچھا لگتا ہے
وہ خواہش وہ ارمان
وہ جذبات وہ پیار
میری مسکراہٹ پہ
تیرا قربان جانا
وہ سب یاد آتا ہے
دل ہر پل روتا ہے
رنجی دل فریاد کرتا ہے
لے آؤ وہ سب
وہی بیتے پل
وہی بیتی یادیں
ماضی کو حال بنا دو میرا

دعا

تمہیں خوشیاں نصیب ہوں
راحتیں نصیب ہوں.....
اس عید پہ بھی.....
تمہارا چہرہ یونہی دیکے
روشنیوں سے مہکے.....
کہ.....
کوئی غم.....
تمہارے پاس نہ بھٹکے.....!

حمیرا سلمان سومرو

سمیرا غزل

چاند رات

آج رات ہے چاند کی
اور میں سوچ رہی ہوں
یہ چاند رات!
کس ڈگر پر لے جائے گی
زندگی کی راہوں میں.....
وہی ہر چاند رات کی طرح
ناخوشگوار ہوگی.....
یا کسی حسین پل کی طرف لے جائے گی
اے زندگی!
چاند کی مانند نہ چھپ جا
کہ ہمیں زندگی کی راہیں
ہر طرف سے اداں لگیں.....

مدیحہ اعجاز حسین

سندیہ

میں ہواؤں کے سنگ کتنے سندیے بھیجوں
کہ تم لوٹ آؤ.....
تمہاری جان
لمحہ لمحہ
پگھلاتی جا رہی ہے
نچرتی جا رہی ہے
اور تم بے خبر
دور دیس میں
نجانے کیوں خوش پھرتے ہو
کبھی تو اپنی جان کی خبر لیا کرو

کبھی اپنے اندر جھانک لیا کرو
کبھی بھولے سے ہی سہی
میرے نام کا کوئی خواب بن لیا کرو
کبھی میری پلکوں پہ نکلے آنسو
آ کر چن لیا کرو
کبھی تم بھی ہواؤں کے سنگ
اپنے جلد آنے کی نوید بھجواؤ
کبھی چاند میں لپیٹ کر
اپنی نیند بھجواؤ میری عید بھیجو

صائمہ ناز

”انا“

سنو.....!

تم جو کہتے تھے کہ
تم مجھ سے پیار نہیں، محبت نہیں، عشق کرتے ہو
صرف مجھ پر مرتے ہو
تمہارا دل، تمہاری روح اور تمہارے جذبات
صرف میری امانت ہیں
تو جاناں!
امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے
ورنہ گر جذبے مرجائیں تو
دوبارہ زندہ نہیں ہوا کرتے
اس سے پہلے کہ میں ٹوٹ جاؤں
اور خود سے بھی روٹھ جاؤں

صوبیہ ملک

نظم

بہت برسوں بعد!

عید کے چاند کے پہلو میں تمہیں دیکھا
ابھی دید کی پیاس بجھی بھی نہ تھی
اور تم نے جانے کی بات کر دی
دل کو سمجھا رہی تھی کہ
تم نے الوداع کہہ دیا مجھے
ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا جو
چودھویں کے چاند میں جگمگایا
اور!
عید کے چاند سنگ ڈھل گیا

سعدیہ عابد

نظم

ان ہی موسموں میں
ہم ملے تھے
کڑی دھوپ میں چھاؤں جیسے
ہم ملے تھے
وہ روٹھنا منانا
وہ بات ایک دوسرے کی
سمجھنا اور سمجھانا
وہ چاہتوں کے جو سلسلے تھے
ہم ایک دوجے کے ہو گئے تھے
فاصلے بھی سمٹ گئے تھے
تو!
اب یہ وقت کی دیوار تلے
کیوں آ گئے ہم
سنا ہے

محبت کو تجدید کی ضرورت ہوتی ہے
تو!

آؤ میرے ہدم
تجدید محبت کریں
ایسے مل جائیں کہ
پچھڑنے سے نفرت کر لیں
سنا ہے
محبت پاسِ وفار کھتی ہے
اپنی اور اپنے ہدم کی
حیا رکھتی ہے
سچا پیار کرنے والوں کو
ساتھ سدا رکھتی ہے
تو!

آؤ میرے ساتھی
ان ہی موسموں میں لوٹ آؤ
ان ہی موسموں میں
ہم ملے تھے

نظم

عشق جنت ہے جنت کا نظارہ کیجیے
عشق خطا ہے یہ خطا کر کے دیکھئے
عشق عبادت ہے اسے محسوس کر کے دیکھئے
کیوں نہیں سمجھتے تم جاناں
عشق چاہت ہے برس کے دیکھئے
عشق اک حسین خواب ہے کبھی آ کر تو دیکھئے
فنا ہوئے ہزاروں اس عشق میں صنم

www.paksociety.com

ہم امر کریں گے عشق کو کبھی سوچ کر تو دیکھئے
سائرہ ناز محمد شفیق

حوری آئی

چھک چھک چھک چھک ٹرین چلی
دیکھو حوری آئی
رنگوں کے پر پھیلائے
خوشیوں سے ناچ رہا ہے مور نیلا
چڑیا گانا گائے
دیکھو حوری آئی
میاؤں میاؤں کرتی موٹی ملی آئی
چھک چھک چھک چھک ٹرین چلی
دیکھو حوری آئی
کوک کوک کوک مرغی نے شور مچا دیا دیکھو حوری آئی
چھم چھم کرتی لومڑی نکلی
شیر بھی نکل کر خوشی سے غرایا
دیکھو حوری آئی
پیاری پیاری نینوں جب گھر آئی
دیکھو حوری آئی
پیاری پیاری سونے جیسی مسکان ہے اس کی
پھولوں جیسا چہرہ ہے
تتلی بن کر دوڑ رہی ہے آنگن میں
رنگوں کی پھوار گری
دیکھو حوری آئی

صالحہ محمود

☆☆☆

سیدہ ارم کراچی
پیاری آپ! السلام وعلیکم! امید ہے اللہ عزوجل کے کرم کی بدولت آپ خیریت سے ہوں گی۔ دل ہر وقت آپ کو دعاؤں میں یاد کرتا ہے اور آپ کی سلامتی کے لئے ڈھیروں دعائیں کرتا ہے۔ پیاری آپ! مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہوں مگر بھیجنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک بار اپنی نظم بھیجی تھی جو شائع بھی ہوئی جس کے لئے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ ردا ڈائجسٹ میرا فوریٹ ڈائجسٹ ہے اس کی کامیابی کے لئے بھی دعا گو ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

فرخندہ اعظم جہلم
السلام وعلیکم! مجھے پوری امید ہے کہ آپ اور ہمارے ردا کی پوری ٹیم خیریت سے اور شاد و آباد ہو گی۔ آپ! یہ میرا پہلا خط ہے اسے ضرور شامل کیجیے گا۔ آپ! نہایت مصروف ہونے کے باوجود خط لکھنے کا ٹائم نکال ہی لیا ہے۔ آپ! مجھے ردا ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے تقریباً 7 سال ہو گئے ہیں۔ آپ! مجھے ڈائجسٹ سب ڈائجسٹوں سے زیادہ پسند ہے۔ بے آپ کے ناول بہت پسند ہیں آپ کا ناول ”کچی کلیاں آنگن کی“ اور ”تم میرے ہو کے رہو“

ثوبیہ ملک کراچی
پیاری آپ! السلام وعلیکم! صالحہ آپ! کیسی ہیں؟ آپ؟ ردا کے تمام اسٹاف کو میرا سلام اور بہت سی دعائیں۔ ردا ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے اگر بات کی جائے ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ کی تو اس ناول کا نام ہی بہت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ اس کے کرداروں میں مجھے رومی اور اشمیل بہت پسند ہیں۔ آپ کا انداز تحریر کیا عمدہ ہے۔ آپ کا ہر ناول ہی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ آپ کا ناول ”تم میرے ہو

کے رہو“ میں کتنی بار پڑھ چکی ہوں لیکن ہر بار پہلے سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ اس ناول کا اینڈ بھی بہت دلچسپ اور منفرد ہوگا۔ ”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“ ناول بھی زبردست چل رہا ہے۔ شازیہ مصطفیٰ عمران کو سب سے پہلے تو ان کی شادی کی بہت بہت مبارکباد اور شازیہ جی ویلڈن۔ اس بار بھی آپ بہت خوبصورت ناول لائی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ ردا میں صالحہ آپ! اور شازیہ مصطفیٰ کا انداز تحریر پسند ہے۔ امید ہے کہ آپ میرا یہ خط لازمی شائع کریں گی نہ کہ رومی کی ٹوکری کی نذر کریں گی۔ اس کے علاوہ ردا کی تمام رائٹرز بہت خوبصورت لکھ رہی ہیں کسی ایک کی تعریف کرنا نا انصافی ہوگی۔ باقی ردا کے تمام سلسلے ہی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ردا کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔

سمیرا غزل کراچی
ڈیر آپ! السلام وعلیکم! کیسی ہیں آپ؟ میں بالکل خیریت سے ہوں اور تمام اسٹاف کو ڈھیروں دعائیں اور سلام۔ اگست کا ردا بہت اچھا لگا تمام کہانیاں اچھی لگیں۔ رمضان کی آمد بہت مبارک ہو۔ امید ہے ماہ رمضان رحمتیں اور برکتیں لے کر آئے ہم سب کے لئے۔ آخر میں ردا کے لئے ڈھیروں دعائیں۔ اللہ ردا کو یونہی ترقی سے نوازتا ہے آمین۔

امبر آفگن شمل کراچی
السلام وعلیکم! صالحہ آپ! کیسی ہیں آپ؟ مجھے کتنا یاد ہے! میں امبر آفگن شمل ہوں۔ ہاں

دینی امبر آفگن جو اکتوبر 2004ء سے مئی 2007ء تک مسلسل ردا کے لئے لکھتی رہی ردا سے ہی قلم کی چنگی کا احساس ہوا ردا نے ہی لکھاری کا اعزاز بخشا ردا جو مجھ سے کبھی الگ نہیں رہا۔ پھر آپ لوگ مجھے کیسے بھول گئے میرے قارئین مجھے کیسے بھول گئے مجھے اپنے قارئین سے بہت گلہ ہے اگر میں اتنے عرصے غیر حاضر رہی تو کسی نے مجھے یاد بھی نہیں کیا۔ کیا ہی رسم دنیا ہے؟

صالحہ آپ! بہت عرصے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ ردا کے لئے لکھو اور جب قلم اٹھایا تو ایک ہی نشست میں پوری کہانی لکھ ڈالی۔ ردا سے دل کا رشتہ ہے اور کوشش کی ہے کہ اچھوتی کہانی لکھوں اب آپ اور قارئین بتائیں گے کہ کس حد تک کامیاب ہوتی ہوں۔ میں باقاعدگی سے ردا میں لکھنے کی کوشش کروں گی۔ اب اجازت دیجیے دوبارہ حاضری دوں گی بشرط زندگی اللہ حافظ۔

فرح ناز رفیق کراچی
محترمہ صالحہ محمود صاحبہ السلام وعلیکم! میڈم کچھ روز قبل آپ سے فون پر گفتگو ہوئی جب آپ نے کہا کہ میں صالحہ محمود ہوں تو یقیناً جانیں اپنی خوش قسمتی کا یقین نہ آیا میں تو سمجھی تھی کہ کوئی دفتری ملازم فون اٹینڈ کرے گا بہر حال میں نے آپ سے ردا میں اپنی اسٹوری بھیجنے کے لئے ایڈریس اور اجازت چاہی تھی آپ نے جس محبت اور اپنائیت سے بات کی اور میری حوصلہ افزائی کی دل کو یقین سا ہو گیا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں جائے گی آپ سے بات کرتے وقت

میری امی میرے ساتھ تھیں؟ انہیں بھی بہت خوشی ہوئی۔ میری تحریر میں بہت سی غلطیاں ہوں گی مگر آپ سے گزارش ہے انہیں نظر انداز کر کے ردا میں شائع کریں تاکہ جو قلم میں نے اٹھایا ہے وہ واپس نہ رکھ دوں۔ آپ کے ادارے کے علاوہ کوئی ڈائجسٹ ایسا نہیں جو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ میرے علاقہ میں کوئی بڑا بک اسٹال یا لائبریری نہیں ہے جہاں سے ہر ماہ وقت پر ردا حاصل کر سکوں دو سے تین ماہ بعد بڑی مشکل سے ردا ملتا ہے اس لئے اپنے خط کے ساتھ آپ کی مطلوبہ رقم بھی بھیجنے کا طریقہ معلوم کرنا چاہتی ہوں تاکہ ردا کی فراہمی آسان ہو سکے۔ میری تحریر کو ڈائجسٹ میں جگہ ملے یا نہ ملے مگر آپ کی آواز میرے کانوں میں سدا رہے گی جب آپ نے میرا نام لیا تھا کہ فرح آپ بھیجیں کچھ بھی پوٹری یا افسانہ ہم شائع کریں گے آپ سے بات آپ کی آواز ہر اعزاز سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ جیسے لوگ مجھ جیسے لوگوں کے لئے شیرازے، فہد مصطفیٰ جیسے آن سنے بن دیکھے مگر دلوں میں رہنے والے نایاب احساسات کی طرح ہوتے ہیں زیادہ وقت نہیں لوں گی بس اپنا خیال رکھیں آپ اور میری کوشش کو دوام بخشیں شکر یہ۔ امی کی جانب سے سلام۔

عانیہ نیازی ربوہ
السلام وعلیکم آپنی اور تمام پڑھنے لکھنے والوں کو میرا خلوص بھر اسلام پیار قبول ہو۔ رمضان کی رحمتوں کے بعد عید سعید کی مسرتیں اور خوشیاں آپ سب کو مبارک ہوں۔ اب آتی ہوں اگست کے ردا کی جانب۔ آپنی! آپ کا وعدہ ہوتا ہے کہ ردا کا عید نمبر سب سے منفرد

اور دلکش ہوگا اور آپ یقین جانیں ہر بار کی طرح اس بار کا عید نمبر بھی سیدھا دل میں اتر گیا۔ ہر تحریر عید کے حوالے سے مکمل جامع اور دلچسپ تھی میں اتنے کامیاب عید نمبر پر آپ کو ڈھیروں مبارکباد پیش کرتی ہوں ساتھ ہی ردا کی سالگرہ بھی آپ کو بے حد مبارک ہو۔ میری دعا ہے کہ ردا یونہی ہمارے دلوں کو مہکا تار ہے آمین۔

بسمہ علی سکھر
پیاری سی صالحہ آپنی! السلام وعلیکم۔ مزاج بخیر امید ہے کہ معہ اہلخانہ اور اسٹاف بخیر ہوں گی۔ سب سے پہلے ردا کی سالگرہ کی بے حد مبارکباد قبول کریں! ماشاء اللہ سے ردا دن بدن خوبصورت اور نکھرتا ہی جا رہا ہے یہ ایک مکمل اور فیملی ڈائجسٹ ہے جسے پڑھ کر یقین جانیے بے حد اپنے پن کا احساس ہوتا ہے اور یہ یقیناً آپ کی محنت اور آپ کی رائٹرز کے مرہون منت ہے۔ اس بار کا عید نمبر بے حد خوبصورت اور دل کو بھاتا لگا، ہر رائٹر نے بہت خوبصورت اور دل سے لکھا تبھی میں یہاں کسی ایک کی تعریف نہیں کروں گی! سب نے بہت بہت اچھا لکھا اور کمال لکھا، سلسلے وار ناول پڑھے ہمیشہ کی طرح پسند آئے۔

مناہل علی لاہور
السلام وعلیکم آپنی! کیسی ہیں آپ اور باقی سب اسٹاف۔ امید کرتی ہوں کہ سب ٹھیک ہوں گے۔ آپنی! میں تقریباً دو سال سے ردا پڑھ رہی ہوں ردا میرا فیورٹ ڈائجسٹ ہے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں کوئی اندازہ نہیں لکھنے کا، پلیز مایوس مت کیجئے گا اور پلیز میرے خط کو

ردا میں جگہ ضرور دیجیے گا۔ اس بار کا ردا کا عید نمبر مجھے بے حد اچھا لگا، عید کے حوالے سے سب سے میری فیورٹ تحریر ”میری عید تم ہو“ انعم نذیر کی پسند آئی اور پھر روشنی فاطمہ اور ثناء خان صنعانے بہت متاثر کیا۔ مگر آپنی اس بار انعم خان اور نائلہ طارق کو ہم نے بے حد مس کیا۔ خوشبو سنگھار اس ماہ میں میرے فیورٹ سلسلے ہیں جن میں ہمیشہ تمام موضوعات بہت اچھے اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

صبا سحر ہارون آباد
سلام آپنی! تمام ردا اسٹاف اور تمام پڑھنے والوں کو رمضان کی برکتیں اور فضیلتیں بہت مبارک ہوں۔ ٹائٹل گرل اس بار سو سونگی۔ ردا کی سالگرہ پر آپنی آپ کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ خدا کرے کہ ردا یونہی ہزاروں سالگرہ مناتا رہے اور ہمارے لئے یونہی بچتا سنورتا رہے۔ ردا نے جنت اس بار رمضان اور عید کے حوالے سے بے حد خوبصورت اور ایمان افروز تھا۔ اب آتی ہوں ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ کی طرف تو اس بار کی قسط نہایت چونکا دینے والی تھی جہاں ہمیں رومی کی بے بسی پر دکھ اور رنج ہوتا ہے وہیں صبا ممانی کی چالاکی حیران کرتی ہے اور اشمیل کی ایسے موقعوں پر خاموشی غصہ بھی دلاتی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے چونکہ کچھلی قسط کا اختتام انتہائی دلچسپ موڑ پر ہوا تھا۔ شازیہ آپنی آپ کے تو کیا کہنے اگر ہمارے سامنے آپ ہوتیں تو یقیناً ہم آپ کے ہاتھ چوم لیتے۔ آپ دلوں میں گھر کرنے کا فن خوب

جانتی ہیں۔ آپ کی اسٹوری کا سب سے اکھڑا اور بد مزاج کردار شہران مجھے بہت پسند ہے اس بار اس کا ذکر نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے اس کا کردار بے حد پسند ہے۔ عابدہ سین کے مکمل ناول کا پپی اینڈ بہت اچھا لگا اور سباس گل کے ناول کا اینڈ بھی حسب توقع تھا مگر اس بار نائلہ طارق اور انعم آپنی کی تحاریر شامل نہیں تھیں جن کا ہمیں بے حد دکھ ہے۔ باقی اور آل پورا کا پورا ردا بہترین تھا۔

سیماسحر کراچی
مائی سوٹ اینڈ ڈیزسٹ صالحہ آپنی السلام وعلیکم! اللہ پاک سے امید اور دعا ہے کہ آپ بخیریت اور خوش ہوں گی۔ پھر دیر سے خط لکھنے پر معذرت۔ ردا باقاعدگی سے ہمیں مل رہا ہے اس محبت کے لئے تو میں جتنا آپ کا شکریہ کہوں کم ہے۔ امی اور چھوٹی بہنیں اس عنایت پر بہت خوش اور آپ کے لئے دعا گو ہیں۔ آپ سے پھر معذرت کہ میں نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ دراصل میں اپنے معاملات میں اس قدر پریشان اور آپ سیٹ ہوں کہ باوجود کوشش کے کچھ نہیں لکھ پارہی ہوں۔ ذہن منتشر ہے اور پریشان کن خیالات کا بیکراں سلسلہ نہ مجھے سونے دیتا ہے نہ جاگنے۔ مجھے دعاؤں کی سخت ضرورت ہے میرے لئے بہت دعائیں کیجئے گا ڈیزر آپنی۔ آپ سے ڈائجسٹ کا ہی نہیں دل کا بھی رشتہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا انشاء اللہ۔

ردا کے تمام اسٹاف اور قارئین کے لئے ڈھیروں دعائیں اور پیارا اور سلام۔

کچن

چکن سموسہ

چکن کا قیمہ: آدھا کلو
ہر امسالہ: 2 کھانے کے چچ
ادرک، لہسن، ہری مرچ کا پیسٹ:
1 کھانے کا چچ
لال مرچ پاؤڈر: چائے کا آدھا چچ
گرم مصالحہ پاؤڈر: چائے کا آدھا چچ
نمک: حسب ذائقہ
دھنیا، پودینہ، ہری پیاز (کٹی ہوئی):

2 کھانے کے چج
کونگ آکل (فرائی کے لیے): 2 پیالی
1 چائے کا چج
یموں کارس:
زکیب: قیمہ میں ہرے مسالے کا پیسٹ، لال
گرم مسالہ، نمک ڈال کر پانی خشک ہونے تک
۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کٹا ہوا پودینہ، دھنیا
یا زلیمیں کارس، ایک چائے کا چمچہ اچھی طرح
ر کے سموں میں بھر لیں اور فرائی کر لیں۔

روزی اشیاء برائے سموسہ:
اشیاء:
چکن میں نمک
چکن (ریشہ)
پیاز
2 پیالی
4 کھانے کے چمچ
ایک چوتھائی چمچ
رونگ آئل:
سرپانی:
www.

ڈیپ فرائی چکن سینڈویچز

اشیاء:
چکن میں نمک اور کالی مرچ ڈال کر فرائی کر لیں
چکن (ریشہ کیا ہوا): 1 پیالی
نیر: 1 پیالی (کدو کش ہوئی)

مایونیز:
بریڈ سلاکس:
آدھی پیالی
8 عدد

ترکیب: بریڈ سلاکس کو درمیان سے کاٹ کر رکھ لیں۔ چکن میں مایونیز ملا کر سلاکس پر لگائیں اور پیئر بھی لگائیں۔ پھر ایک پین میں مکھن ڈال کر سینڈوچز اچھی طرح فرائی کر لیں۔ سینڈوچز فرائی ہو جائیں تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔

بیف و دو بچی ٹیل رول

اشیاء:
انڈے:
آلو:
1 کلو
ہری مرچ:
4 عدد (کٹی ہوئی)
پیاز (چورا شدہ):
درمیانہ سائز
سفید زیرہ (بھنا ہوا):
آدھا کھانے کا چمچ
ڈبل روٹی کا چورا:
1 کپ
نمک، کالی مرچ:
حسب ذائقہ
تیل:
تلنے کے لیے
ترکیب: آلو دھو کر ابال لیں۔ چھلکا اتار لیں اور آلو کا بھرتا بنالیں۔ تمام مصالحے ملا دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں، تھوڑی دیر رکھا رہنے دیں پھر ہاتھ کو گیلا کر کے کباب بنالیں۔ جب تلنا ہو تو کباب میں پہلے ڈبل روٹی کا چورا اور پھر انڈے لگا کر تیل میں پکھلیں۔ آلو کے کباب تیار ہیں۔ کچپ یا چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

آلو کے کباب

اشیاء:
انڈے:
آلو:
2 عدد (اگلے ہوئے)
1 کلو
ہری مرچ:
4 عدد (کٹی ہوئی)
پیاز (چورا شدہ):
درمیانہ سائز
سفید زیرہ (بھنا ہوا):
آدھا کھانے کا چمچ
ڈبل روٹی کا چورا:
1 کپ
نمک، کالی مرچ:
حسب ذائقہ
تیل:
تلنے کے لیے
ترکیب: آلو دھو کر ابال لیں۔ چھلکا اتار لیں اور آلو کا بھرتا بنالیں۔ تمام مصالحے ملا دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں، تھوڑی دیر رکھا رہنے دیں پھر ہاتھ کو گیلا کر کے کباب بنالیں۔ جب تلنا ہو تو کباب میں پہلے ڈبل روٹی کا چورا اور پھر انڈے لگا کر تیل میں پکھلیں۔ آلو کے کباب تیار ہیں۔ کچپ یا چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

دہی پھلکی

اشیاء:
بیسن:
پیاز ایک عدد درمیانہ سائز (پس لیں)
ڈیڑھ کپ

لہسن:
اجوائن:
سفید زیرہ:
میٹھا سوڈا:
نمک:
کٹی ہوئی مرچ:
دہی:
رستے کے اجزاء:
4 جوئے (پس لیں)
1 چٹکی
1 چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
2 چائے کے چمچ

دہی:
دودھ:
چٹنی:
دہی پھلکی کا مصالحہ:
لال مرچ ثابت:
سفید زیرہ:
کالی مرچ:
ثابت دھنیا:
اجوائن:
آدھا کلو
1 کپ
2 چائے کے چمچ
1 چمچ
12 عدد
1 چائے کا چمچ
10 عدد
1 چائے کا چمچ
1 چٹکی

تمام مصالحوں کو توتے پر ہلکا سا بھون کر پس لیں، اس میں سیاہ نمک، چٹکی بھر سفید نمک دو چائے کے چمچ، ٹائری یا لیموں کا رس تھوڑا سا ڈال لیں ورنہ کھٹائی پاؤڈر ملا لیں، یہ مصالحہ آپ چاٹ میں استعمال کر سکتی ہیں۔

ترکیب: بیسن میں میٹھا سوڈا، دہی، سفید زیرہ، پیاز، لہسن، نمک، مرچ ڈال کر تھوڑے پانی کے ساتھ بلینڈر میں اچھی طرح پھینٹ لیں، باؤل میں نکال کر دس منٹ رکھ دیں اور پھر درمیانی آئینے پر تیل یا گھی میں تیل لیں، دوسرے باؤل میں آدھا کپ دہی کو پھینٹ کر لسی بنالیں یعنی ایک سے ڈیڑھ کپ

پانی شامل کر لیں، چٹکی بھر نمک ڈال کر نکال لیں اور سرونگ باؤل میں رکھتی جائیں، اس کے بعد دودھ، دہی، نمک، مرچ، چٹنی ڈال کر بلینڈر میں اچھی طرح پھینٹ لیں، فائن پیسٹ بن جائے گا اس کو باؤل میں نکال لیں۔

میٹھی چٹنی کے اجزاء:
املی:
سفید زیرہ:
چٹنی:
پانی:
ترکیب: اسٹیل کے برتن میں اتنا پکائیں کہ گٹھلیاں الگ ہو جائیں، اب چھان کر شیشے کی بوتل میں ڈال لیں اور فریج میں رکھ لیں، کافی دن تک خراب نہیں ہوتی۔ جب دہی بڑے سرو کرنے ہوں تو پہلے ڈش میں دہی پھلکی رکھیں اوپر سے دہی کا رستہ ڈالیں، دہی پھلکی کا مصالحہ چھڑک دیں اور چٹنی بھی ڈال دیں یا الگ سے پیالے میں رکھ دیں خوش رنگ اور صحت بخش دہی پھلکی تیار ہے۔

شیر خرما

اشیاء:
دودھ:
کھویا (چورا کر لیں):
گھی:
بادام:
پستہ:
سبز الائچی:
کھوپرا (باریک کٹا ہوا):
ترکیب: ایک پین میں دودھ ڈال کر اس میں

سنگھار

چہرے پر ملیں آدھے گھنٹے بعد بیسن سے منہ دھولیں۔
☆ بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر
چہرے پر لگائیں ہر روز گاجر کا جوس پیئیں۔
☆ خوراک میں پھلوں کا استعمال زیادہ کرنے
سے بھی انسان کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔
☆ پانی زیادہ پینے سے بھی چہرہ شاداب رہتا
ہے۔ بیسن میں دودھ یا بالائی ملا کر اسے آہستہ آہستہ
کچھ دیر چہرے پر رگڑیں چند منٹ بعد منہ دھولیں
صابن کا استعمال نہ کریں چہرہ ملائم اور خوبصورت
ہو جائے گا۔

☆ لیموں کا رس آدھی چھٹانک سفید گلسر لین
ایک چھٹانک گلاب کا عرق آدھا چھٹانک
ہائیڈروجن پر آکسائیڈ اور بورک پاؤڈر آدھا آدھا
ماشہ ان سب اشیاء کو یک جان کر کے کسی صاف شیشی
میں محفوظ کر لیں اور رات کو سوتے وقت منہ دھو کر خشک
کر کے چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھولیں یہ رنگت
نکھرنے کے علاوہ منہ کی خشکی بھی دور کر دے گا۔

☆ انڈے کی سفیدی ایک چمچ لیموں کا رس ایک
چمچ بادام روغن چند قطرے ان سب کو خوب اچھی
طرح ملا لیں اور اسے چہرے پر ملیں خشک ہونے پر
نیم گرم پانی سے منہ دھولیں رات کو منقی کے چند دانے
لیموں کے رس میں بھگو دیں اور صبح نہار منہ

رنگت نکھاریے

☆ نمک ملے پانی سے منہ دھونے سے رنگ
نکھر آتا ہے۔ بادام کی گریاں بغیر چھلے کسی مٹی کے
کھرورے برتن پر رگڑیں اور ان میں تھوڑی سے
بالائی ملا کر چہرے پر ملیں ایک گھنٹہ بعد کسی اچھے
صابن سے منہ دھولیں بادام روغن کو پانی میں
پھینٹ کر چہرے پر لپ کرنے سے رنگ نکھرتا
ہے۔

☆ زیتون کے خالص تیل میں چند قطرے
لیموں کا رس ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ شہد نیم گرم
پانی میں ملا کر روزانہ پیئیں۔

☆ انڈے کی سفیدی میں پننے کی دال باریک
پیس کر کریم بنالیں اور چہرے پر ملیں دس منٹ بعد
چہرہ دھولیں۔

☆ شکر کے شربت میں لیموں کا رس نچوڑ کر پینے
سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا
تیل ڈال کر پینے سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ لیموں کے عرق میں ملتان مٹی پیس کر چہرے
پر لپ کریں۔

☆ گلسر لین میں آدھا لیموں کا رس نچوڑ کر

چاشنی بن جائے تو اس میں رس گلے (بالز) ڈال کر
ہلکی آنچ پر پکائیں۔ رس گلے پک کر پھول جائیں تو
انہیں برتن میں نکال کر اس کے بعد چینی کا قوام تیار
کریں جو کہ زیادہ گاڑھا نہ ہو۔ تیار شدہ چینی کے قوام
میں پستے کے ٹکڑے اور رس گلے ڈال دیں اور کسی
پیالے یا ڈش میں نکال کر فریج میں رکھ لیں ٹھنڈا
ہونے پر نوش فرمائیں۔

خوبانی کا میٹھا

اشیاء:
دودھ: 1 کلو
خوبانی: آدھا کلو
چینی: آدھا کلو
کسٹرڈ پاؤڈر: 4 کھانے کے چمچ
کریم: سجاوٹ کے لیے
ترکیب: خوبانی ایک دن پہلے بھگو دیں پھر
خوبانی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں جب
خوبانی گل جائے تو نیچے اتار کر گھٹلی نکال دیں اور
پھر سے پکائیں اس میں ڈیڑھ پاؤ چینی ڈال کر چمچ
چلانا شروع کر دیں اس وقت تک پکائیں جب تک
گاڑھی فیرنی کی طرح نہ ہو جائے پھر اتار کر ٹھنڈا
ہونے دیں دوسری پتیلی میں دودھ چڑھا کر اس میں
کسٹرڈ پاؤڈر ملا کر کسٹرڈ تیار کر لیں اسے ٹھنڈا کر
لیں اب شیشے یا چینی کی ڈش میں ایک تہہ کسٹرڈ کی
ڈالیں اور پھر خوبانی آخر میں کسٹرڈ کی تہہ بچھا دیں
اور فریج میں ٹھنڈا ہونے رکھ دیں جب ٹھنڈا ہو
جائے تو کریم خوب پھینٹ کر اوپر ڈال دیں اور
پیش کریں۔

کھویا مکس کر کے چولہے پر رکھ دیں اور ڈھکن
ڈھانپ کر پکے دیں جب دودھ اور کھویا مکس ہو کر
اپنے لگیں تو اس میں سوئیاں اور چینی ڈال کر کچھ دیر
مزید ابالیں پھر اس میں تمام میوے ڈال دیں اور
ہلکی آنچ پر چند منٹ پکائیں تاکہ آمیزہ گاڑھا ہو
جائے۔ ایک دوسرے پن میں گھی گرم کر کے
الاجچی کے بیج کڑکڑائیں پھر اس گھی کو مع الاجچی
شیر خرماس میں ڈال دیں اگر چاہیں تو خوشبو کے لئے
چند قطرے عرق گلاب یا کیوڑا ڈال کر ڈش میں
نکال لیں۔

رس گلے

اشیاء:
چاول کا آٹا: 1 سو گرام
دودھ: 1 لیٹر
ٹائری: 1/4 چائے کا چمچ
چینی: ایک سے ڈیڑھ کلو
پستہ: 4 عدد
ترکیب: ایک برتن میں دودھ ڈال کر چولہے پر
رکھیں جب دودھ اپنے لگ جائے تو اس میں ٹائری
ڈال دیں جب دودھ پھٹ جائے تو چولہے پر سے
اتار لیں اور کسی باریک کپڑے میں ڈال کر پوٹی باندھ
کر نچوڑ لیں۔ دودھ سے تمام پانی نچر جائے تو بچی
ہوئی پیر کو پلیٹ میں ڈال کر اس میں باریک پسا ہوا
چاول کا آٹا ملا کر مکس کر لیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک
دونوں اجزاء کو آپس میں مکس کرتی رہیں اور پھر اس
آمیزے کی چھوٹی چھوٹی بالز بنالیں اب پستے کو
باریک کاٹ کر رکھ لیں پھر ایک برتن میں چینی اور تین
کپ پانی ڈال کر چولہے پر رکھیں جب ایک تار کی

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

کھالیں۔ انار کا جوس رنگ نکھارتا ہے۔
 ☆ پیسے کا چھلکا جلد پر رگڑ کر لگانے سے جلد کا

رنگ نکھر جاتا ہے اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

☆ دودھ پینے سے جلد ملائم اور سفید ہوتی

ہے۔

☆ پالک جلد کی رنگت نکھارتی ہے اس کے علاوہ

گرم پانی جسم کی رنگت قائم رکھنے میں ایک زبردست

معاون ہے۔

☆ آم رنگ نکھارتا ہے اور بدن کو فربہ کرتا

ہے۔

☆ زیتون کا تیل، بادام روغن، گلسر لین تینوں کو

ہم وزن لے کر رات کو سوتے وقت روزانہ چہرے پر

مالش کریں اور صبح منہ صابن سے دھولیں۔۔

☆ کھیرے کا رس نکال کر چہرے پر لگا کر اسے

سوکھنے دیں، باقاعدگی سے ایسا کرنے سے چہرے کی

جلد صاف ہو جاتی ہے۔

☆ روغن بادام میں شہد ملا کر چہرے پر لگانے

سے خشک اور بے رونق جلد تروتازہ ہو جاتی ہے اس

محلول کو چہرے پر لگا کر 20 منٹ کے بعد چہرہ

دھولیں۔

☆ پسلی ماش کی دال میں تھوڑا سا بادام روغن یا

زیتون کا تیل اور پانی ملا کر چہرے پر ملنے سے چہرہ

نکھر آتا ہے۔

☆ آدھا پاؤ دودھ میں دو عدد لیموں کا رس نجوڑ

لیں جب دودھ اچھی طرح پھٹ جائے تو اس کو چھان

کر پانی علیحدہ نکال کر ایک بوتل میں ڈالیں اس پانی

کی مقدار کے برابر اس میں عرق گلاب شامل کر لیں

☆☆☆☆☆

☆ کچا دودھ لے کر اس میں تھوڑا سا بنسن اور

ایک چٹکی ہلدی شامل کر لیں یہ لیپ پندرہ منٹ صبح

اور پندرہ منٹ کے لئے شام کو چہرے پر لگائیں۔

☆☆☆☆☆